https://t.me/shahraheilm_akkalkuwa
ماہنامہ "شاہراہِ علم" اکل کوا
ٹیلی گرام چینل

خصوصی شمارہ

دینی | اصلاحی | فکری | علمی

ماہنامہ

# شاہراہِ علم

جامعہ کا پیغام ملّتِ اسلامیہ کے نام

شعبان، رمضان، شوال ۱۴۳۸ھ، مئی، جون، جولائی ۲۰۱۷ء

نگرانِ سرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر

حذیفہ مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظم سازشیں اور اس سے نکلنے کی تدابیر
اختلاف مذموم یا مطلوب؟
آئیے جانیں!! فقہ الخلاف کی روشنی میں
مسلم سلطنتوں میں ہندو اُمراء اور مذہبی رواداری
ملک کے بدلتے منظر نامہ میں مسلمانوں کا طرزِ فکر و عمل
علما کی آڑ لے کر دین پر حملے استعماری طاقتوں کا ہتھیار
موجودہ دور کے فکری چیلنجز اور فضلا کی ذمہ داری
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!
رمضان المبارک کو قیمتی بنانے کے چند نسخے
مسلمان کی عید
تحفۂ رمضان
رمضان اور روزہ
روزہ افطار کرانے کا ثواب
رمضان اور قرآن کریم کی مشترک خاصیتیں
رمضان اور تراویح
رمضان اور نوافل
عشرۂ اعتکاف اور شب قدر
وظائف اور دعائیں
ہم زکوٰۃ کیسے ادا کریں؟
تحصیل علم کی اہمیت اور ہماری غفلت
تحصیل علوم میں کامیابی کے چار اصول
رئیس جامعہ کا پیغام

جامعہ اسلامیہ شاعت العلوم
اکل کوا، نندوربار، مہاراشٹر ۴۲۵۴۱۵



ماہنامہ "شاہراہِ علم" اکل کوا کے تازہ ترین شمارے کے لیے ہمارا "ٹیلی گرام چینل" جوائن کریں!
چینل لنک

ماہنامہ ''شاہراہِ علم'' اکل کوا کے تازہ ترین شمارے کے لیے ہمارا ''ٹیلی گرام چینل'' جوائن کریں!

وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ)

# ماہنامہ ''شاہراہِ علم'' اکل کوا

(جامعہ کا پیغام ملتِ اسلامیہ کے نام)

زیرسرپرستی

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی مدظلہ العالی

مدیر: حذیفہ مولانا غلام محمد وستانوی


جلد نمبر : ۶ شمارہ نمبر: ۵-۶-۷

ماہ : شعبان، رمضان، شوال ۱۴۳۸ھ، مئی، جون، جولائی ۲۰۱۷ء

زرتعاون : سالانہ ۲۰۰/روپے سادہ ڈاک/رجسٹری ۳۵۰/روپے

ترسیل زر کا پتہ

''دفترِ شاہراہِ علم''

جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، مہاراشٹر، ۴۲۵۴۱۵


**خصوصی شمارہ:** رمضان نمبر ۲۰۱۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین


| شمار | فہرست مضامین | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظّم......حذیفہ حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی | ۶ |
| ۲ | اداریہ: اختلاف مذموم یا مطلوب؟ آیئے......حذیفہ حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی | ۳۵ |
| ۳ | مسلم سلطنتوں میں ہندو اُمراء اور مذہبی رواداری......ملخص: مفتی عبدالمتین صاحب اشاعتی کانڑگانوی | ۶۰ |
| ۴ | ملک کے بدلتے منظر نامہ میں مسلمانوں.........مفتی عبدالقیوم صاحب (استاذ جامعہ اکل کوا) | ۸۶ |
| ۵ | علما کی آڑ لے کر دین پر حملے استعماری طاقتوں کا ہتھیار..........محمد اسماعیل بدایونی | ۹۰ |
| ۶ | موجودہ دور کے فکری چیلنجز اور فضلا کی ذمہ داری......................محمد سمیع اللہ سعدی | ۱۰۶ |
| ۷ | نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!.............................عمیر انجم مالیگانوی | ۱۱۴ |
| ۸ | رمضان المبارک کو قیمتی بنانے کے چند نسخے............................مولانا محمد منصور احمد | ۱۱۷ |
| ۹ | مسلمان کی عید...............................................................................مولانا محمد منصور احمد | ۱۲۲ |
| ۱۰ | تحفۂ رمضان..........ماخوذ از: تحفۂ رمضان (افادات حکیم الامتؒ) مرتب: ابوحذیفہ محمد اسحاق عفی عنہ | ۱۲۶ |
| ۱۱ | رمضان اور روزہ.............................................................................................. | ۱۲۸ |
| ۱۲ | روزہ افطار کرانے کا ثواب................................................................................ | ۱۳۳ |
| ۱۳ | رمضان اور قرآن کریم کی مشترک خاصیتیں........................................................ | ۱۳۴ |
| ۱۴ | رمضان اور تراویح............................................................................................ | ۱۳۷ |


نوٹ: ماہنامہ "شاہراہ علم" مدیر و ایڈیٹر مولانا محمد حذیفہ غلام محمد وستانوی صاحب رندیرا" جامعہ کوارٹر جامعہ نگر اکل کوا" نے ہمدم پریس مالیگاؤں سے طبع کرواکر دفترِ شاہراہ علم سے شائع کیا۔

...... کمپوزنگ: محمد سبحان ارریاوی اشاعتی ......

فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| ۱۵ | رمضان اور نوافل ..... | ۱۴۳ |
| ۱۶ | عشرۂ اعتکاف اور شب قدر ..... حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ | ۱۴۷ |
| ۱۷ | وظائف اور دعائیں ..... | ۱۵۳ |
| ۱۸ | ہم زکوٰۃ کیسے ادا کریں؟ ..... (مولانا امجد رحمانی پالنپوری صاحب | ۱۵۶ |
| ۱۹ | انفاق فی سبیل اللہ ..... علامہ ابتسام الٰہی ظہیر | ۱۶۲ |
| ۲۰ | تحصیلِ علم کی اہمیت اور ہماری غفلت ..... مفتی عبدالقیوم صاحب (استاذ جامعہ اکل کوا) | ۱۶۶ |
| ۲۱ | تحصیل علوم میں کامیابی کے چار اصول ..... ابوعالیہ ناز قاسمی، مدھوبنی۔ استاذ جامعہ اکل کوا | ۱۷۰ |
| ۲۲ | رئیس جامعہ کا پیغام ..... | ۱۷۳ |


## ضروری ہدایت

ماہنامہ "**شاہراہِ علم**" مہینہ شروع ہونے سے پانچ روز قبل گزشتہ مہینہ کی ۲۵ر تاریخ کو ہی روانہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ پہلے عشرے تک موصول ہو سکے۔ لہٰذا ۱۰ر تاریخ تک موصول نہ ہونے کی صورت میں اپنے مقامی ڈاک خانہ میں تحقیق و کارروائی کریں، اور دو تین روز مزید انتظار کے بعد بھی دستیاب نہ ہو، تو دفتر شاہراہ علم کے نمبر پر اپنا خریداری نمبر بتا کر رابطہ کریں۔ ان شاء اللہ آپ کی شکایت دور کی جائے گی اور دوبارہ رسالہ روانہ کیا جائے گا۔

وقت رابطہ: صبح 7:30 تا 11:30 جمعہ کے علاوہ

**نوٹ** : جن خریدار کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے اور وہ رسالہ جاری رکھنے کے لیے منی آرڈر روانہ کرتے ہیں؛ وہ اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔ اور نئے ممبران مکمل پتہ اور پتہ کے اوپر "جدید خریدار" لکھنا نہ بھولیں۔

**سالانہ زر تعاون سادہ ڈاک -/200 بذریعہ رجسٹری -/350**

ترسیل زر کے لیے ذیل میں دیے گئے پتہ پر E.MO یا اس کی سہولت نہ ہونے کی صورت میں سادہ منی آرڈر کریں اور بذریعہ فون منی آرڈر کرتے ہی اطلاع کر دیں۔

**رابطہ اور ترسیل زر کے لیے:**


OFFICE SHAHRAH-E-ILM
JAMIA ISLAMIA ISHA'ATUL ULOOM
AT-PO. AKKALKUWA DISTT. NANDURBAR-425415 [M.H] INDIA
Email: shahraheilmmagazine@gmail.com
PH: 02567-252256-252356 Mob. 9011958392

**اداریــہ :**



# اسلام اور مسلمانوں کے خلاف
# منظّم سازشیں اور اس سے نکلنے کی تدابیر

حذیفہ بن مولانا غلام محمد صاحب وستانوی

اللہ رب العزت نے دنیا میں انسان کو آزمایش کے لیے پیدا کیا اور آزمایش میں دو فریق میں سے ایک کا حق دفاع کرنے والا اور دوسرے فریق کا باطل پرست ہونا ضروری ہے۔ معرکۂ خیر و شر میں متبعین انبیا، اہل حق اور متبعین طاغوت اہل باطل ہے۔ طاغوتی طاقتیں اپنے غلبہ کے لیے ہمیشہ سازشوں کا سہارا لیتی رہی ہیں ؛مگر قرب قیامت میں ان کی سازشیں بہت زیادہ منظّم اور تیز ہوگئی ہیں، ہم اہل حق اس کا شکار ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس سے واقف ہوں اور اپنے اور اپنی موجودہ و آیندہ نسلوں کے ایمان کو بچائیں۔

گذشتہ اداریہ میں احقر نے مسلمانوں کے اسباب ضعف کے ذیل میں خارجی اسباب کے طور پر اس کا ذکر کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگر موقع ملا تو پردہ اٹھایا جائے گا، پھر اس وقت اداریہ لکھنے کا وقت آیا تو ذہن میں آیا کہ چلو کوشش کر کے اس پر ہی کچھ قلمبند کر لیتے ہیں۔

## ہدایت اور ضلالت :

اللہ رب العزت نے اس رنگ بہ رنگی کائنات کو وجود بخشا اور حضرت انسان کو مکرم و معزز بنایا۔ ظاہر سی بات ہے کہ انسان کو سید الخلائق اور اشرف المخلوقات کے عظیم منصب پر فائز کیا تو اس کی کوئی تو وجہ ہوگی؟ جی وہ یہ کہ انسان اللہ کی دی ہوئی عقلی صلاحیت اور اختیارات کے ذریعہ علم کے واسطے سے اپنے رب تک پہنچے یا اس کی کوشش کرے، لہٰذا دنیا میں اللہ نے انسان کے لیے دو راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا مکلّف کیا اور وہ ہے "ہدایت" اور "ضلالت"۔

ہدایت کہتے ہیں اللہ تک پہنچانے والے راستے کو اختیار کرنے کو۔

ضلالت کہتے ہیں اللہ تک پہنچنے والے راستے سے بھٹک جانے کو۔

ارشاد خداوندی ہے:

﴿فمن اهتدى فإنما يهتدى لنفسه و من ضل فانما يضل عليها ﴾ (سورۃ یونس:۱۰۸)

پس جس شخص نے راہ ہدایت کو اپنایا تو اس نے اپنے سے صحیح راستہ کا انتخاب کیا اور جس نے ضلالت کی راہ اختیار کی تو اس کا وبال اسی کے اوپر ہوگا۔

اداریہ

## اعدائے اسلام کی دین حق کے خلاف سازشیں:

تو آیئے! ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اعدائے اسلام اور دشمنان اسلام دین حنیف نے کس طرح لوگوں کو ہدایت سے محروم رکھنے اور ضلالت سے دوچار ہونے کے لیے کوشش کی؟!!!

ماضی میں مختلف باطل طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما رہی۔ مثلاً مشرکین، یہود، نصاریٰ، مجوسی وغیرہ۔ ان کے اسالیب اور طریقے جو اسلام کے خلاف منصوبہ بند طریقہ سے ہوئے ہیں، ہر زمانہ میں الگ الگ ہوتے ہیں، ماضی میں کبھی وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی علی الاعلان تکذیب کرتے تھے، کبھی قرآن کے کتاب برحق کا انکار کرتے تھے، یہود سازشوں کے رچنے میں بہت زیادہ پیش پیش ہوتے ہیں اور نصاریٰ بھی ہمیشہ ان کے معاون ہوتے چلے آئے ہیں۔ دشمنان اسلام جب کھلم کھلا سازشیں کرتے تھے تو دشمن کی پہچان بھی آسان ہوتی تھی اور مقابلے بھی۔ مگر پچھلی چند صدیوں سے اعدائے اسلام نے اپنا اسلوب بدل لیا ہے، اب وہ ظاہری طور پر کم سازشیں رچتے ہیں اور خفیہ انداز میں ان کی سازشیں بہت زیادہ اور تیز ہوتی ہیں، جس سے ہر کس و ناکس واقف نہیں ہوسکتا۔ احقر چوں کہ طویل عرصہ سے ''الغزوی الفکری'' کا محاضرہ جامعہ میں دیتا ہے تو احقر کا خاص موضوع یہی ہے۔ تو آیئے دور جدید میں اسلام کے خلاف برپا کردہ سازشوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ مدد فرمائے۔ آمین!

## عالمی تحریکات:

وہ بنیادی عالمی تحریکات جو سازشوں کے پس پردہ ہیں:

(۱) تحریک استشراق (۲) استعمار (۳) مشنری (۴) سیکولرزم (۵) وجودیت (۶) اشتراکیت (۷) ماسونیت (۸) روتاری کلب (۹) جدیدیت یا مغربیت (۱۰) قومیت (۱۱) ارتقا اور ڈارونیت (۱۲) لیبرل ازم یا آزادی۔

## استشراق اور استعمار کا گٹھ جوڑ:

تاریخ کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات خوب اچھی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ مغربی استشراق درحقیقت مغربی استعمار کا آلۂ کار رہے اور اسی تحریک استشراق نے مغربی استعمار کی راہ ہموار کی۔

## استشراق کا بنیادی مقصد:

تحریک استشراق ایک طویل عرصہ تک کلیسا کے زیر اثر سامراجی مقاصد کی تکمیل میں مصروف کار رہی، اس نے محکوم قوموں میں اپنے مذہب اور تہذیب سے بے اعتمادی پیدا کی۔ (عربی اسلامی علوم اور مستشرقین: ص ۷)

## اسلامی قوانین یا فقہ اسلامی کے خلاف استشراقی سازش:

مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا بنیادی سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہے، قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اسی سرچشمہ کے دو ظاہر ہیں۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے

کے بعد ایک انسان کی زندگی انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلامی قوانین کی پابندی ہو جاتی ہے، تاریخ گواہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جب تک مسلمانوں کا رشتہ قرآن اور حدیث کے سرچشموں سے مضبوط رہا وہ اس دنیا میں طاقت ور اور غالب رہے، لیکن جب ان دو سرچشموں سے ان کا رشتہ کمزور ہوا تو عالم اسلام میں سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ اقتصادی کمزوریاں بھی پیدا ہو گئیں۔ مسلمانوں میں فرقہ بندیوں اور خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب عالم اسلام کے اکثر حصے پوری سامراجیت کے قبضہ میں آ گئے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے سامراجیت کے لیے ضروری تھا کہ اسلامی معاشرہ کی تمام امتیازی خوبیوں کا خاتمہ کر دیا جائے، ان امتیازی خوبیوں میں اسلام کا قانونی، تعلیمی اور تربیتی نظام بھی تھا۔ چناں چہ سامراجیت کی یہ کوشش رہی کہ اسلامی معاشرہ کو اندر سے کھوکھلا کر دیا جائے اور طریقہ کار یہ ہو کہ اسلامی قانون کو مہمل اور ناکارہ ثابت کیا جائے اور اس کے بنیادی سرچشموں کے بارے میں شکوک کی تخم ریزی کی جائے، اس مقصد کے لیے اس نے قرآن اور حدیث سے جنگ کرنے کی ٹھان لی، حدیث کے سلسلہ میں سامراجیت کی کوششوں کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے حجیت حدیث کا انکار کیا، کچھ لوگوں نے سرے سے ہی حدیث کا انکار کر دیا۔ مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی، عبداللہ چکڑالوی ہندوستان میں اور توفیق صدیقی مصر میں اس کے نمائندہ نمونے ہیں۔

## احادیث رسول کے خلاف استشراقی سازش:

سامراجیت نے اس سلسلہ میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے مغرب میں تحریک استشراق کے نمائندوں سے تعاون حاصل کیا جنھوں نے ''علمی تحقیقات'' کے نام پر اسلامی قانون اور شریعت کا مذاق اڑایا، مستشرق کے ہر اول دستے میں سناوک ہورخرونیے (Snouck Hurgronje) اور گولڈ زیہر (Goldzieher) نے حدیث کے مرتبہ اور تشریعی حیثیت کو چیلنج کیا۔ لیکن ایسا مکمل اور ہم آہنگ نظریہ پیش کرنے سے قاصر رہی جس سے حدیث اور اس کی تشریعی حیثیت کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ متاثر ہو۔

(عربی اسلامی علوم اور مستشرقین: ص ۲۶-۲۷)

## مغرب میں عربی اسلامی دنیا کی تصویر:

مغرب میں عربی اسلامی دنیا کی تصویر مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ شروع میں اسلام کو مغرب نے ایک دشمن تصور کیا، جس کے بارے میں بے سروپا باتیں پھیلائی گئیں، فلسفہ، طب اور طبیعاتی علوم کو جب لاطینی زبان میں منتقل کیا گیا تو اس وقت عالم اسلام کو تہذیب اور علوم کا گہوارہ تصور کیا گیا تھا، اس کے بعد عالم اسلام کو اقتصادی پس منظر میں دیکھا گیا، انیسویں صدی کے نصف آخر میں ثقافتی تقابل کا نظریہ سامنے آیا۔ یورپ کی تحریک استشراق نے دوسری قوموں کی تہذیبی، علمی اور مذہبی تاریخوں اور میراث پر توجہ دی اور ان کی تفہیم وتشریح میں خاص نقطۂ نظر کو برتا اور خصوصی اغراض کو پیش نظر رکھا۔ عربوں کی سائنسی میراث کا بھی جائزہ لیا گیا اور مرکزیت یوروپ اور یونانی ورثہ جیسے نقطہ ہائے نظر کے زیر اثر اس کی اصالت اور بنیادی اہمیت کی نفی کی گئی۔

اداریہ

## یورپ کو ہر میدان میں برتر بنانے کی کوشش:

یورپ کی مرکزیت اور یونانی ذہن کی برتری کو تسلیم کرنے کے بعد مستشرقین کی ہر کوشش میں یہ رجحان باقی رہا کہ بعد میں تہذیبی ورثوں کو یورپ کا تابع بتایا جائے۔ استشراق کا ہمیشہ یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ حقیقتوں کا سراغ لگانا چاہتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب سراسینی تہذیب کے سامنے یورپ طفل مکتب کی حیثیت رکھتا تھا، آج صورت حال مختلف ہے۔ تہذیبیں قوموں کی طرح ہوتی ہیں، جن کے کردار کا اعتراف کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اپنی تمام تحریروں میں مستشرقین علمی معروضیت پسندی اور دیانت داری برتنے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ستم یہ ہے کہ ان میں سے بہتوں کو بس واجبی عربی آتی ہے۔

فرانسیسی مستشرق امیل فلکس قوتیہ نسلی پرستانہ خیالات رکھتا ہے، اس کے نزدیک اہل یورپ کو سامیوں پر برتری حاصل ہے، اس کے خیال میں مشرق اور مغرب کی ذہنیت اور نفسیات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مشرقی ذہن پر نفع اندوزی، خود پسندی اور انانیت چھائی رہتی ہے اور وہ مابعد الطبعی چیزوں سے دل چسپی لیتا ہے، عربوں نے نجوم اور غیب کے علم کو کلدانیوں سے حاصل کیا تھا۔

عربی ذہن میں تخلیقی اپج نہیں ہوتی، یہ خصوصیت یورپی ذہن کی ہے۔

قوتیہ کے یہ خیالات نسل پرستانہ سامراجیت سے تعلق رکھتے ہیں، جو یورپ میں انیسویں صدی میں زوروں پر تھی اور جو یہ سمجھتی تھی کہ عرب، بربر اور دوسری ایشیائی قومیں یورپی قوموں سے بالکل ہی مختلف ہیں۔

کپلنگ (Rudyard Kipling) نے اسی لیے کہا تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ دونوں کا اتصال کبھی نہیں ہوسکتا۔ دونوں میں زبردست فرق موجود ہے، اگرچہ کہیں کہیں دونوں کی رنگت ایک سی ہوجاتی ہے۔

ارنسٹ رینان کے نزدیک اسلام ایک سخت گیر اور رجعت پسند مذہب ہے۔ اس میں سامی فکر کی سادگی موجود ہے، جو صرف اللہ ہو اللہ کرسکتی ہے، کچھ اور سوچ نہیں سکتی۔ سامی فکر علم اور فلسفہ کی منکر ہے۔ رینان کے خیال میں عربی فلسفہ کا چربہ تھا راجر بیکن کے ایک صفحہ میں جتنی باتیں ہوتی ہیں وہ پورے اسلامی ورثہ میں نہیں ہوتیں۔

## بیسویں صدی کے بعد یورپ کی اسلام کے خلاف سازشیں:

بیسویں صدی کی ابتدا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلام اور عربوں کے تئیں یورپ کا عناد اور بڑھ گیا، کیوں کہ جن ملکوں کو یورپ نے غلام بنا رکھا تھا ان میں آزادی کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں جو اس نسلی برتری کو تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ اندرے سروینی نام کے ایک مصنف نے اپنی کتاب ''اسلام اور مسلمانوں کی نفسیات'' میں عربی تہذیب کی اصالت کا انکار کیا ہے اور جن مسلم ہستیوں نے فلسفہ اور سائنس کے میدان میں کارنامے چھوڑے ہیں انہیں یونانیوں کا خوشہ چیں بتایا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے خیال میں الکندی اصلاً شام کا یہودی تھا جو اسلام لا چکا تھا۔ اس نے تحریروں میں ارسطو اور اس کے شارحین سے خوشہ چینی کی۔ عربوں کا الجبرا دیو

فانطس اسکندری واسکندریہ کے رسائل کا خلاصہ تھا ابوالقاسم، ابن زہر اور ابن البیطار ہسپانوی نسل کے تھے، ان کی کتابیں جالینوس اور حران واسکندریہ کے اطبا کی نقل تھیں۔ ابن خلدون ہسپانوی نسل کے تھے، ہاں عربوں نے جغرافیہ کے میدان میں بڑے کام کیے۔

## نظریۂ ارتقا کو کس طرح عام کیا گیا؟:

مستشرقین نے معروضیت پسندانہ مطالعات کے لبادہ میں اس قسم کے نتائج نکالنے اور ڈارون کے نسلی ارتقا کے نظریات کی تطبیق کی۔ قوتیہ نے اپنی کتاب ''مقدمہ فلسفہ اسلامیہ'' میں ایسے ہی نظریات پیش کیے ہیں۔ ابن خلدون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تاریخ اسلام کے بیشتر اہل علم ودانش عجم سے تعلق رکھتے ہیں۔ مستشرقین نے اس کو ایک اہم حوالہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مستشرق سیریل کے خیال میں عربی سائنس دراصل ایرانیوں کی تخلیق ہے۔ ایرانیوں کی تخلیق کو جدا کر دیا جائے تو معمولی چیزیں ہی رہ جائیں گی۔

یال لاکارد کا خیال ہے کہ مسلم سائنس دانوں میں ایک شخص بھی سامی نسل کا نہیں ملتا۔ لاکارد کے اس بیان کی تردید خود گولڈ زیہر نے کی اور بتایا ہے کہ اس جملہ میں بڑا مبالغہ ہے۔ ابن خلدون کی حیثیت کو وہ اس لیے تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے بقول شاید مغربی بیداری کا ایک جھونکا ابن خلدون کی روح کو چھو گیا تھا۔

یہ جھونکا اسپین کے راستہ سے پہنچا، یہی وجہ ہے کہ ابن خلدون میں ''فہم'' کا جذبہ موجود ہے۔ ابن خلدون ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے، لیکن یہ ایک عجوبہ ہے جو کسی مسلمان کے حوالہ سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

## عربی واسلامی سائنس کے خلاف استشراقی سازش:

عرب سائنس پر استشراقی یورش کے خلاصہ کو مندرجہ ذیل نقاط میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

۱- سامی اور آریائی ذہن الگ الگ انداز سے سوچتے ہیں۔ اس لیے عربوں اور اہل یورپ کا سوچنے کے انداز الگ الگ ہے۔

۲- عربوں کا ذہن سائنسی نہیں ہے۔ ان کی فکر میں اپج نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

۳- یہ عرب جہاں جہاں پہنچے علمی سطح پر ویرانی ہی لائے۔

۴- نام نہاد ''عرب سائنس'' دراصل یونانی اور ہندوستانی وراثت کا ترجمہ تھا۔

۵- یہ ترجمہ بھی ضعف اور تحریف سے خالی نہ تھا، ان کے ترجمہ میں جزئیات کا ادراک ہی ملتا ہے۔ کلیات کا احاطہ نہیں ملتا۔

۶- قرآن آزادئ فکر کا مخالف ہے۔ قضاوقدر کا نظریہ زندگی کو جامد بنا دیتا ہے۔ اسلام علم اور تہذیب کا منکر ہے۔

۷- عربوں کا ذہن توہم پرستانہ واقع ہوا ہے اور وہ علم سیمیا اور علم نجوم پر توجہ دیتے ہیں۔

(عربی اسلامی علوم اور مستشرقین: ص ۲۵۱-۲۵۳)

اداریہ

عربوں کی سائنسی خدمات مندرجہ ذیل منہاجیاتی نقاط کی حامل رہی ہیں:

۱-مشاہدہ اور تجربہ: عرب سائنس دانوں نے مشاہدہ اور تجربہ کو بنیاد کی حیثیت دی۔الکاشی نے لکھا ہے کہ کتابیں میری رہ نما نہیں، بل کہ مشاہدہ اور تجربہ ہے۔عبداللطیف البغدادی کہتے ہیں کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کی بنیاد میرا اپنا مشاہدہ ہے۔البیرونی نے بھی ایک جگہ ایسا ہے لکھا ہے۔

۲-علم کے ذریعہ انہوں نے حقیقت کا ادراک کرنا چاہا اور اس علم کے لیے انہوں نے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔دوسروں کے آرا اور نظریات کو انہوں نے عقل اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا اور انہیں کسوٹی پر پورا اترنے کے بعد ہی ان کو قبول کیا۔جو باتیں ان کی تجزیہ میں خلاف واقعہ ثابت ہوئیں ان کو انہوں نے مسترد کر دیا۔

۳-وہ عقل کو ایک خدائی عطیہ سمجھتے تھے، جس کا استعمال دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں ہی ہونا چاہیے۔

۴-حکمت مومن کی گم شدہ دولت ہے۔یہ دولت جہاں بھی مل جائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔یہی حدیث مسلم فضلا کے پیشِ نظر رہی۔

۵-عربوں نے علوم کی خدمت اس لیے کی کہ ان کی خدمت کی جانی چاہیے۔اس خدمت کے پیچھے دنیا طلبی کارفرما نہ تھی۔ابوجعفر احمد ابن الجزار القیروانی نے ایک دفعہ تین سو مثقال سونا اور ابوالریحان البیرونی نے القانون المسعودی کی تصنیف پر ایک ہاتھی کے بوجھ کے برابر چاندی کی حکومت کی مالی پیش کش کو اسی لیے مسترد کر دیا تھا۔ان کے دلوں میں علم کا جو مقام تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔قاضی ابوالحسن الولواجی نے جب سنا کہ ابوالریحان کا آخری وقت قریب ہے تو وہ زیارت کے لیے آیا۔البیرونی کی سانس اکھڑ چکی تھی، جاں کنی کا عالم تھا، مگر جیسے ہی اس نے قاضی ابوالحسن بولا اس وقت اور اس حالت میں؟ البیرونی نے جواب دیا ہاں اسی وقت، میں نہیں چاہتا کہ اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس مسئلہ سے مجھے واقفیت نہ رہے۔قاضی ابوالحسن نے مسئلہ کی وضاحت کر دی اور وہاں سے نکلتے ہی لوگوں کے رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی کہ البیرونی چل بسے۔

(عربی اسلامی علوم اور مستشرقین: ص ۲۶۱-۲۶۲)

یہ ہوئی مستشرقین کی سازشوں کا مختصر جائزہ۔خلاصہ یہ ہے کہ اس تحریک نے مسلمانوں کے خلاف گہری سازشیں کی اور اب بھی جاری ہے، مسلمانوں کو ان کی کارستانیوں سے متنبہ رہنا چاہیے، استعمار نے کیسے شکنجہ کسا؟!! تو آیئے اس کا جائزہ لیتے ہیں:

## قرآن کی پہلی وحی کے آثار و برکات علوم کی صورت میں:

آج سے چودہ سو سال پہلے قبل کا روان نبوت کے آخری حدی خواں تشریف لائے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا سے ''اقراء'' کا نور اور شعور وصول کیا۔سلسلۂ وحی کے اس اختتامی دور کی تمہید لفظ ''اقراء'' سے

ہوئی۔اسی سلسلۂ وحی میں علم کو قلم کے حوالے سے سیکھنے سکھانے کا ذکر ہوا اور پھر انسانوں کو اس علم کی تعلیم دی گئی جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ مابعد الطبیعاتی علوم پر سبقت وفضیلت کا ایک درس تھا۔اس آخری صحیفے میں نبوت کی جن ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا، ان میں تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس اور تعلیم کتاب وحکمت کے فرائض ثلاثہ کا ذکر کیا گیا ہے۔تمام کارنامۂ نبوت انہی تین فرائض کی ادائیگی کے نتیجے میں ظہور میں آیا۔اس علم نے ایک ثقافت کو پیدا کیا، جو اپنی اقدار کے لحاظ سے پاکیزگی اور صالحیت سے عبارت تھی۔اسی ثقافت کے مظاہر نے وہ تمدن جنم دیا اور پھر ایک روشن تہذیب وجود میں آئی جس نے انفس وآفاق کے حوالے سے پیدا ہونے والے علوم وفنون کا ایک جہاں آباد کر دیا۔

## قرون اولیٰ خمسہ یعنی پہلی صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک کے مسلمانوں کے علمی وتحقیقی کارنامے:

ظہور اسلام کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت کی حقیقی درخشندگی علوم وفنون کے میدان میں تھی۔اسلام کی عالمی اور آفاقی تہذیب اپنے علمی اور تحقیقی کارناموں کے باعث زندہ رہی۔اس تہذیب کا عروج وزوال اس کی علمی اور تحقیقی روایات کے مدّ وجزر سے مستلزم ہے۔اسلامی تہذیب نے ابتدائی پانچ صدیوں تک جو علمی اور تحقیقی کارنامے سرانجام دیے، اس کی گونج کئی صدیوں تک یورپ کی درس گاہوں میں سنائی دیتی رہی۔یورپی جامعات میں مسلمانوں کی کتابیں مدتوں درسی متون کے بطور پڑھائی جاتی رہی۔ابتدائی صدیوں میں مسلم شخصیات کی ذاتی رہائش گاہیں ہی درس گاہوں کا درجہ رکھتی تھیں۔طلبہ ان صاحبان علم وفضل کی تلاش میں نکلتے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے تھے۔پھر آہستہ آہستہ اسلامی ریاست میں مستقلاً تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی گئی۔ایک درس گاہ میں بیک وقت بیسیوں اساتذہ متعین ہوتے۔اس مرحلۂ عمر میں ان کے تحقیقی شعور اور نبوغ کا مقابلہ کسی اور چیز سے نہیں کیا جا سکتا۔مسلمانوں کی ان قدیم درس گاہوں کی علمی اور تدریسی خدمات درجنوں کتابوں میں لکھی ہوئی آج دنیا کے بیشتر ممالک کے کتب خانوں میں ملتی ہیں۔

## آٹھویں صدی ہجری سے عالم اسلام کے علمی زوال کا آغاز اور مغرب کی بیداریاں:

مگر آٹھویں صدی ہجری میں علم وتحقیق کے یہ مراکز خشک ہو رہے تھے۔تحقیقی اور تخلیقی فضا دھندلا رہی تھی۔یہی وہ مرحلہ تھا کہ مغرب علوم وفنون کی تخلیق وتحقیق کی صف میں شامل ہوتا ہے۔تحریک احیائے علوم نے ان کے اس علمی تجسس کو ایک نئی شان بخشی۔نتیجتاً علم وحکمت کے خزینے اہل مغرب کے ہاتھ لگے اور وہ ترقی کے مختلف مظاہر کو پیش نظر رکھتے ہوئے بالآخر سیاسات عالم پر حاوی ہو گئے۔

## اہل مغرب اپنی منڈیوں کی تلاش میں عالم اسلام کا رخ کرتے ہیں:

نئی نئی ایجادات واختراعات سامنے آئیں تو ان اشیا کی برآمد کے لیے انہیں نئی منڈیوں کی تلاش تھی۔اس تلاش نے انہیں اسلامی ممالک کو فتح کر کے اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کے مواقع عطا کیے۔مراکش سے

اداریہ

ملیشیا تک کے تمام علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر استعماری قوتوں کی گرفت میں چلے گئے۔ سیاسی اقتدار کے ذریعے وہ یہاں کی تہذیب وثقافت کے تمام مظاہر کو بدلنے میں کامیاب ہوتے چلے گئے۔ علوم وفنون کی دنیا میں اب استعماری طاقتوں کی زبان میں تمام درسی اور تعلیمی سرگرمیاں پھیلتی چلی گئیں۔ اس نئی تعلیم نے عقائد سے ثقافت تک کے تمام تصورات کو تبدیل کر دیا۔ ملت اسلامیہ اسلامیت اور مادیت کی کشمکش کا شکار ہوگئی۔ سترہویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی عیسوی کے ربع اوّل تک بہت سے مسلمان مفکرین نے امت مسلمہ کے زوال کی تشخیص میں فکر انگیز تحریریں لکھیں۔ برصغیر کے مسلمان مفکرین نے بھی اسباب زوال امت کے حوالے سے توجہ دلائی۔ شاہ ولی اللہ سے علامہ محمد اقبال تک فکر اسلامی کی تشکیل نو کا ایک احساس ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اب تک عمومی طور پر عالم اسلام کے خلاف مغربی سازشوں کا اجمالی ذکر کیا گیا اب ہندوستان میں یورپی اقوام نے کس طرح سازشیں رچیں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

## مغلیہ عہد میں ہندوستان کی تعلیم گاہیں:

برصغیر میں مغلیہ عہد میں تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کی رفتار مثالی نہ سہی، مگر اطمینان بخش تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۰۸ء۔۱۷۰۷ء) کے زمانے میں بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبات میں سیکڑوں ایسے مدارس قائم ہو چکے تھے جہاں پر معیاری تعلیم کا انتظام اور سہولتیں موجود تھیں، مگر اورنگ زیب مسلمانوں کے اس تعلیمی معیار سے مطمئن نہ تھا۔ وہ تعلیمی اداروں میں ایسے علوم اور طرز تدریس کا متمنی تھا جو اسلامی حکومت کے مختلف مناصب کے لیے ذمہ دار تیار کر سکے۔ عالمگیری عہد اقتدار میں ملا نظام الدین (۱۶۷۷ء۔۱۷۴۸ء) نے اسلامی درس گاہوں کے لیے ایک نمونہ بن گیا۔ عربی زبان کے ساتھ فارسی ادبیات کو بھی فروغ ملا۔ فارسی زبان وادب کی تدریس میں تو ہندو بھی برابر کے شریک ہو گئے۔ برطانوی اقتدار نے ان اسلامی درس گاہوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ مگر اسلامی علوم کی روایت بدستور جاری وساری رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار سب سے پہلے بنگال کے علاقے میں قائم ہوا۔ اس وقت یہاں پر اسی ہزار مدارس کا جال پھیلا ہوا تھا، مگر یہ مدارس بتدریج سرکاری سرپرستی سے محروم ہوتے چلے گئے۔ یہاں کے فیض یافتگان کے لیے سرکاری مناصب میں گنجائش کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ یہ وہ مرحلہ تھا کہ مسلمانوں میں خواندگی کی شرح بوجوہ بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔

## ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سازشیں:

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری عشروں میں عیسائی مشنریاں ہندوستان میں برطانوی مقبوضات پر اپنے تبلیغی مقاصد کے پیش نظر تعلیمی ادارے قائم کرنے پر زور دے رہی تھیں۔ وہ ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمہ داران کو مجبور کرتی رہیں کہ برطانوی مقبوضات میں مغربی علوم وفنون کو رواج دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ مغل عہد کے اسلامی درس گاہوں کے نظام اور نصاب میں واضح تبدیلی کے بھی خواہاں تھے۔ عیسائی مشنریوں کی ان

خواہشات پر کمپنی بہادر کے ذمہ داران عمل نہ کر سکے تو عیسائی مشنریوں نے اپنے طور پر تعلیمی اداروں کا ایک جال پھیلانے کی مکمل منصوبہ بندی کر لی۔ جہاں تک کمپنی کے ذمہ داران کا تعلق ہے انہوں نے سیاسی سطح پر اپنی مقصد برآری کے لیے جان کارٹیئر (John Cartier ۱۷۳۳ء۔۱۸۰۲ء) نے عربی اور فارسی علوم کا ایک مدرسہ ہگلی میں قائم کرنے کی سفارش کی اور اسی طرح وارن ھیسٹنگز (۱۷۳۲ء۔۱۸۱۸ء) نے اپنے عہد میں کلکتہ میں "مدرسۃ العالیہ" کی بنیاد رکھی، جس میں مسلمان گھرانوں کے طلبہ کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ بنگال کے علاقے میں سرکاری سرپرستی میں قائم ہونے والا یہ پہلا نمایاں مدرسہ تھا۔ برطانوی عہد میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے پہلا بجٹ ۱۸۱۳ء میں مختص کیا گیا۔ مگر ایک لاکھ روپے کی یہ گرانٹ بھی ایک مدت تک استعمال نہ کی جا سکی۔ انگریزی تعلیم کے ادارے اب قائم ہونے لگے اور ۱۸۲۹ء میں سرکاری اداروں کی تعلیم کے لیے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ برطانوی حکمرانوں نے اس مقصد کے لیے تعلیمی کمپنی قائم کی۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے کو اس کمپنی کا صدر مقرر کیا گیا۔ میکالے کی کوشش اور استدلال سے فارسی کو ذریعۂ علم کے لیے غیر موزوں قرار دے کر ختم کر دیا گیا اور انگریزی زبان کو مؤثر ذریعۂ تعلیم تصور کرتے ہوئے اپنا لیا گیا۔ (ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل: ص ۱۰-۱۳)

انگریزوں نے ہندوستان میں مسلم حکومت کو شکست دے کر دیگر معاشرتی و حکومتی اداروں کے ساتھ ان کے نظام تعلیم کو بھی ختم کر دیا اور نیا نظام تشکیل دیا۔ جس کا ہدف یہ تھا کہ لوگ برائے نام اپنے ورلڈ ویو سے مرتبط رہ کر مغرب کی فکر و تہذیب کے آگے سرنگوں ہو جائیں اور انگریز کی غلامی قبول کر لیں چناں چہ یہ مقصد اس نے حاصل کر لیا۔ (ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل: ص ۲۱-۲۲)

## تربیت کا فقدان:

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیائے کرامؑ اور خصوصاً ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت اور فرائض نبوت کا ذکر کیا ہے تو اس میں تزکیہ و تربیت کو خصوصی اہمیت دی ہے بل کہ ایسا اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ جس سے یہ صاف مترشح ہوتا ہے کہ تعلیم کتاب و حکمت کا اصلی اور آخری مقصد بھی تزکیہ ہی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گو تعلیم بھی مقصود ہے، لیکن تعلیم بھی دراصل اس لیے مطلوب ہے کہ وہ سبب بنتی ہے تزکیہ و تربیت کا۔ گویا تعلیم بھی قرآن کی رو سے، دراصل ذریعہ اور وسیلہ ہے تزکیہ و تربیت کا۔ اور جو چیز اصلاً شارع کو مطلوب ہے وہ تزکیہ و تربیت ہی ہے یعنی سیرت کا مطلوبہ سانچے میں ڈھل جانا یا نفس کی ایسی تربیت کہ انسان آسانی سے ان اعمال خیر کو اپنا لے، جنہیں اپنانے کا اس کے خالق و مالک نے حکم دیا ہے اور ان اعمال سے بچ جائے جن سے بچنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور یہی تزکیہ کا لغوی مفہوم ہے کہ عملاً خیر کو اختیار کرنا اور منکرات کو ترک کرنا اور دیکھا جائے تو یہی سارا دین ہے اور یہی دین کا مغز اور اس کی ساری تعلیمات کا نچوڑ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے خیر پر عمل کرنے لگے اور شر سے بچنے لگے۔ ظاہر ہے کہ کتابیں پڑھنا اور رٹنا

اداریہ

تو مقصود نہیں بل کہ اصل مقصد ان سیکھی اور پڑھی ہوئی باتوں پر عمل کرنا ہے۔ عمل پر دوام سے عادتیں بنتی ہیں اور عادتوں کے مجموعے ہی کو شخصیت کہا جاتا ہے۔ گویا تربیت وتزکیہ کا مطلب ہے "اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے خیر پر عمل کی کوشش اور اس کے بتائے ہوئے شر سے بچنے کی عملی جدوجہد"۔

## تعلیمی ادارے اور اساتذہ کا اصلی کام طلبہ کی صحیح تربیت کرنا ہے:

مندرجہ بالا تصریحات سے واضح ہے کہ ایک استاد کا اور ایک تعلیمی ادارے کا اصل کام بچے کی تربیت کرنا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اکثر اساتذہ کو اس کا احساس نہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام بس اتنا ہے کہ جو مضمون پڑھانا ان کی ذمہ داری ہے، کلاس میں جا کر وہ پڑھا دیا اور بس فرض ادا ہو گیا۔ کیوں کہ اول تو بہت سے اساتذہ باقاعدہ تربیت یافتہ نہیں ہوتے اور جنہوں نے ٹریننگ لی بھی ہوتی ہے وہ اس چیز کی ٹریننگ لی ہوتی ہے کہ سبق کیسے تیار کرنا ہے اور سبق پڑھانے کے اصول اور طریقے کیا ہیں؟ باقی رہی یہ بات کہ بچے کی تربیت کیسے کرنا ہے اور اچھا اور باعمل مسلمان کیسے بنانا ہے؟ یہ انہیں پڑھایا جاتا ہے نہ اس کی اہمیت بتائی جاتی ہے اور نہ اس کے گر سکھائے جاتے ہیں۔ یہ حال ہے ہمارے تربیت دینے والے اداروں کا۔

اسی طرح اسکول کی انتظامیہ خواہ وہ کسی سرکاری اسکول کی انتظامیہ ہو یا پرائیویٹ سیکٹر کے کسی اسکول کی۔ اسے اکثر و بیشتر یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کا بنیادی فرض بچوں کی تربیت کرنا اور تعلیمی ادارے میں تربیت کا ماحول پیدا کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے پلاننگ اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے، اس کے لیے تنظیم، بہت سے عملی اقدامات ان اقدامات کی افادیت کے تجزیے اور طلبہ پر ان کے اثرات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمل تربیت کی جانچ (Evaluation) بھی اس کا اہم عنصر ہے اور یہ سارے کام اسی وقت ہو سکتے ہیں جب انتظامیہ کو اس کام کا احساس ہو اور وہ پوری تندہی سے اپنے اس فرض سے عہد برآ ہونے کی کوشش کرے۔ (ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل: ص ۵۹-۶۱)

ہندوستان میں تعلیمی راستہ سے کس طرح مغرب نے تبدیلی پیدا کرنے کی سازشیں رچی اور ہمارے تعلیمی ادارے اور اساتذہ اب بھی کیسی کوتاہی برت رہے ہیں اس کے ذکر کے بعد آیئے پھر دوبارہ عالمی سازشوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔

## مابعد جدیدیت اور سیکولرزم کی برپا کردہ سازشیں اور اس کی حقیقت:

استعمار کی سازشوں کے بعد آیئے سیکولرزم کی کارستانیوں پر ایک نظر دوڑاتے ہیں:

مابعد جدیدیت (Postmodernism) کی زبان میں اس بات کو یوں کہیں گے کہ مذاہب اور ادیان محض عہد رفتہ کی عظیم حکایتیں ہیں۔ بقول ٹرنر (Turner) "سیکولر بائزیشن، نفس انسانی کے متعلق ان نہایت ہی روایتی تصورات کا ترکیبی جزو ہے، جو نفس کو اس کے بے ساختہ جوانی عمل سے پہچانتے ہیں، جس کی

وجہ سے انفرادیت پسندی اور ذاتی رویوں نے ایک واضح سماجی رجحان اختیار کرلیا ہے، جس کا محور مذہبی فکر سے نفرت اور اس سے آزادی ہے، چناں چہ دیکھنا یہ ہوگا کہ دین و مذہب کے برعکس سیکولرزم ہے کیا؟

اس اصطلاح کی جڑیں لاطینی لفظ ''سیکولم'' میں ہیں۔ جس کا مطلب ہے زمانہ حال۔ یہاں زمانہ حال سے مراد عالم آخرت کے بالمقابل (جو شاید آئے یا نہ آئے) محسوسات کی دنیا ہے، جو دائم اور قابل یقین ''سچائی'' ہے۔ جس میں انسان اور اس کی ذہانت اور اس کی یہ اہلیت کے وہ خود اپنے لیے اچھائی یا برائی کا انتخاب کر سکتا ہے کاروبار حیات کے لیے کافی ہے۔ یعنی پائیدار اقدار کے بالمقابل ایک ایسی اضافیت جو تاریخ کی ہر نئی حرکت کے ساتھ خود بخود منصۂ شہود پر آئے۔ سیکولرزم کا کوئی بھی مفہوم تسلیم کرلیں یہ نظریہ باوجود اپنے ظاہری نئے پن کے اتنا پرانا ہے کہ اسے فرسودہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ بنیادی طور پر اپنے مزاج الہامی ہدایت کا سخت حریف ہے کیوں کہ اپنی اصل میں یہ دونوں تامی (holistic) ہیں۔

سیکولرزم مظاہر پرستی، پیشوائی کے دعوے دار گرجوں، موروثی بادشاہتوں، آج کی سائنسیات (scientism) اور مابعد جدیدیت کو پروان چڑھانے اور باقی رکھنے میں مدد دی ہے۔ یہ بات بظاہر مہمل اور متناقض لگتی ہے کہ سیکولرزم اجماع ضدین کو ممکن دکھا رہا ہے، لیکن انسان کے خود ساختہ مذاہب اور بعض حالتوں میں تصوف سے اس کا لگاؤ اور قیاسی فکر اور تصوارت کے لیے اس کی رغبت فطری امر ہے۔ کیوں کہ وحی والہام کے برعکس اس کا سارا زور انسانی نفس اور اس سے پیدا فکر و عمل پر ہے، اور اسی چیز کو وہ انسان کے تہذیبی وجود کی اساس و بنیاد طے کرنے والا حقیقی محرک مانتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی دماغ کی ہر وہ کاوش، جو اللہ تعالیٰ کے حق حکمرانی کو دل سے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے عملاً اسے خود ساختہ خونوں میں بانٹتی ہے، سیکولر ہی کہلائے گی۔ مثلا: تمام خرافات (یونانی ہوں یا رومن) اپنی اصل میں سیکولر ہیں۔

ہر بادشاہ جو اپنی حکمرانی کی سند مراکز تقدس (divine) سے لاتا ہو، وہ بھی سیکولر ہے۔ پیشوائی کے یہ دعوے کہ انہیں ثالثی اور مختاری الٰہی سند حاصل ہے، سیکولرزم ہی کے مظاہر ہیں۔

کوئی شخص یا گروہ اگر عقیدے کے سماجی مطالبات کو نظر انداز کر کے محض روحانی ذکر و فکر پر زور دے، وہ بھی سیکولرزم ہے۔

کوئی بھی طرز حکمرانی؛ جس میں حاکمیت اعلی عوام الناس کی مانی جائے اور انہی کی خواہشات کو قانون سازی کا منبع تسلیم کیا جائے وہ بھی سیکولر ہے۔

میرا درج بالا نقطہ اس روایتی تصور سے مختلف ہے جس کا دعوی ہے کہ: سیکولرزم نے ۱۸۳۰ء کو عشرے میں اس یورپی ہیجان میں جنم لیا، جس کے محرکات ایک طرف عیسائی پیشواؤں کے جامد عقائد و افکار تھے دوسری طرف دولت مند اور طاقتور حلقوں کے مذہبی اور سیاسی آزادیوں کے خلاف دشمنی پر مبنی طرز عمل کا آپس میں گٹھ

جوڑ تھا۔ یوں پہلے سے پروان چڑھتے خدابیزاری کے رجحانات (طامس پین اور طامس ہکسلے)، افادیت پسندی (جیرمی بینتھم اور جیمز مل) اور قابل مشاہد ضعیت (سینٹ سائمن اور آگسٹے کونٹ) کو فکری گٹھ جوڑ کا موقع ملا۔

## سیکولرزم نے مغرب میں کس طرح جنم لیا؟:

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عصر حاضر کے سیکولرزم کا راستہ جس چیز نے صاف کیا، وہ تھا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ایسا مغربی نظام، جسے ایک طرف کلیسائی اقتدار اور دوسری طرف خاندانی بادشاہتوں کے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ اس سیکولر عمل کو جن چیزوں نے تیز تر کیا وہ سائنسی امکانات، مادی ترقی اور لذتیت سے بھر پور زندگی کی توقعات تھیں، جن کے سحر میں عام لوگ گرفتار ہوئے اور خواب حقیقت بنتے دکھائی دینے لگے۔

### عمل داری اور اختیار کا مسئلہ:

سیکولرزم اور مذہب میں رقابت اور تصادم روز اول سے موجود ہے، کیوں کہ دونوں عمل داری کے معاملے میں سخت جان حریف واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً مذہب اپنے آپ کو حق بہ جانب سمجھتا ہے کہ وجود انسانی کے لیے عالم آخرت پر زور دے، کیوں کہ انسان کی اخلاقی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالی کو قادر مطلق اور فنا سے بالاتر ہستی تسلیم کیا جائے اور انسانی زندگی کو فانی اور جوابدہ مانا جائے۔ مذہب کے نزدیک ان اساسیات کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے، جب انسان کے معاشرتی اور سیاسی نظام کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ استحصال کے بجائے انصاف کی راہ کشادہ ہو اور انسان اپنے اخلاقی، روحانی اور مادی امکانات کا ذمہ داری کے ساتھ اظہار کرنے کے لیے داخلی اور ذمہ دارانہ جذبے سے سرشار ہو۔ سیکولرزم کو اس طرز فکر و عمل سے انکار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مذہبی دعووں کی بنیاد پر کیے گئے فیصلے کس طرح سماج کی اصلاح کر سکتے ہیں؟ ان دعووں اور فیصلوں کا ماخذ ایک غیر یقینی خدا کی ہستی اور مبہم ذریعہ الہام اور رسالت اور اس کے کام اور احکام ہوں لہٰذا مذہب اور سیکولرزم میں نزاع کا معاملہ اقتدار اور اختیار کے حوالے سے ہے۔ (سیکولرزم مباحث اور مغالطے: ص ۲۱-۲۴)

## سیکولرزم کیا تقاضہ کرتا ہے؟:

سیکولرزم کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ: انسانی زندگی کسی الہامی فرمان اثرات سے آزاد کیا جائے اور اس طرح عوام کے ذہنوں سے تاریخ کا سحر توڑ کر انہیں ماضی کی رومانویت سے باہر نکالا جائے۔

اس پس منظر میں مذہب اور ریاست میں دوری کی نقشہ گری بے مقصد نہیں ہے۔ اس میں وہ سارے رنگ موجود ہیں جو سینٹ سائمن، اگوستے کونٹ، سگمنڈ فرائڈ اور ایم درخیم نے اپنی تحریروں میں بھرے تھے۔ ان سب نے مذہب کو انسان کا ابتدائی دور کا وہمی عمل قرار دیا۔

## مغرب کے مشہور فلاسفہ اور سائنس دانوں کے نظریات:

کونٹ (Comte) نے معاشرے کے ارتقائی تصور کے نام سے ایک ترکیب پیش کی، جس میں

مفروضوں کی بنیاد پر انسانی ارتقا کی تصویر کشی کی گئی کہ انسانیت کا فکری سفر الٰہیات سے شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ فلسفہ اور بالآخر سائنس تک جا پہنچا۔ درخیم کو مذہب میں ایک ادراکی اور وجدانی روح نظر آئی، کیوں کہ معاشرے کو باہم جوڑے رکھنے میں اس کا کردار تھا۔

ٹیلر (Tayloer) کو مذہب کی تاریخ، مظاہر پرستی سے مشرکانہ افعال اور بالآخر وحدانیت کی طرف حرکت کرتی دکھائی دی۔ دنیا کی آرزو کے بجائے اس کے آلام اور دکھوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بیدار کرے۔ اسے یقین تھا کہ احساس گناہ سے آزاد ہو کر ہی اعصابی امراض سے بچا جا سکتا ہے۔ کارل مارکس کو انسان بہ شمول مذہب، معاشی اور سماجی بندھنوں میں جکڑا نظر آیا۔ اس خیال میں مذہب بھی ایک جکڑ بندی کا آلہ کار تھا۔ پیداواری عوامل کو اولیت دے کر اس نے یہ گمان کیا کہ ہر واضح نظر آنے والے اقتصادی اور معاشی تعلقات کے نیچے پہلے سے موجود، فرسودہ باطنی قالب اور سانچے ہیں جن پر معاشرہ استوار ہوتا ہے۔

## مغربی فلاسفہ نے مفروضوں پر مفروضے قائم کیے:

مختصراً یوں سمجھ لیں کہ ان حضرات نے انسانی معاشرے کی تشکیل و ارتقا میں مراحل کا مفروضہ قائم کیا: پہلا مرحلہ الٰہیاتی تھا، جس میں مذہب سماجی عمل کا اولین محرک تھا اس کا کردار یکجائی، حرکت اور استحکام تینوں سے متعلق تھا۔ دوسرا مرحلہ وہ تھا جب معاملہ مذہب سے فلسفے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جس سے انسان کو اپنی عقلی صلاحیتوں کے آزادانہ استعمال کا موقع ملا اور فکر و نظر کا ہمہ گیر نظام وضع کرنے کی کوشش کی گئی۔ تیسرے مرحلے میں سائنس سامنے آتی ہے۔ جس کی فکر اور سوچ میں کوئی بھی حقیقت اپنی ظاہری شکل میں اس وقت تک قبول نہ ہوگی، جب تک کہ اس کی تصدیق مشاہد اور تجربہ نہ کر دیں۔ سائنسی اکتشافات ہی حقیقت کی پردہ کشائی کریں گے اور انہیں کے مطابق وضع شدہ قوانین اس معاشرے کی تشکیل کریں گے، جس پر مذہب کی دھند، توہم پرستی اور جہالت کی چھاپ نہیں ہوگی۔ (سیکولرزم مباحث اور مغالطے: ص ۲۹-۳۱)

## اسلام ہی واحد کامل اور برحق نظریہ ہے:

اسلام کی نظر میں یہ جہان عالم کسی مشین کی طرح کی کوئی چیز نہیں ہے، جسے (معاذ اللہ) کسی بہرے اور بے تعلق خدا نے گردش دے دی ہو۔ پھر نہ یہ ایسے منتشر اجزا کا کوئی ملغوبہ ہے، جو ہر وقت آپ میں ٹکرا رہے ہوں؛ بل کہ یہ دنیا اس سے قطعی مختلف اور ایک بہت پیچیدہ تشکیل ہے، جس میں باہمی اجماع کا اصول پوری طرح کارفرما ہے، جو ایک بہت منفرد تامی تشکیل میں گتھا ہوا ہے۔

## کائنات کو ایک خالق نے بڑے منظم انداز میں وجود بخشا:

یہ جہاں رنگ و بو کسی اتفاقی حادثے سے وجود میں نہیں آیا۔ کہ جس کا نہ آغاز ہو اور نہ کوئی انجام۔ یہ تخلیق ایک پروگرام کے تحت ہوئی ہے جس کی سمت متعین ہے، زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسان اس میں مرکزی

اداریہ

حیثیت کا مالک ہے۔اس جہان پر ایک حی قیوم اور بزرگ و برتر خدا حکم راں ہے۔اگر کسی کو کہیں بہ ظاہر بے ربطی اور انتشار نظر آتا ہے تو یہ موجودہ انسان کی اپنی کوتاہ نظری ہے کہ وہ دیکھ نہیں پا رہا کہ اس عالم کا در و بست بے حد محکم و منظّم ہے۔یہ جہان انسان کے گرد گھوم رہا ہے۔کیوں کہ ہر ثانوی واقعہ اور ادراک میں آئے، انسانی زندگی کے لیے مدد اور معاون ہے۔

## اسلام ہی ہدایت کا حامل مذہب اور دین ہے:

اسی میں ہدایت اور رہنمائی بھی شامل ہے۔امر واقعی یہ ہے کہ اللہ کے حضور سے عطا شدہ ہدایت، انسانی زندگی کی منطقی تکمیل ہے۔اگر یہ نہ ہو تو مخلوق کے لیے خالق ارض و سما کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے اور خود تخلیق بے معنی ٹھہرتی ہے۔

چناں چہ وحی و الہام پر مبنی اسلام نے درج ذیل خبر دی:

اللہ وحدہ لاشریک اور بے مثل ہے، ساری کائنات کا سرچشمہ صرف ایک جل و علیٰ خالق ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔

## توحید کا مطلب خالق اور مخلوق کا ربط ہے:

توحید باری کا یہ بنیادی اصول دو قطبی ہے: ایک طرف خالق ہے دوسری طرف مخلوق۔دونوں وجودی لحاظ سے غیر متجانس (disparate)۔نہ یہ دونوں ایک ہیں اور نہ یکساں۔تخلیق، اللہ رب العزت کی صفت خالقیت کا مظہر ہے اس طرح یہ دونوں مقصدی صداقتیں ہیں۔

دوسری مخلوقات جو ایک مخصوص جبلت اور انداز میں بندھی ہوئی ہیں، انہیں طبیعی اور اخلاقی حوالوں سے بے قید آزادی حاصل رہتی ہے۔اس کے برعکس انسان کو آزادی حاصل رہتی ہے۔اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزادی کی مخصوص غائیت اس کی تکریم سے ہم آہنگ ہے۔یعنی انسان نہ تو تخلیقی طور پر قابل نفرت ہے، نہ وہ روز اول سے کسی ''گناہ اول'' میں لتھڑا ہوا ہے۔اس کے قطعی برعکس اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، تاکہ اللہ رب العزت کے ارادوں اور مرضیات کی تکمیل ہو۔یعنی انسان زمین پر ایک ایسی تہذیب کو بروئے کار لائے، جس میں وہ اپنی انفرادی زندگی میں امن سے رہے اور خارج میں دوسرے انسانوں سے نہ الجھے، کیوں کہ اپنے حقیقی سرچشمے (ذات باری تعالیٰ) سے اس کے تعلق کا یہی تقاضا ہے کہ وہ مخلوق کی فلاح و بہبود چاہے۔بہ قول ڈاکٹر اسماعیل الفاروقی الراجی:

## اللہ کی مرضی اور منشا کے بغیر کائنات کی کوئی حقیقت نہیں:

''اللہ رب العزت کی بالاتر مرضی و منشا کے بغیر کائنات کی کوئی حقیقت اور غایت ہی نہیں ہو سکتی، جو انسان کی اخلاقی سعی و عمل کا مقصود و مطلوب ہے۔اگر انسان تخلیق خداوندی کا سرتاج ہے تو اسی بنا پر ہے کہ ذاتی

سطح پر اخلاقی کاوش اور عمل کے ذریعے وہ واحد کائناتی واسطہ ہے، جس کے ذریعے برتر الٰہی مرضی، زمان ومکان کے منظّم سماوی وجود میں داخل ہوکر تاریخ بن جاتی ہے"۔

اس صورت گری میں اللہ تعالیٰ پر ایمان زندگی کا اصول بن جاتا ہے، جس کی بڑی انقلابی اہمیت ہے۔ انسان اپنے وجود کی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے، تاکہ وہ زندگانی کی اس تمثیل میں اپنا کائناتی کردار بہ حسن وخوبی ادا کرسکے۔

## اسلام الہامی دین ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے:

اسلام کو اپنے الہامی دین ہونے پر اس درجہ یقین کامل ہے کہ وہ بقول اسماعیل الفاروقی اپنے آپ کو سائنسی حقیقت کے مماثل قرار دیتا ہے، جس کی تصدیق باقاعدہ حقیقی مشاہدہ کرنے والا کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تجزیاتی صلاحیتوں کو، اس کی تربیتی اٹھان، اس کے موروثی عقیدے اور پڑھائی گئی تاریخ نے مسخ نہ کردیا ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کی گہرائیوں اور وسعتوں میں اپنے آپ کو رکھ کر صورت حال کا جائزہ لے، تاکہ اسے موجودات کا کامل تصور حاصل ہو، فرد کی ذات، اس طرح خالی الذہن ہوکر اپنے حقیقی تشخص کو پاسکے گی، جسے ایک متعین مقصد حاصل ہوگا، جو باقی سارے اثرات کا راستہ روک دے گا اور زمان ومکان میں اس کے آگے بڑھتے چلے جانے کا جواز فراہم کردے گا۔

## نفس انسانی فطری اور جبلی طور پر اپنے خالق کی معرفت رکھتا ہے:

چناں چہ قرآن کریم، نفس انسانی کو آیات الٰہی کی نشست گاہ قرار دیتا ہے کہ جب وہ "تمدن کے بھاری بوجھ" سے آزاد ہوکر عمل کرے تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی تصدیق کرتا ہے۔" یہی بات دوسری طرح یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ نفسِ انسانی جبلی طور پر اپنے خالق کو جانتی ہے۔ اس صلاحیت کا اللہ تعالیٰ سے ایک ربط اور تعلق ہے، کیوں کہ اس کی ذات نے ہی تو انسانی نفس کو وجود بخشا۔

قرآنِ پاک میں نفسِ انسانی کی تین حالتیں بیان ہوئی ہیں:

۱۔ نفسِ امّارہ: وہ نفس جو انسان کو بدی پر اُکساتا ہے۔

۲۔ نفسِ لوامہ: وہ نفس جو غلط کار کو ملامت کرتا ہے۔

۳۔ نفسِ مطمئنہ: وہ نفس جو اسلام کی صداقت پر مطمئن اور جسے ایمان کی نعمت حاصل ہے۔

یہ تین آزاد نفوس نہیں ہیں؛ بل کہ ایک ہی مربوط نفس کی تین کیفیتیں اور اعمال ہیں۔ یہ نفس اس حوالے سے خودمختار ہے اور اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اپنے خالق اللہ ربّ العزت سے جُڑ جائے اور چاہے تو اس ذاتِ باری تعالیٰ کا انکار کردے۔ پہلی صورت وہ مسلم ہے، جب کہ دوسری صورت میں کافر یا مشرک، یعنی جو یا تو اپنی ذات ہی کو حاکم ومختار بنا بیٹھے یا قومیت، نسلیت، رواجات، قیاسی نظریات اور خواہشاتِ نفس جیسے باطل خداؤں کی بندگی کرے۔

اداریہ

## اللہ نے مومنوں کو جنت کے بدلہ خرید لیا ہے:

قرآن پاک کہتا ہے: ''اللہ نے مومنوں کی جان اور ان کے مال، جنت کے بدلے خرید لیے۔ سو وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے تورات، انجیل اور قرآن میں۔ اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدے میں سچا ہے؟ لہٰذا اللہ سے کیے ہوئے اس خرید وفروخت پر خوشیاں مناؤ۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے''۔ (سیکولرزم مباحث اور مغالطے: ص ۴۷-۵۰)

## مسلمانوں کی قائم کردہ علمی تحریک نے انسانیت کو بہت کچھ دیا:

مسلمانوں کی قائم کردہ وہ علمی تحریک تھی جو تاریخ کی سب سے گراں قدر علمی تحریک خیال کی جاتی ہے۔ اس تحریک نے بہت کچھ لیا اور بہت کچھ دیا۔ اس نے اقوام کو نشو ونما عطا کیا اور یہ تحریک تاریخ عالم میں ترجمہ وتصنیف کی ایک عظیم الشان تحریک تھی، جس میں مدارس اور کتب خانے قائم کئے گئے اور تجریدی فلسفہ، نظری اور تجربی علوم میں نہایت گراں قدر کام ہوا۔

## آج کے تجربی علوم دراصل اسلام اور مسلمانوں کے بنیاد فراہم کردہ ہیں:

جس تجربی اسکول پر آج سارے علوم کام کر رہے ہیں یہ مسلمانوں کا قائم کردہ ہے، اس کو آج جغرافیہ، فلکیات، طب، کیمیا، غرض زندگی کے ہر رخ میں نہایت بڑے پیمانے پر اپنایا جا رہا ہے۔

اسلام اس بے پناہ فعال ماحول اور ارتقائی فضا میں آگے بڑھ رہا تھا، جب یورپ اپنے جمود میں از سرتا پا ڈوبا ہوا تھا۔

## اسلامی دنیا کی طاقت کے خاتمہ کا سبب اسلام سے دوری ہے:

اور جب اسلامی دنیا کی طاقت بالکل ہی ختم ہوگئی (جس کا سبب یہی تھا کہ مسلمان اپنے اصل محرک (اسلام) سے دور ہوگئے) جب بھی مسلمانوں میں اس قدر حرکت اور ارتقا موجود تھی کہ اس نے صلیبی دور میں یورپ کی تاریکیوں میں روشنی کی شمع فروزاں کردی اور یہی روشنی یورپ کو تاریکیوں سے باہر لے آئی۔

## صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں یورپ اسلام کی علمی تحریک سے واقف ہوا:

صلیبی جنگوں میں یورپ کو تاریخ کی عظیم الشان تحریک یعنی اسلام سے واسطہ پڑا اور اسی کی بچی کھچی زندگی سے استفادہ کرکے یورپ نیند سے بیدار ہوگیا۔ اور زندگی اور حرکت کے راستہ پر چل پڑا۔

صلیبی جنگوں کا سب سے بڑا پہلا اور سب سے بڑا فائدہ یورپ میں تحریک احیائے علوم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اور عیسائیوں کو مسلمانوں کے ان تمام علوم کا پتہ چلا جو اصلاً یونانی تھے اور مسلمانوں نے ان میں قابلِ قدر اضافے کئے تھے، یا وہ مسلمانوں کے اپنے علوم تھے۔

یورپ کی تحریک احیائے علوم دراصل لوگوں کی جہالت، خرافات اور دیومالائی انداز فکر سے باہر لانے کا ایک زبردست ذریعہ بنی۔

## یورپ میں جاگرداری کا خاتمہ دراصل اسلام کے نظام عدل کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوا:

پھر جب یورپ نے صلیبی جنگوں کے دوران مسلمانوں کی ایک مرکزی حکومت اور سب پر نافذ ہونے والے قانون کی خوبیاں دیکھیں جس میں جاگیردار کی خواہشات کا کوئی دخل نہ تھا، اور جس میں عدالت، مقنّنہ، اور قوت نافذہ شخص واحد میں اس طرح مرتکز نہیں تھے کہ وہ یورپ میں تھے۔ تو یورپ نے بھی جاگیرداری اور قبائلی نظام توڑ کر قوم اور ملک بنانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

اور جاگیرداری کے خاتمہ اور غلاموں کی آزادی کے بعد انہوں نے بھی اسی طرح تجارتی اور صنعتی شہر بسانے شروع کر دئے جس طرح مسلمانوں کے ساحلی تجارتی شہر تھے۔

اور حرکت کے یہ آثار اس جمود سے متصادم تھے جو یورپ کی زمین میں اپنی گہری جڑیں رکھتا تھا، کیوں کہ ایک طویل عرصہ سے یورپ میں ہر ایک شے غیر ارتقائی اور غیر متحرک تھی غلام اور جاگیردار سب غلامی اور جاگیر صدیوں سے وراثت میں ملتی چلی آ رہی تھی۔ اور صاحب اقتدار اہلِ مذہب نے جمود کو اپنی جگہ پر خوب مضبوط کر دیا تھا۔

زندگی ایک ہی رفتار پر چل رہی تھی عورت مرد اور بچے سب ایک لگے بندھے طریقے پر اپنی زندگیاں گذار رہے تھے۔ ایک شخص مرتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔ اور اسی سمت چلنا شروع کر دیتا جس سمت میں پہلا چل رہا تھا۔

نہ جانے والے کے جانے سے زندگی کی رفتار میں کوئی فرق پڑتا اور نہ آنے والے کی آمد اپنے دامن میں کوئی تبدیلی لاتی۔ غیر ارتقائی طبقاتی نظام میں ہر شخص سانس لے رہا تھا، شریف اپنی جگہ شریف (lord) تھا، عوام اپنے مقام پر عوام تھے، اور اہل مذہب اپنی جگہ پر باعزت تھے، کہیں بھی کوئی تبدیلی اور تغیر نہ تھا۔

معاشی، اجتماعی، سیاسی، فکری اور روحانی زندگی صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چلی آ رہی تھی، کسی بھی فرد کے فکر و شعور کو اس میں کوئی دخل نہ تھا، بل کہ ہر شخص یہ خیال کرتا تھا کہ یہ زندگی ہمیشہ سے اسی طرح چلی آ رہی ہے۔ یہ سب غیر ترقی پذیر ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ غیر ترقی پذیر رہے گی۔

زندگی کے اس جمود میں افکار، اخلاق اور روایات بھی جامد پڑے ہوئے تھے، جن کے اوپر جامد مذہب کا پردہ پڑا ہوا تھا، جو اس جمود میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

جہالت، خرافات اور دیومالائی انداز فکر نے اس تعطل کو اور بھی گمبھیر بنا دیا تھا کیوں کہ علم تو عقل و ذہن کو حرکت میں لاتا ہے اور عقل و دماغ کی حرکت عملی زندگی کے متحرک ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر ذہن مسلسل عمل اور حرکت کرتا رہے تو تعطل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، بل کہ ہمہ وقت متغیر رہے گی۔ ہر لمحہ ایک نئی تبدیلی اور ارتقا کا پیش خیمہ ہوگا۔

یورپی کلیسا جہالت کی بنیادوں پر قائم تھا کیوں کہ اس کے ظالمانہ اقتدار کو سہتے رہنے کے لیے عوام کا جاہل رہنا ضروری تھا، اگر عوام بیدار ہوجاتے تو کلیسا کا اقتدار باقی نہیں رہ سکتا تھا۔

اداریہ

## کلیسائی علم کی مخالفت:

اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کلیسا ایک طویل عرصے تک جہالت کا تحفظ کرتا رہا اور علم نافرمانی، بے دینی اور اللہ کی رحمت سے دوری کا نام دے کر اس کی مخالفت کرتا رہا۔ بعینہ یہی برتاؤ کلیسا نے کوپرنیکس گیلیلیو، چروانو برونو اور اس ہر اس سائنس دان کے ساتھ کیا جس نے کلیسا کی مقدس جہالت کا پردہ چاک کر کے علم کی روشنی دکھانے کی جرأت کی۔

## کلیسائی غیر ذمہ دارانہ روش کا نتیجہ تھا یورپ میں لادینی تحریک کی بنیاد:

غرض صلیبی جنگوں کی جھنکار اور ان جنگوں سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے زیرِ اثر یورپ آہستہ آہستہ اپنے انتہائی گہرے تعطل و یکسانی سے باہر آنا شروع ہوگیا۔ اور بالکل طبعی طور پر حرکت کی بنیاد لادینیت (secularism) قرار پائی کیوں کہ مغربی کلیسا تمام معاملات میں جمود کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ اس لیے نئی حرکت کو لازمی طور پر مذہب سے متصادم ہونا چاہیئے تھا۔ اور یقینی طور پر اس نئی تحریک کی بنیاد لادینی ہونا چاہیئے تھی، کیوں کہ مذہب تو حرکت و تغیر کے مخالف تھا۔

## کلیسا اور بادشاہوں میں کشمکش:

ادھر کلیسا اقتدار ایک بھوت بن کر لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا تھا، کلیسا نے لوگوں پر لازم کر دیا تھا کہ وہ اہل مذہب کے سامنے جھکیں۔ اور کلیسا نے لوگوں پر ٹیکس اور تاوان لگائے ہوئے تھے، اس کے علاوہ لوگوں کو کلیسا کی جاگیروں میں مزدوری کرنا پڑتی اور ان لشکروں میں جبری بھرتی ہونا پڑتا جو کلیسا بادشاہوں سے لڑنے کے لیے تیار کرتا تھا۔

اس غلامی کا ردعمل ہمہ گیر آزادی کی شکل میں سامنے آیا، اور لوگ یہ خواہش کرنے لگے کہ کلیسا کے اقتدار کو ختم کر کے نئی بنیادوں پر احیائے ملی کیا جائے۔ جلتی پر تیل کا کام کلیسا کی اس حرکت نے سائنس دانوں کو تعذیب و سزا دہی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ اور جس کسی نے اپنی عملی تحقیق سے مقدس دیومالا کی مخالفت کی وہ ہی مستحق سزا ٹھہرا۔ ظاہر ہے کہ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہوتا کہ تحریک احیائے علوم کلیسائی اقتدار اور مذہب دونوں سے دور ہوگئی۔ نہ صرف یہ کہ نشاۃ ثانیہ کی بنیاد لادینی قرار پائی بل کہ اس بت پرستانہ یونانی اور رومی روح کو ابھرنے کا بھرپور موقع مل گیا، جس پر قرون وسطیٰ میں مسیحیت کا باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا، جوں ہی کلیسا کی مخالفت شروع ہوئی فوراً یہ بت پرستانہ ابھر آئی۔ اور دوبارہ زندگی افکار اور دلوں پر مسلط ہوگئی۔

اداریہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارا عمل بہت تدریجی اور سست رفتار رہا، کیوں کہ تحریک کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو، وہ رفتہ رفتہ دلوں میں جگہ بناتی اور سست رفتاری سے پھیلتی ہے۔ کیوں کہ تحریک کو بہت سی شعوری اور غیر شعوری رکاوٹیں دور کرنی پڑتی ہیں اور اپنا راہ ہموار کرنا پڑتا ہے۔ وہ انکار جو ایسے پر جوش لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوں جو ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ اور اپنے راستہ سے نہ ہٹیں، ایسے افکار بھی کافی عرصہ گذرنے کے بعد عوامی بنتے ہیں، تحریک احیائے علوم بھی صدیوں تک کلیسائی اقتدار سے مزاحم رہی اور رفتہ رفتہ زندگی کو لادینی بنیادوں پر استوار کرتی رہی، مگر ابتداہی سے یہ تحریک لادینی تھی۔ اور پوری طرح ہیلنیت (Hellenism) سے مدد حاصل کر رہی تھی۔

## تحریک احیائے علوم اور عیسائیت کی تلخ کشمکش:

آخر کار تحریک احیائے علوم اور مذہب میں ایک طویل اور تلخ کشمکش شروع ہوگئی۔ تحریک احیائے علوم کے فکری، علمی اور فنی ثمرات نہایت دلکش تھے۔ جن کے نتیجہ میں پہلی مرتبہ اہل مغرب کی آنکھیں نور عمل سے منور ہوتی تھیں۔ پھر یہ تحریک جمود کے بجائے یونانی اور رومی میراث تھی جس کو مسیحیت ختم و نہ کر سکی البتہ اس پر پردہ ڈالے رکھا۔ تحریک احیائے علوم کے لئے یہ تمام باتیں خوش آئند تھیں اور اس امر کے مواقع مہیا کر رہی تھیں کہ تہذیب اور علوم وفنون میں وہ پوری طرح اپنے اثرات چھوڑتی رہے مگر اس کے ساتھ ایک دوسرا پہلو عقیدہ ایک ہزار سال تک لوگوں میں مقبول رہا۔ خواہ اس عقیدہ کی گہرائی کتنی ہی کیوں نہ ہو عملی زندگی میں اس کے اثرات کتنے ہی سطحی کیوں نہ ہوں اور لوگوں کے اعمال پر اس کی حاکمیت کتنی ہی معمول کیوں نہ ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ عقیدہ عوام کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے ہوئے تھا۔ اور اس کا اکھاڑنا یا مٹانا آسان نہ تھا

یہی وجہ تھی کہ یورپ ایک طویل عرصہ تک دوگانہ عنصر کا حامل رہا، ایک طرف مسیحیت تھی اور دوسری جانب ہیلنیت (Hillenism) کلیسا میں مسیحیت کا رفرما تھی تو واقعاتی زندگی پر ہیلنیت کا تسلط تھا، اور اگر وجدان مسیحی تھا تو فکر ہیلینی تھی۔

اگر چہ دوگانہ عناصر صدیوں چلتے رہے۔ مگر لوگوں کے دلوں میں ایک پوشیدہ جنگ برپا تھی اور یہ جنگ مذہب کے بجائے ہیلنیت کے مفاد کو تقویت پہنچا رہی تھی، گو بظاہر مذہبی اقتدار عوام کے دلوں میں جاگزیں تھا۔

## نظریہ ارتقا نے مذہب کے خلاف جنگ جلی پر تیل کا کام کیا:

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا۔ جب ڈارون کے ہاتھوں مذہب سے آخری کشمکش برپا ہوئی۔

۱۸۹۹ء میں ڈارون نے اپنی کتاب اصل الانواع (Origin of species) اور ۱۸۵۹ء میں اصل انسان شائع کر کے تاریخ کا ایک نیا رخ متعین کر دیا۔

اداریہ

اس سے قبل کلیسا کا مقابلہ کوپرنیکس (Copernicus 1473-1543) گیلیلیو (Galileo 1564-1642) اور چروانو برونو (1548-1600) سے ہو چکا تھا۔ اور کلیسا کو جلا چکا تھا اور ہر قسم کی سزائیں دی چکا تھا، کیوں کہ انہوں نے کلیسا کے اس نظریہ کی مخالفت کی تھی کہ زمین آسمان کا مرکز اور انسان کائنات کا مرکز ہے۔ اگر چہ عوام نے کلیسا کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں کی بھیانک خیال کیا۔ مگر پھر بھی انہوں نے ملاحدہ کے خلاف کلیسا کی فتح پر نعرہ ہائے تحسین بلند کئے۔

## ڈارونیت کا قیامت سامیناں:

ان واقعات کے بعد ڈارون قیامت بن کر ٹوٹا جب اس نے اعلان کیا کہ انسان کی اصل حیوان ہے۔ نتیجہ یہ کہ کلیسا نی اسے کافر قرار دیا۔ اور عوام پھر کلیسا کے ساتھ ہو گئے کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ انسان کی بزرگی اور شرافت چھین کر اسے حیوان بنا دیا جائے۔

مگر جتنے عرصہ ڈارون اور کلیسا کے درمیان جنگ جاری رہی۔ اس دوران عوام کے نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اور عوام نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مذہب کے نام پر قائم اس بھیانک اقتدار کے خاتمہ کا یہ نادر موقع ہے۔ چناں چہ لوگ اپنی انسانی شرافت کو فراموش کر کے آزادی و بے قیدی پر خوش ہو گئے۔ خواہ یہ آزادی حیوانیت ہی کے روپ میں کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں نے ڈارون کے جرأت مندانہ اقدام پر مدح وستائش شروع کر دیا اور خاص طور پر اس امر پر تو بہت واہ واہ ہوئی کہ عوام کے ہاتھ میں ''علم'' کا وہ ہتھیار آ گیا جس سے وہ کلیسا کے ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

## جمود کی جگہ نظریہ ارتقا نے ڈیرا ڈال دیا:

اسی دوران جمود کی جگہ فلسفہ ارتقا نے لے لی۔ جو ایک عظیم تبدیلی تھی کیوں کہ تحریک احیائے علوم اگر چہ جمود سے متصادم ہوئی تھی۔ اور جمود کو کسی قدر متزلزل بھی کر دیا تھا، لیکن جمود و تحریک کی یہ کشمکش درون خانۂ نفس پوشیدہ تھی۔ اور ہیلنیت اور مسیحیت دونوں تحریک احیائے کے سارے دور میں اس کے بعد بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں اور ممکن تھا کہ کچھ عرصہ اور یہ دونوں عناصر باقی رہ جائے۔ مگر ڈارون نے آنے والے خطرات کی گھنٹی بجا دی۔

اب جمود کے بالمقابل حرکت وتغیر کا نظریہ دلوں میں پوشیدہ جذبہ نہیں رہا۔ بل کہ ایک سائنسی نظریہ بن کر سامنے آ گیا۔ اور اس حسین نیا نام ''فلسفۂ ارتقا'' رکھ دیا گیا۔

لوگوں کو نیا کھلونا ہاتھ آ گیا اور وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ آگے آگے سائنس داں اور ان کے پیچھے عوام الناس!

جب زندگی ایک خلیہ سے ترقی کر کے انسان کی شکل میں پیچیدہ وجود بن جاتی ہے۔ اور جب خود انسان بھی حیوان سے متغیر ہو کر انسان سے مشابہ حیوان یا حیوان سے مشابہ انسان بن جاتا ہے۔ تو زمین پر ایسی کون سے

شئی باقی رہ گئی جو غیر متغیر ہو؟ نظریۂ جمود اور عدم تغیر سخت خطرے سے دوچار ہو گیا۔ اور کافی وقت تک سائنس دانوں اور عوام کے اعصاب سے صدمے کو سہنے کے قابل نہ ہو سکے۔ مگر جب انہیں افاقہ ہوا تو انہوں نے خوشی خوشی اس نظریہ کو اپنایا! اور ہر ہر موقع پر نظریۂ ارتقا کو آگے بڑھایا۔ اب ان کی نظر میں نہ صرف زندہ وجود تغیر وارتقا سے دوچار تھے۔ بل کہ ہر شئی متغیر تھی۔ حتی کے افکار اور معاشرہ بھی غیر متغیر نہیں تھے بل کہ وہ ارتقا کی شاہراہ پر گامزن تھے۔

## نظریۂ ارتقا کی جلوہ سامانی نے مذہب تک کو تغیر پذیر اور ارتقائی قرار دیا:

حد تو یہ ہے کہ مذہب بھی تغیر پذیر ہو گیا۔ اور مذہب کا یہ فلسفہ گھڑا گیا کہ انسانی فکر میں اللہ کا تصور ہمیشہ یکساں نہیں رہا ہے۔ بل کہ ہمیشہ سے متغیر ہے۔ اور اب بھی تبدیل ہو سکتا ہے! اولاً باپ کی پرستش کی گئی۔ پھر طوطم کی عبادت ہوئی، پھر طبعی قوتوں کی خدا مانا گیا۔ پھر بتوں کی پوجا کی گئی۔ اور آخر میں اللہ کی عبادت ہونے لگی۔ اب اس عبادت میں بھی تغیر ہو سکتا ہے۔ کیا نقصان اگر فطرت کو خدا مان لیا جائے؟

## فطرت اور نیچر کو الٰہ ومعبود بنا دیا گیا:

فطرت جمیل وخوب صورت ہے۔ طبیعت خالق ہے، فطرت ہماری ماں ہے ہم فطرت کی عبادت کریں گے کیوں کہ ہم نے فطرت سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں۔ ہم بے رحم اور ظالم اقتدار رکھنے والے اور جہل خرافات اور دیو مالا کے حامل کلیسا کو ختم کر کے دم لیں گے۔ اور اس خوب صورت الہ کی عبادت کریں گے جس کا نہ کوئی کلیسا ہے اور نہ کوئی پابندی! نہ ٹیکس اور نہ تاوان، نہ رہبانیت! فطرت کا دیوتا ہمیں آزادی بخشتا ہے کہ ہم بے قید زندگی گذاریں۔ جو ہمارے جی میں آئے سو کریں۔ نہ ہمارے اعمال کا کوئی حساب ہو۔ اور نہ ان پر کوئی سزا، گویا ہم از سر نو پیدا ہو جائیں گے۔ اور بجائے مسیح کے نام پر پیدا ہونے کے فطرت کے پہلو میں جنم لیں گے۔ اس نئے مذہب سے ہمیں بے کراں مسرت حاصل ہوگی؟

نظریۂ ارتقا وتغیر کی جانب سبقت اور مذہب بیزاری کا جذبہ صرف ڈارون پر موقوف نہیں تھا۔ اگر چہ ڈارون اس کا سرخیل ضرور تھا۔

## صنعتی انقلاب کے اثرات:

یورپ کے صنعتی انقلاب نے بھی معاشی اور اجتماعی زندگی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور اس انقلاب کا اثر کسی طرح فلسفۂ ارتقا سے کم نہیں تھا۔

مشین کی ایجاد صنعتی انقلاب کا سبب بنی جس نے ساری مغربی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اور یہ انقلاب صرف معاشی اور اجتماعی تعلقات تک محدود نہیں رہا بل کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوا۔

نئے صنعتی شہر بنے اور وہاں کارخانوں میں کام کرنے کے لیے چاروں طرف سے نوجوان آنے لگے۔ اورانہوں نے شہر میں اس ڈھنگ سے رہائش اختیار کی جس سے وہ پہلے سے واقف نہ تھے۔

## صنعتی انقلاب سے پہلے اور بعد میں:

صنعتی انقلاب سے پہلے کی زندگی پرسکون منضبط، سست رو اور گھٹی ہوئی سی زندگی تھی۔ یہ زندگی دیہات اور جاگیرداروں میں یکساں طریقے پر اپنی تمام سختیوں اور دل چسپیوں کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ کسان کی کھیتی باڑی میں لگے ہوئے تھے اور ان کی بیویاں گھر سنبھالے بیٹھی تھیں اور سوت کات کر بیچا کرتی تھیں۔

سب ہی لوگ ذہنوں میں مذہب، اخلاق اور روایات کا ایک متعین مفہوم رکھتے تھے، اور خواہ کوئی مذہب کی پابندی کرے نہ کرے، اور خواہ کوئی شخص عملی زندگی میں مذہبی تعلیمات کی خلاف ورزی ہی کیوں کرتا رہے۔ مگر کسی ذہن میں مذہبی اصول توڑنے کا تصور نہ پیدا ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس معاشرے میں ہر متعین مقدس خیال کی جاتی تھی۔ اور یہ تقدس مذہب سے زیادہ قدیم رسم ورواج کی بنا پر حاصل ہوا تھا۔

جب بے راہ نوجوان کوئی اخلاقی جرم کرتے تو بسا اوقات معاشرہ اسے نظر انداز بھی کر دیتا۔ مگر ہر حال میں جرم کو جرم ہی سمجھا جاتا تھا۔

عورتیں بھی اخلاقی جرم کی ہمت نہ کر پاتیں، کیوں کہ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب کرتیں تو ہمیشہ کے لیے معاشرے میں ذلیل ورسوا ہو جاتیں۔ اور خوف مذہب بھی جرم کے راستہ میں رکاوٹ بنتا تھا۔ کبھی ایک نسل گذرنے کے بعد کسی گاؤں میں کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آجائے تو وہ دیگر بات ہے۔

## صنعتی انقلاب بے حیائی کو ساتھ لایا:

مگر صنعتی انقلاب کے ساتھ حالات تیزی سے بدلنا شروع ہو گئے۔ نئے کارخانوں میں کام کرنے کے لیے نوجوان بغیر اپنے خاندانوں کے تن تنہا آئے۔ کوئی بھی مستقل جائے قیام ملنے سے پہلے اپنے اہل وعیال کو نہ لاتا، بل کہ اس تجربے سے دوچار ہوتا۔

جاگیرداری کی قید سے چھوٹے ہوئے یہ پرجوش نوجوان جو جاگیردار کی زمین میں پابہ زنجیر تھے۔ اب نئے معاشرے میں آزاد پھر رہے تھے۔

پھر یہ نیا معاشرہ نہ انہیں پہچانتا تھا نہ ان کی کوئی پرواہ کرتا تھا، اور نہ ان کے کسی عمل پر بندش قائم کرتا تھا، اور خود ان نوجوانوں کے بھی ایسے شناسا یہاں موجود نہ تھے، جن سے یہ شرماتے یا وہ انہیں ان کے غلط اعمال پر شرم دلاتے۔

سب سے بڑھ کر یہ نوجوان غیر شادی شدہ تھے اور جوانی سے بھرپور تھے جس کا لازمی نتیجہ اخلاقی جرم تھا، اور حالات بھی اسی راستے کو ہموار کر رہے تھے۔ اس کے بعد کارخانوں میں کام کرنے کے لیے عورت بھی آگئی۔

جب کارخانے داروں نے کم اجرت پر مزدوروں سے زیادہ محنت لینی شروع کردی۔اور مزدور اس کے ردعمل کے طور پر ہڑتالیں کرنے لگے اور اس طرح کارخانے دار اور مزدوروں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوگئے ۔تو مل مالکین نے یہ کوشش شروع کردی کہ وہ مزدوروں کی ایسی جماعت بھرتی کرلیں۔جو اسی اجرت اس سے کم اجرت پر مزدوری کرسکیں۔

اسی اثنا میں وہ عورتیں جن کے خاوند شہروں میں آچکے تھے، یا جن کو شوہروں کی تلاش تھی، کیوں کہ ہزاروں نوجوانوں کے دیہاتوں سے چلے آنے کی بنا پر عورتیں بغیر مردوں کے رہ گئی تھی۔

یہ عورتیں مزدوری کی تلاش میں آئیں اور مل مالکین کے پھندے میں پھنس گئیں اور حالات کی مجبوری کے تحت انہوں نے کم تر اجرت پر مزدوری کرنا قبول کرلیا۔

## روحانی زندگی مادی زندگی میں تبدیل:

اب تاریخ ایک نئے مور پر آچکی تھی!

عورت مزدوری کرنے لگی، اور بغیر کسی شریک کے اس اجرت کی مالک ہوگئی۔اگر چہ عورت اس اجرت سے اپنی اور اپنے خاوند کی کفالت کرتی تھی، مگر پہلے اسے ملکیت کا اختیار نہ تھا اب اس کے پاس حق ملکیت آگیا، پہلے اسے حق تصرف حاصل نہ تھا اب وہ بھی حاصل ہوگیا تھا۔

کیوں کہ مغربی معاشرے کی روایات اور قانون میں عورت کو قطعا یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ مال اور ملکیت میں کوئی آزادانہ تصرف کرے، یا کسی معاملہ میں براہ راست کوئی اقدام کرسکے۔

اس لیے جب عورت کو ملکیت حاصل ہوتی تو وہ حالات کے ماتحت اپنے آپ کو آزاد تصور کرنے لگی۔

اب جب کہ آزاد نوجوان مرد اور عورتیں یا ہم مل رہے تھے تو وہ آخر غیر مقید جنسی انگیخت پر کیوں نہ لبیک کہتے؟

مگر یہاں تک نوبت ایک دم نہیں پہنچ گئی، اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا، کیوں کہ دلوں میں بہت سے شعوری، پوشیدہ اور گہرے بندھن ایسے تھے، جو بے قیدی اور آزادروی کے راستے میں رکاوٹ تھے.....مگر رفتہ رفتہ یہ تمام بندھن ڈھیلے ہوتے چلے گئے۔

ترقی پذیر سرمایہ داری سائے تلے پروان چڑھنے والی نسل کو ایک قسم کی سیاسی آزادی حاصل ہوگئی، جو اس سے پہلے موجود نہ تھی۔

پارلیمان، انتخابات، پیشہ ورانہ قومی اور جماعتی نمائندگی، تقریر اجتماع، اور قول وعمل کی آزادی، جاگیر داری نظام میں ان میں سے کوئی بھی شئے موجود نہ تھی۔

مندرجہ بالا تمام امور تقدم اور حرکت وعمل پر آمادہ کرنے والے آزادی کے بعد مزید آزادی اور حصول حقوق کے بعد مزید حقوق کے حصول پر اکسانے والے بن گئے۔

اس صورت حال کے تحت لوگ راستے کی ہر رکاوٹ دور کرنے پر آمادہ نظر آنے لگے اور تنہا اقتدار کے مالک بن جانے والے خودغرض لیڈروں کے خلاف جدوجہد کرنے لگے۔

اداریہ

## آزادی میں غلو یہاں تک کہ مذہب سے بھی آزادی کا رجحان:

اس کشمکش نے آزادی کے جذبے کو اور نکھارا، اور آزادی لوگوں کو ایک شعور سے دوسرے شعور کی جانب اور ایک فکر سے دوسرے فکر کی طرف لے گئی، اب عوام کا مطالبہ آزادی زندگی کے ہر میدان میں حصول آزادی تھا، حتی کہ جاگیرداری معاشرے کی قائم کردہ اور مذہب کی عائد کردہ اخلاقی قیود سے بھی آزادی کا مطالبہ ہوگیا۔

خاندانی بندھن ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے
عورت ،مرد اور بچے سب کام پر لگ گئے

اب لوگوں کے ذہنوں میں اس گھر کا نقشہ باقی نہیں رہا جس کے تمام افراد ایک مقدس ڈور میں بندھے ہوں، خاص آداب مشاعر اور روایات کی پابندی کیا کرتے تھے، یہ گھر اس دیہاتی معاشرے میں بنا کر تا تھا، جس عورت اپنے ہاتھوں اور اپنے دل سے احساسات کو پاکیزہ بناتی، اور جس میں مرد اپنی بالادستی اور اپنے حکم سے ان آداب خانہ کی پابندی کراتا۔

عورت مرد کے یہ دوہرے رابطے افراد خانہ کو باندھے رکھتے، جذباتی ربط کی قیادت مال کرتی اور عملی ربط مرد قائم رکھتا، اور بچے ان رابطوں میں بندھے رہتے، اور ان کو توڑنے کی جرأت نہ کر پاتے۔

گھر کا یہ سارا نقشہ اسی وقت بدل گیا، جب عورت مزدوری کے لیے گھر سے نکلی کیوں کہ عورت اب جس محنت ومشقت سے دوچار تھی اس میں جذباتی ربط کے باقی رہنے کا سوال ہی نہ تھا۔

پھر عورت چوں کہ معاشی طور پر مستقل ہوچکی تھی، اس لیے باپ کی برتری کے بالمقابل ماں کی بھی بالادستی قائم ہوگئی، اور باپ جس عملی ربط کو انفرادی طور پر قائم کئے ہوئے تھا وہ ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد جب بچے مزدوری کرنے لگے تو ان میں قبل از وقت پختگی آنے لگی اور ان کے بچکانہ مشاعر تباہ ہوکر ان کے ننھے سے وجود میں پختہ مشاعر ابھر آئے، نتیجہ یہ کہ وہ جذباتی اور عملی دونوں بندھنوں سے بیک وقت آزاد ہوگئے، معاشرے میں بھی قابل اعتنا تغیر پیدا ہوگیا۔

## زندگی کے تمام شعبے صدیوں کی روایتی ڈگر سے ہٹ کر مادی راہ پر:

تمام اجتماعی، معاشی، سیاسی، اخلاقی اور فکری تعلقات میں تغیر وارتقا پیدا ہوگیا، اور ان میں سے کوئی بھی شئے اپنی حالت پر باقی نہیں رہی، جو صدیوں سے چلی آرہی تھی۔

پہلے فرد کا مقام ایسا تھا، جیسے کسی مکان کی اینٹ، ایک فرد جاتا تھا، دوسرا اس کی جگہ لے لیتا تھا.....مگر اب ایسا نہیں تھا۔

اداریہ

اب عورت و مرد اور بچے .....گھریلو زندگی اور گھر سے باہر کی زندگی، غلام اور آقا.....عمل اور اس کے نتیجہ میں آنے والی دولت غرض ہر شئے بدل گئی، اور یہ تمام تغیر اس تیزی سے آیا کہ پہلے کبھی تغیر کی رفتار اس قدر تیز نہ رہی تھی۔

پہلے دس بیس اور پچاس سو سال گزر جاتے اور کوئی قابل ذکر تبدیلی نہ پیدا ہوتی، اور سست رفتاری کی بنا پر یہ محسوس ہوتا کہ ہر شئے بالکل غیر متغیر اور ارتقا سے خالی ہے، مگر صنعتی انقلاب کے بعد سو پچاس سال کیا معنی صرف دس بیس سال میں نمایاں فرق رونما ہونے لگے۔

نہ مرد کو اپنے گھر میں بالادستی حاصل رہی۔

نہ عورت اب اپنے کو گھر میں مقید اور شوہر کی مرضی کا تابع خیال کرتی۔

بچہ کے پاس اگر چہ پیسے ہوتے تھے، مگر وہ نفسیاتی بے راہ روی سے دوچار ہوگیا.....غرض گھر کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

بغیر کسی عید و تہوار کے لوگ سڑکوں پر اس طرح نکل آتے جیسے تہوار کے موقعوں پر نکلتے، اور یہ از دہام دیہات کے پہلے کے سے ہجوم سے مختلف تھا، اب لوگ نہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے، نہ کسی کو دوسرے کی پروا تھی اور نہ اب وہ ایک دوسرے کے تعارف کی جھنجھٹ پالتے تھے۔

## غلامانہ زندگی میں تبدیلی بدنی غلامی سے نکل کر اب فکری غلامی کی طرف رخ:

غلام زمین کی غلامی سے آزاد ہوگئے، اور کارخانوں اور سرمایہ دار کی غلامی اختیار کرلی .....مگر وہ خوش تھا، کیوں کہ اس کی آمدنی بڑھ گئی اسے جدوجہد کا حق مل گیا، اسے اپنے حقوق کے مطالبہ کا حق مل گیا، اور اب اس کی فعال اور باوزن جماعتیں بن گئیں اور یہ وہ ایک ابھرتی ہوئی سیاسی قوت بن گیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوسرے غلاموں کے ساتھ مل کر ایسی فضا میں رہ رہا تھا جس کی ظاہری علامت غلامی کے بجائے آزادی تھی، اور خاص طور پر اخلاقی پہلو میں تو آزاد ہی تھا۔

پھر یہ کہ غلام کو اپنے شخص عمل میں اپنی انفرادیت کا احساس ہوگیا تھا، کیوں کہ پہلے وہ ریہاتی ماحول میں بندھے ہوئے اجتماعی عمل کے تابع تھا۔

انفرادیت کے ساتھ ساتھ مختلف جماعتوں کے وجود سے غلام کو اپنی اجتماعیت کا احساس بھی ہوگیا، جب کہ پہلے اس کی کوئی جمعیت نہ تھی، بل کہ وہ اس معاشرے میں جس میں اس کی نمائندگی نہ تھی ایک فرد ضائع تھا۔

غرض غلام کا پورا وجود بدل کر رہ گیا اور وہ بالکل سابقہ صورت حال کی ضد بن گیا، سیادت اور اقتدار کی نوعیت بھی بدل گئی، پہلے اقتدار زمین کی بدولت قائم ہوتا تھا مگر اب دولت کے بل بوتے پر ہونے لگا، اب سرداری کا مرکز سکڑ کر محدود مگر زیادہ فعال ہوگیا، اور اب سیادت و قیادت کو مزدوروں اور ان کی جماعتوں سے

متصادم ہونا پرتا تھا، جب کہ پہلے کے جامد جاگیرداری معاشرے میں اس قسم کی کوئی صورت نہ تھی۔

کاروبار کی نوعیت بھی بدل گئی، اب پہلے کی طرح غیب پر آس لگا کر بیٹھنا نہیں پڑتا تھا، جس طرح جاگیرداری نظام میں بیج بوکر بارش کا منتظر ہونا پڑتا تھا۔

بل کہ اب انسان کا تعامل دیکھی بھالی اشیا کے ساتھ تھا، اور اب وہ جس طرح چاہتا مادہ کو ڈھالتا تھا۔

اب اس کا تعامل ماوراطبعیت کے بجائے طبعیت سے تھا.....اور اللہ کے بجائے مادے سے تھا۔

غرض ہر شئے انقلاب سے پہلے کی صورت سے مختلف ہوگئی۔

اس تغیر وتبدل میں جب سائنس حصہ لیتی ہے، تو تغیر ہمہ گیر ہوجاتا ہے۔

## سائنسی ایجادات کی تیز رفتاری:

سائنسی ایجادات نے نہایت تیزی سے ترقی کی اور زندگی کی شکل بدل کر رکھ دی، مشین، بھاپ کی سواری، موٹر، بجلی اور مشینی صنعت، غرض ہر شئے بدل گئی۔

سائنسی ایجادات بھی ہمہ گیر تغیر سے دوچار ہیں، چند سال اور بسا اوقات چند ماہ نہیں گزرتے کہ تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔

سائنس میں جو بھی نئی تبدیلی آتی ہے، وہ لازمی طور پر زندگی کی ہر شکل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ریل کا سفر.....اس سفر سے قطعا مختلف ہے جو گھوڑوں اور گھوڑا گاڑیوں کے ذریعہ کیا جاتا۔

کپڑے کی مشین کی بناوٹ۔ ہاتھ کی بناوٹ سے علیحدہ شئے ہے۔ بجلی کوئلہ سے مختلف ہے۔

نئی نئی ایجادات سے بھرپور آج کی سڑک اس سڑک سے جداگانہ ہے۔ جو اپنی لمبائی چوڑائی میں یکساں ہی رہتی تھی۔

جدید ترین سامان والا آج کا گھر اس گھر سے مختلف ہے جس میں صدیوں ایک ہی سامان چلتا تھا۔

بل کہ خود سائنسی نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ جدید سائنسی تحقیقات اور جدید سائنٹفک آلات کی ایجاد کی بنا پر طبعیت کیمیا، طب، فلکیات، ریاضی اور علم الحیات میں نظریاتی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔

اب اس سے بڑھ کر کیا بات ہوگی کہ ساری زندہ کائنات ایک خلئے سے وجود میں آئی ہے؟ ہوا میں کروڑہا ایسے جرثومے موجود ہیں جو نظر نہیں آتے، مگر شدید وبائی امراض کا باعث بنتے ہیں؟ سیارے صرف سات نہیں ہیں۔ بل کہ لاکھوں سیارے میں جو ہمیں نظر نہیں آتے مگر وہ سورج سے بڑے اور زیادہ روشن ہیں؟

ان تمام امور سے تغیر، ارتقا اور عدم ثبات کا گہرا شعور ذہن میں جاگزیں ہوجاتا ہے۔

ان تمام امور کا نتیجہ ایک ایسی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس کے دو رخ ہیں۔

پہلا رخ تغیر وارتقا اور دوسرا رفتہ رفتہ مذہب سے دوری۔

## نظریۂ ارتقا بیماری کی صورت اختیار کر گیا:

اب ارتقا ایک سائنٹیفک نظریہ نہیں رہا جس کا ڈارون نے اپنی تجربہ گاہ سے اور علم الاحیا کو زیر بحث لاتے ہوئے اعلان کیا تھا۔ بل کہ ارتقا وتغیر ایک ایسی بیماری بن گیا، جس میں عوام اور سائنس داں سب ایک ساتھ مبتلا ہو گئے۔ اور انہوں نے ہر شئے کو ارتقا وتغیر کی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا۔

مذہب، اخلاق، روایت، اقدار، افکار، حقائق، معلومات، زندگی، معاشرہ فرد اور معاشرے کے تعلقات، فرد اور حکومت کے تعلقات، مرد کے مشاعر، عورت کے مشاعر، زندگی کے مقاصد ان میں کوئی شئے غیر متغیر نہیں رہی۔

بل کہ لوگوں کا رویہ یہ ہو گیا۔ کہ عدم تغیر سے جنگ کرنا ہے۔ اگر کوئی شئے از خود نہ بدلے تو اسے زبردستی بدل دیا جائے کسی بھی شئے کو جامد اور غیر متغیر نہ رہنا چاہئے کیوں کہ جمود ناموس حیات کی ضد ہے۔ ناموس زندگی صرف تغیر ہے۔ اور جو شئے متغیر نہیں ہے وہ ناموس زندگی کے مخالف ہے۔

اب تغیر وارتقا کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونے کی بجائے۔ خود مقصد بن گیا۔ اور لوگوں کو ہر غیر متغیر شئے کھٹکنے لگی۔

اب اگر اللہ پر عقیدہ غیر متغیر ہے۔ تو اسے بھی بدل جانا چاہئے، معبود بدلے یا طریقۂ عبادت! چاہے ہمیں طبعیت کی پرستش کرنا پڑے اور خواہ ہمیں اپنی ہی پوجا کرنی پڑے مگر تغیر بہر حال ہونا چاہئے، عبادت کے روایتی طریقے سے ہٹ کر کسی اور ڈھنگ سے عبادت ہونا چاہئے۔ غرض تغیر ہونا چاہئے، کسی طرح بھی ہو۔

اگر اخلاق غیر تغیر ہیں۔ تو انہیں بدل کر اخلاق بنانے چاہئیں۔ چناں چہ نفع پرستی، خود پسندی اور خاندانی روابط کا منقطع کر دینا آج کا اخلاق ہے۔

اور اگر روایات نا قابل تغیر ہیں۔ تو ان میں بھی تغیر آجانا چاہئے۔ چناں چہ عورتوں کو مردوں پر سبقت حاصل کرنی چاہئے۔ بچوں کو بڑوں کے مقابلے پر آنا چاہئے۔ عورتوں اور مردوں کے لباس بدلتے رہنا چاہئیں فیشن کی کثرت ہو کیوں کہ فیشن کی کثرت تیزی رفتار تغیر کی ضامن ہے۔

## معاشرے میں مذہبی اہمیت کا خاتمہ:

یہ تصویر کا ایک رخ تھا اور دوسرا رخ یہ ہے کہ معاشرے میں مذہب کا کوئی حقیقی وزن باقی نہیں رہا۔

مذہب کی عمارت تو اسی وقت متزلزل ہو گئی تھی جب لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی گئی۔ کہ آج کے تغیر وارتقا کے دور میں مذہب عدم تغیر اور عدم حرکت کا حامل ہے اور حرکت ہمیشہ سکون سے متصادم ہوتی ہے۔

پھر مذہب بیزاری میں اس امر سے بھی اضافہ ہوا کہ معاشرے کے تمام روابط غیر دینی (SECULAR) بنیادوں پر قائم کئے گئے۔

اداریہ

## فکر اور عمل پر میدان میں لادینیت کا دور دورا:

صرف فکری احیا ہی لادینی بنیادوں پر استوار نہ تھا۔ بل کہ اس فکر سے جو عملی نظام ابھرا وہ بھی سارا کا سارا لادینی تھا..... چناں چہ ترقی پذیر سرمایہ درای نظام سود کی بنیاد پر قائم ہوا۔ اور مذہب سود کو در سودی کاروبار کو حرام قرار دیتا ہے۔

اگر چہ کلیسا نے سعودی نظام کے خلاف کافی احتجاج کیا، مگر سرکش سرمایہ داری نے کلیسا کے احتجاج پر کان نہ دھرا، اور اخلاق و مذہب کو بالائے طاق رکھ کر مال و دولت کو مجنونانہ محبت میں یہ نظام آگے بڑھتا گیا۔

مرد و زن کے اشتراک عمل، معاشرے میں اختلاط، مجالس میں شرکت، آسائش کے حصول کے لیے مشترکہ جدوجہد.....عورت کی معاشی خودمختاری۔ اور اس کا یہ خیال کہ وہ اب پاکدامن رہنے کی پابند نہیں ہے کیوں کہ اگر مرد اس کے اخلاق کی بنا پر اسے چھوڑ دے تو وہ اپنی کفالت خود کر سکتی ہے، اور زندگی کی بڑھتی ہوئی دشواریوں کے تحت ایک نوجوان کا گھر آباد کرنے سے پہلے کافی وقت ذہنی اور جسمانی سکون کی تلاش میں خرچ کر دینا یہ تمام امور لادینی بنیادوں پر قائم ہوئے اور ان ہی پر مرد و زن کے آزادی پر جنسی تعلقات کی بنیاد رکھی گئی۔

اہل مذہب کے وعظ و تلقین کے برخلاف معاشرے کی واقعی صورت حال اخلاقی گرفت سے آزاد ہوگئی اور اخلاق فضا میں معلق ایسے مثال (IDEAL) بن گیا جس کا عملی زندگی پر کوئی اثر نہ تھا۔

مذہب تو پریورپ کے معاشرے میں پہلے ہی زندگی سے علیحدہ تھا۔ اور واقعی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہ تھا.....اور اب تو صنعتی انقلاب کے پیدا کردہ طوفان میں اس کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

سائنس کی بنیاد بھی ابتدا ہی سے مذہب سے بیزار ہی۔ کیوں کہ کلیسا جس مذہب کا حامل تھا، اس سے سائنس کو اتنی بھی تقویت نہ ملتی تھی، جس طرح اسلام نے تجربی اسکول سے عملی فکر کو تقویت عطا کی، نہ کلیسا صحیح معلومات دیتا ہے، اور نہ ہی کسی اور طریقے سے تقویت دیتا، بل کہ کلیسا تو جہالت کو ابھارتا، علم سے جنگ کرتا اور سائنس دانوں کو سزائیں دیتا تھا۔

سائنسی ایجادات کا بھی رخ انسانی فائدے کے بجائے مال و متاع کا حصول تھا، یہ جذبہ بھی مذہبی اسپرٹ کے خلاف تھا، مگر مذہب کو راہ نمائی کی کوئی قوت حاصل نہ تھی۔

## عام انسان بھی مذہب سے دور ہو گیا:

رفتہ رفتہ ایک عام انسان کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ اس کی زندگی پر تغیر پذیر پر اشیا کا اثر ہے۔ مذہب کا کوئی اثر نہیں ہے۔ سائنس مادی زندگی کی تشکیل کر رہی ہے۔ سیاست، سیاسی تعلقات کا تعین کر رہی ہے۔

سرمایہ داری معاشی زندگی کو استوار کر رہی ہے۔

صنعتی انقلاب اور اس کے نتائج اجتماعی زندگی کو ڈھال رہے ہیں اور ہیلنیت (HELLNISM) فکری

زندگی کی رہ نمائی کر رہی ہے۔اور مذہب ان سب باتوں سے علیحدہ دل کے کسی گوشے میں معطل پڑا ہے، شب وروز کی عملی زندگی مذہب کے اثرات کو کم کرتی جاتی ہے اور دل سے اس کی عظمت کم کرتی رہتی ہے۔

اب ایک فرد اپنی انفرادی، اجتماعی، عملی، علمی، سیاسی اور معاشی زندگی میں کہیں بھی مذہب اور خدا کا احساس نہیں رکھتا۔

اگر کوئی شخص مذہب بیزار نہیں بھی ہے تو بھی عملی زندگی میں وہ مذہب کو قطعاً نظر انداز کئے ہوئے ہے۔

مگر قصہ صرف مذہب سے روگردانی اور عملی زندگی میں اس کی عدم حاکمیت پر ختم نہیں ہوتا......بل کہ ایک بڑا پروگرام مذہبی اصولوں کو توڑنا اور صفحۂ ہستی سے ان کا وجود مٹا دینا تھا۔

یہ پروگرام عالمی یہودیت کا تھا جس میں اسے بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔(انسانی زندگی میں جمود وارتقا:ص ۱۷-۳۷)

جب ڈارون نے اصل انواع اور اصل انسان کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا تو یہودیت نے اس کو بھی اپنی کامیابی سمجھا اور اس نے اندازہ لگا لیا کہ اب کلیسا سے کس قدر سخت ٹکراؤ ہونے والا ہے۔

''علمائے یہود کے نظم عمل''

THE PROTDCLS OF THE LEARNED ELDERS ZION میں ہے: ڈارون اگر چہ یہودی نہیں ہے مگر اس کی آرا کی وسیع پیمانے پر اشاعت کر کے ہم مسیحی مذہب کی تباہی کا کام لے سکتے ہیں۔

یہ بات صحیح ثابت ہوئی اور یہودیت نے ڈارونیت اور مذہب میں منافرت پیدا کرنے کے لیے اپنی کوششیں وقف کر دیں تا کہ اس طرح آخر کار مذہب کا خاتمہ ہو جائے کیوں کہ یہودی تمام غیر یہودیوں سے عام طور پر اور یورپ کے مسیحیوں سے خاص طور پر نفرت کرتے تھے......مگر ان میں انتقام کی قدرت نہ تھی۔

عالمی یہودیت نے نظریہ ڈارون سے خوب فائدہ اٹھایا۔

یہودیت نے اس نظریہ کو اپنے تین علما کی مدد سے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا......ان تین علما نے دنیائے فکر کے تین اہم میدانوں۔معاشیات، اجتماعیات اور نفسیات کو مذہب دشمن بنیادوں پر استوار کر کے ساری مغربی فکر کو اسی رنگ میں رنگ دیا یہ تین یہودی علما مارکس، فرائڈ اور ڈرکایم ہیں۔(انسانی زندگی میں جمود وارتقا:ص ۳۸-۳۹)

غرض یہ کہ احقر نے اصولی طور پر صرف اسلام ہی نہیں مذاہب عالم کے خلاف یورپ نے کس طرح سازشیں رچی اس کو ہمارے بعض مفکرین کے حوالہ سے ذکر کیا، اب اس کا حل یہ ہے کہ ہم مذہبی اور مسلمان خاص طور پر زندگی کے ہر شعبہ میں مذہب کو اپنائیں، اسلامی تعلیمات کو عام رواج دیا جائے۔ہم نے شاہراہ کے اس شمارے میں خاص خاص مقالات ومضامین کو شامل کیا تا کہ اس کو پڑھ کر اپنی صحیح سمت کو متعین کیا جائے اور دشمنان دین کی سازشوں کو ناکام بنا دیا جائے۔اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔آمین!

# اختلاف مذموم یا مطلوب؟

## آیئے جانیں!!

# فقہ الخلاف کی روشنی میں

حذیفہ حضرت مولانا غلام محمد وستانوی

### فقہ الخلاف ایک تعارف:

عصرِ حاضر میں عام طور پر خلاف اور اختلاف کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے، اور اُس کے شرائط، آداب اور احکام سے ناواقفیت کی بنیاد پر امتِ مسلمہ شدید انتشار کا شکار ہے۔ اسلام ایک کامل ومکمل مذہب ہے، جس نے ہر چیز کے احکام اور آداب وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، قرونِ اولیٰ میں علمی استعداد کے پختہ اور مضبوط ہونے کی وجہ سے لوگوں میں آداب واحکام میں اختلاف کی رعایت عام تھی، مگر جیسے جیسے زمانہ عہدِ نبوت سے دور ہوتا چلا گیا، ویسے ویسے امت اصول اور فروع کی تمیز سے ناآشنا ہوتی چلی گئی، اور اپنی رائے کی مخالفت کی بنیاد پر مدِّ مقابل کو فاسق، فاجر یہاں تک کہ کافر اور گمراہ قرار دینے میں بھی کسی طرح کا تردد باقی نہ رہا، لہٰذا اِس وقت اِس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ''فقہ الخلاف'' کے احکام اور آداب سے طلبہ اور علما اچھی طرح واقف ہوں، لہٰذا سب سے پہلے ہم خلاف اور اختلاف کے معنیٰ لغوی، اس کے دیگر مترادفات اور ان کے فروق کو جاننے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کے بعد اصولی اور فروعی اختلاف اور اسی کے ساتھ اختلاف کی دیگر قسموں سے واقف ہوں گے، بعدہ اسبابِ اختلاف، آدابِ اختلاف، احکامِ اختلاف اور عصرِ حاضر میں بحث ومباحثہ کے صحیح اور غلط طریقوں کو جاننے کی کوشش کریں گے۔

### تالیفات وتصنیفات بر فقہ الخلاف

ویسے اِس موضوع پر قرنِ ثالث ہی سے علما نے قلم اٹھایا، مگر قرونِ اخریٰ میں اِس موضوع پر کچھ زیادہ مباحث اور کتابیں منظرِ عام پر آئیں، متقدمین کی بھی اور متاخرین علمائے کرام کی بھی، مگر متقدمین ومتاخرین کی تالیفات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عام طور پر متقدمین کی کتابیں تصنیف کی حیثیت رکھتی ہیں، کیوں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا براہِ راست کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوالِ صالحین سے اخذ کر کے اپنے اعتبار سے مرتب کیا، جب کہ متاخرین کے کام کی نوعیت تالیف، ترتیب، جمع وتہذیب کی ہے۔ یعنی متقدمین کی کتابوں

کو سامنے رکھ کر متاخرین نے اُن کی منتشر معلومات کو سلیقے کے ساتھ مرتب ومہذب کردیا،جس کی وجہ سے موضوع کو سمجھنا آسان ہوگیا۔

## خلاف واختلاف کی لغوی واصطلاحی تعریف:

خــــلف:(خ .ل .ف )کے مادے میں تین اصلی معنی پائے جاتے ہیں۔(۱)ایک کی جگہ دوسرے کا آنا(۲)عکس قدام(۳)التغیُّر

خلف کے مادے کے سلسلے میں صاحب''**ألمعجم الإشتقاق الموصل لألفاظ القرآن الكريم** ''اپنی معجم میں تحریر فرماتے ہیں کہ **الـخَـلف بـالـفتح : الباقي بعد الهالک والخِلف بالكسر: مايجيء بعد الشيء، وبقية كل شيء، والخِلفة بالكسر:ما علق خلف الراكب**۔

قرآن کریم نے خلف کے مادے کو مذکورہ تینوں معانی کے لیے استعمال کیا ہے۔

پہلا معنی: **مجيء الشيء بعده**﴿جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾(سورۃ فرقان:۶۲)

دوسرا معنی:عکس قدام﴿ يَعْلَمُ مَابَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾(سورۃ بقرہ:۲۵۵)

تیسرا معنی:التغیر "**لـخـلـوف فـم الـصـائـم أطيـب عـنـداللّٰــه مـن ريـح الـمسک**" (الحدیث)اوراختلافِ ناس میں پہلا معنی مراد ہوتا ہے،کیوں کہ اختلافِ ناس میں ایک شخص اپنی بات کو دوسرے کی بات ہٹا کر وہاں پر رکھ دیتا ہے۔

**الخلاف اصطلاحا:** ''صاحبِ کتاب التعریفات''امام جرجانی علیہ الرحمۃ خلاف کی تعریف کرتے ہیں:**مـنـازعة تـجـری مـن المتعارضين لتحقيق حق أو لإبطال باطل** ،یعنی مخالفین کا آپس میں اِس بات پر نزاع کرنا کہ یہ حق ہے یا باطل۔

اختلاف:یہ اتفاق واجتماع کی ضد ہے۔

## خلاف اور اختلاف کا فرق:

(۱)**أماالإختلاف هوماوقع من إفتراق بعدإجتماع** ،یعنی کسی چیز پر اتفاق کے بعد اختلاف کا پیدا ہونا۔

(۲)**ألإختلاف يستـعـمـل فـيـمـا بُـنـی علیٰ دليل، والخلاف فيمالادليل عليه** ۔یعنی اختلاف ایسی مخالفت جو مبنی بر دلیل ہو اور خلاف ایسی مخالفت جو مبنی بر دلیل نہ ہو۔

## حکمتِ اختلاف:

اللہ رب العزت نے انسانوں کی ترقی کے لیے بہت سی حکمتیں اختیار کی ہیں۔ منجملہ ان حکمتوں کے ایک حکمت انسانوں کے طریقۂ تدبر وتفکر میں اور طریقۂ عمل میں اختلاف بھی ہے، بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخر اختلاف کو ترقی کا سبب کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اِس لیے کہ اختلاف کی وجہ سے انتشار اور فساد برپا ہوتا ہے اور انتشار وفساد سببِ تنزلی تو ہوسکتا ہے، سببِ ترقی نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر اِس پر گہرائی کے ساتھ سوچا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اختلاف اگر اصول وضوابط آداب وشرائط کا لحاظ کرتے ہوئے کیا جائے، تو یہ ضرور ترقی کا ضامن ہوتا ہے، انسان کے ماضی کی تاریخ اِس پر شاہدِ عدل ہے، اس لیے کہ انسان فطری اور طبعی طور پر فروقِ فردیہ کا حامل ہوتا ہے، ہر آدمی کے سوچنے کا انداز علیحدہ ہوتا ہے، اور جب مختلف افکار، نظریات اور آرا ظاہر ہوتی ہیں، تو دوسرے انسان کے لیے اُن سب میں کوئی ایک اچھی رائے یا چند آرا کے مختلف اجزا کو ملا کر ایک بہترین رائے اور فکر وجود میں آجاتی ہے، اور اسی مصلحت کے پیشِ نظر اللہ رب العزت نے انسانوں میں سنتِ اختلاف کو جاری فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَلَوْشَاءَ رَبُّکَ فَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَایَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ﴾ (سورۃ ہود:۱۸) مگر اختلاف کا جہاں یہ رخ ہے، وہیں پر اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اگر اس میں اصول وضوابط اور آداب وشرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو وہ شر، فساد، فتنہ اور تنزلی کا سبب بن جاتا ہے۔

## اختلاف کے انواع واقسام:

وہ اختلاف جو امتِ مسلمہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے شروع ہوا اس کی مختلف صورتیں اور قسمیں ہیں۔

(۱) اختلافِ محمود (۲) اختلافِ مذموم۔ عام طور پر علما نے اصولِ اختلاف کی یہ دو قسمیں بیان کی ہیں۔

**اختلافِ محمود:** اُس اختلاف کو کہا جاتا ہے، جو اختلاف حدودِ شریعت کے دائرے میں ہو اور جس میں شریعت کے بیان کردہ اصول وضوابط، شرائط وآداب کو اختلاف کے وقت پیشِ نظر رکھا گیا ہو، جس کی بنیاد براہین ودلائل پر ہو، ایسے براہین ودلائل جو شریعت کے اصولِ تاویل کے مطابق ہوں۔

**اختلافِ مذموم:** اُس اختلاف کو کہا جاتا ہے، جس میں انسان اپنی نفسانی خواہشات یا اپنے کسی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر بلا کسی دلیل اور اصولِ تاویل کی رعایت کے ایسی جگہ پر اختلاف کرے، جہاں اختلاف کی گنجائش بھی نہ ہو۔

اقسامِ اختلاف کو بیان فرماتے ہوئے الدکتور ناصر بن سلیمان بن عمر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ متعدد جہتوں اور اعتبارات کی وجہ سے اختلاف کی مختلف قسمیں ہیں۔

**اختلاف کی پہلی تقسیم:** حقیقت وصورت کے اعتبار سے۔مختلف فیہ مسائل میں اختلاف کی دوقسمیں ہیں: اختلافِ صوری اور اختلافِ حقیقی۔

**اختلافِ صوری:** اس اختلاف کو کہا جاتا ہے، جس میں حقیقت و جوہر کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہ ہو، مگر اندازِ بیان کے تفاوت کی وجہ سے اختلاف صورۃً محسوس ہو؛ پھر اختلافِ صوری کی متعدد قسمیں ہیں۔

**(۱)اختلاف التنوع:** اس اختلاف کو کہا جاتا ہے کہ جس میں اختلاف کرنے والے کسی عام اسم یا کلمہ میں اختلاف کر بیٹھیں، مثلاً: قرآنِ کریم نے اختلافِ تنوع کو اِس طرح بیان کیا: ﴿فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ هُوَ الۡفَضۡلُ الۡكَبِيۡرُ﴾ (سورۃ فاطر:۳۲)

اِس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے جو اختلاف کیا ہے وہ اختلاف، اختلافِ تنوع ہے مثلاً: بعض نے کہا کہ **سابق بالخیرات** سے مراد وہ شخص ہے جو اولِ وقت میں نماز پڑھے، اور **ظالم لنفسه** سے مراد وہ شخص ہے، جو ایسے آخری وقت میں نماز پڑھے، جب وقت مکروہ ہو۔

اور بعض حضرات نے اس کی تفسیر یوں کی کہ: **سابق بالخیرات** سے محسن بالصدقہ اور **مقتصد** سے مراد احکامِ شریعت کے مطابق بیع وشراء کرنے والا اور **ظالم لنفسه** سے مراد سود کھانے والا۔

اختلافِ تنوع کی مثال احکامِ شرعیہ میں یہ ہے کہ فقہا میں سے کچھ لوگ کسی چیز کے وجوب کے قائل ہوتے ہیں، اور دوسرے لوگ اس کے استحباب کے قائل ہوتے ہیں۔

امام شاطبی علیہ الرحمہ نے اختلافِ صوری کی دس صورتیں ذکر کی ہیں، جن میں سے چار کا تذکرہ یہاں کیا جارہا ہے۔

**(۱)اختلاف تنوع:** جیسا کہ اِس کا بیان ابھی گذرا (۲) ایک ہی امام کے مختلف اقوال اور ان میں سے مفتیٰ بہ ہونے کے سلسلے میں اختلاف۔ (۳) اختلاف فی العمل نہ کہ اختلاف فی الحکم۔ جیسے قرائے سبعہ اور قرائے عشرہ کا اختلاف، اس لیے کہ تمام کے تمام قُرا نے اپنی قرأت کو بھی جائز قرار دیا اور اپنے علاوہ کی بھی، اور اُن پر کوئی نکیر نہیں کی۔ (۴) اختلافِ تلاؤم: اُس اختلاف کو کہا جاتا ہے جس میں آدمی کسی چیز کو بیان کرنے میں اختلاف کرے، جیسے حضراتِ صحابہؓ نے ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز واسلوب میں بیان کیا ہے۔

اختلافِ صوری کی تمام صورتیں مشروع نہیں ہیں، اگر کسی غلط ارادے سے یا ناحق اور باطل چیز میں اختلافِ صوری کیا جائے تو یہ اختلافِ صوری مذموم ہوجاتا ہے۔

**(۲)اختلافِ حقیقی:** اختلافِ حقیقی کو اختلافِ تضاد بھی کہا جاتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں: ا۔اختلافِ سائغ یعنی اختلافِ مشروع اور ۲۔اختلافِ غیر سائغ یعنی اختلافِ غیر مشروع۔اِس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

## اختلاف کی دوسری تقسیم:

اختلاف کی دوسری تقسیم باعتبارِ وجوب اور عدمِ وجوب کے ہے، اِس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(ا)اختلافِ حقیقی کی وہ صورت جو شقاق اور عداوت تک لے جانے والی ہو۔جیسے: اسلام کے مجمع علیہ اصول میں اختلاف۔مثلاً: وہ تمام کے تمام اختلافات جو فرَقِ باطلہ نے اہلِ سنت والجماعت کے ساتھ کیے، چاہے ماضی میں چاہے عصرِ حاضر میں۔

(۲)اختلافِ حقیقی کی وہ صورت جو موجبِ عداوت وشقاق نہ ہو۔عام طور پر لوگ اختلافِ صوری کو اختلافِ حقیقی کا روپ دے دیتے ہیں، ورنہ اختلاف کی یہ دوسری قسم درحقیقت اختلافِ صوری ہی ہے، اور یہ وہ اختلاف ہے جو حضراتِ فقہائے کرام کے درمیان پایا جاتا ہے کہ ہر فقیہ نے اجتہادِ مشروع کی روشنی میں کسی دوسرے فقیہ سے فروعات میں اختلاف کیا ہے۔

## اختلاف کی تیسری تقسیم:

اختلاف کی تیسری تقسیم "اختلاف کے اثر انداز ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے" ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔

(ا)ایسا اختلاف جو احکام اور اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔(۲)ایسا اختلاف جو محض نظری اور ذہنی ہو احکام اور اعمال پر اس کا کوئی اثر مرتب نہ ہوتا ہو۔پہلے کی مثال: حضرات فقہا کا چیزوں کے جواز وعدمِ جواز، وجوب اور استحباب کے سلسلے میں اختلاف۔دوسرے اختلاف کی مثال: فلاسفہ کا اختلاف، اسی طرح مناطقہ کا اختلاف۔

## اختلاف کی چوتھی تقسیم:

اختلاف کی چوتھی تقسیم باعتبارِ مدح وذم کے۔امام ابن القیم جوزی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: کہ قرآنِ کریم اور دینِ اسلام کی تشریح وتفہیم کے سلسلے میں، جو اختلاف مابین العلما پایا جاتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اختلافِ مذموم: ایسے اختلاف کو کہا جاتا ہے، جس میں اختلاف کرنے والا اِس طور پر اختلاف کرے کہ جس کی ممانعت کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہو، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے :﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَ اخْتَلَفُوا ﴾ (سورۂ آل عمران: ۱۰۵) یہ اختلافِ مذموم کا دنیا میں مرتب ہونے والا اثر ہے۔ اور آخرت میں اس پر کیا عذاب مرتب ہوگا اُس کو قرآن نے بیان کیا ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ، وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴾ (سورۂ بقرۃ: ۱۷۶) قرآن کریم نے اِس طرح کے اختلاف کو کہیں "بغی" سے تعبیر کیا ہے۔ کہیں "تفرقه" سے تعبیر کیا ہے، کہیں "فساد" سے تو کہیں "فتنه" سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اختلاف اِس نوعیت کا ہو کہ جس میں اختلاف کرنے والا محض اپنے فہم کی بنیاد پر ایسے نصوص میں اختلاف کرے، جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو، اب اگر وہ اپنے اجتہاد سے حق تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو ماجور ہے اور اگر حق تک رسائی نہیں کر پاتا تو وہ معفوعنہ ہے، ہاں! مگر اِس طرح کے اجتہاد میں کوئی تفریق سے کام لے تو بہر حال وہ مذموم ہے، کمافی القرآن: ﴿وما اختلفتم فيه من شيء فحكمه إلى الله﴾ الآیۃ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیشہ اپنی دعاؤں میں اختلافِ محمود کی دعا کیا کرتے تھے، مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں ہے "أللهم رب جبرئيل وميكائيل وإسرافيل! فاطر السمٰوات والأرض عالم الغيب والشهادة أنت تحكم بين عبادك فيما كانوا فيه يختلفون . إهدني لما أختلف فيه من الحق بإذنك إنك تهدى من تشاء إلىٰ صراط مستقيم"۔ انتہیٰ

## امورِ تکوینیہ اور مشیتِ شرعیہ کے مابین اختلاف:

انسانوں میں پایا جانے والا اختلاف دراصل یہ اللہ رب العزت کے امورِ تکوینیہ میں سے ہے، اس لیے کہ ارشادِ خداوندی ہے ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَايَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ، وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (سورۂ ہود: ۱۸/۱۹)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مشیتِ ایزدی ہی کچھ ایسی ہے کہ انسانوں میں اختلاف کو سُنَنِ کونیہ میں شمار کیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مشیتِ شرعیہ میں بھی اِس کی اجازت دی گئی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہر جگہ پر اختلاف کرتا بیٹھے، شریعت نے اس کے اصول وضوابط متعین کیے ہیں؛ لہٰذا جہاں پر شر کا اندیشہ ہو وہاں انسان کو اختلاف سے اجتناب کرنا چاہیے۔

## اختلاف رحمت ہے یا زحمت؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف امت کے لیے رحمت ہے یا زحمت وعذاب؟ تو اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک ہے: ''إختلاف أمتي رحمة'' الحدیث۔ البتہ اس حدیث کو بعض حضرات نے موضوع قرار دیا ہے۔

احادیثِ موضوعہ کے سب سے مستند اور ماہر امام، امام عراقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دراصل اِن الفاظ میں ہے: ''إختلاف أصحابي لأمتي رحمة'' الحدیث۔ امام عراقی نے ''مختصر المنهاج'' میں ان الفاظ کے ساتھ حدیث کو ذکر کیا، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ: ''أنه مرسل ضعيف'' کہ یہ حدیث، حدیثِ مرسل اور ضعیف ہے۔

البتہ سلفِ صالحین سے اِس سلسلے میں اقوال منقول ہیں مثلاً: عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ ''اگر اختلاف ناپسندیدہ چیز ہوتی تو اصحابِ رسول علیہ الصلاۃ والسلام کبھی اختلاف نہ کرتے، اور اگر صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اور ہر مسئلہ میں ایک ہی قول پر اجماع ہوتا، تو لوگ تنگی میں مبتلا ہو جاتے'' تو اس سے معلوم ہوا کہ اختلافِ محمود رحمت ہے۔

اِسی طرح امام یحیٰ بن سعید علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ''إختلاف أهل العلم توسعة'' کہ اہلِ علم کا اختلاف مسائل میں بلاغتِ توسّع ہے۔

امام ابن عابدین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ''ألإختلاف بين المجتهدين في الفروع من آثار الرحمة فإن إختلافهم توسعة للناس، فمهما كان الإختلاف أكثر كانت الرحمة أوفى'' یعنی مجتہدین کا فروع میں اختلاف یہ بہر حال رحمت ہے، اس لیے کہ اُن کے اِس اختلاف کی وجہ سے امت کو توسّع ملتا ہے، بل کہ ابنِ عابدین علیہ الرحمۃ نے یہاں تک کہا ہے کہ اختلاف جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی رحمت کا حصہ زیادہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف نہ مطلقاً رحمت ہے نہ مطلقاً زحمت، فروع میں شریعت کے دائرے میں رہ کر ہونے والا اختلاف بہر صورت رحمت ہے، اصولِ مجمع علیہ میں اختلاف اور اسی طرح فروع میں شریعت کے دائرے سے ہٹ کر اختلاف یہ بہر حال عذاب اور زحمت ہے۔

## علما نے اختلاف سے خروج کے لیے کیا تدبیریں اختیار کیں؟

احکام فقہیہ میں اگر چہ علما میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر بہت سارے اہلِ علم نے اختلاف کی وجہ سے پیدا ہونے والے انتشار کو روکنے کے لیے بہت سارے احکام میں یا تو اپنی رائے کو ترک کر دیا، یا علت کی بنیاد پر دوسرے فقہا کی رائے کو اختیار کر لیا، جس کی چند مثالیں یہ ہیں:

احنافؒ نے رجعت کے موقع پر اشہاد کو مستحب قرار دیا، جب کہ احناف کے اصول کے مطابق اشہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ محض اس لیے کہا کہ دیگر فقہا کے یہاں اشہاد ضروری ہے؛ تا کہ اختلاف سے بچا جا سکے۔

اسی طرح مالکیہ نے طوافِ قدوم کے لیے رکنیت کی نیت کا حکم دیا، جب کہ ان کے اپنے اصول کے مطابق رکن نہیں ہے، مگر دیگر فقہا کے یہاں رکن ہے، لہٰذا مالکیہ نے بھی رکنیت کی نیت کا حکم دیا۔

اِسی طرح شوافع کے نزدیک تین دن سے کم مسافت کی مقدار پر قصر کی گنجائش تھی، مگر دیگر فقہا کی رعایت میں انہوں نے عدم قصر کو مستحب قرار دیا۔

## اختلاف کے احکام:

جہاں پر علما نے اختلاف پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہیں پر اختلاف کی مختلف صورتوں کے احکام بھی بیان کیے ہیں۔

(۱) اصولِ دین میں اور خاص طور پر ایسے اصول میں جو دلائلِ قطعیہ سے ثابت ہوں، جیسے: اللہ کا وجود اور اُس کی وحدانیت، وجودِ ملائکہ، انبیا اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں کی تصدیق، تقدیر اور بعث بعد الموت پر ایمان۔ یہ ایسے اصولِ دین ہیں، جن میں اختلاف کی کہیں کوئی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا علما نے کہا کہ جو ان چیزوں کا اقرار کرے وہ مسلمان اور جو انکار کرے وہ کافر ہے، البتہ انکار، انکارِ صریح ہونا چاہیے۔

(۲) اصولِ دین کے ایسے مسائل جو ظنی الثبوت ہوں، مثلاً: آخرت میں اللہ کی رویت، وحدانیت کا اقرار کرنے والے کا جہنم سے نکلنا، قرآنِ کریم کے مخلوق نہ ہونے کو تسلیم کرنا وغیرہ۔ تو اس سلسلے میں فقہا کا اختلاف ہے، بعض فقہا ایسے لوگوں کی بھی تکفیر کے قائل ہیں، جس کی نسبت امام شافعیؒ کی طرف کی گئی ہے، جب کہ اکثر اہلِ علم ایسے لوگوں کی تکفیر کے قائل نہیں، بل کہ ضال، مضل اور مبتدع ہونے کے قائل ہیں۔

(۳) ضروریاتِ دین میں اختلاف کرنے والا جیسے: نماز کی فرضیت کا انکار کرنے والا، اسی طرح دیگر ارکانِ اسلام کا منکر، زنا کی حرمت کا انکار کرنے والا، قرآن وحدیث سے صراحۃً جن چیزوں کا ثبوت ہے ان کا انکار کرنے والا بھی کافر ہے۔

(۴) مسائلِ اجتہادیہ میں اختلاف: بہت سارے ایسے مسائل ہیں جن کے دلائل مخفی ہیں، لہٰذا صاحبِ اجتہاد اُن مخفی دلائل کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، اور ہر ایک کی سوچ وسمجھ الگ الگ ہوتی ہے، تو اختلاف کا ہونا امرِ واقعی ہے، اسی لیے فروعات میں اختلاف کرنے والوں کو علما نے معذور کہا ہے، کیوں کہ وہ مجبور ہیں، اس بات پر کہ بہ ظاہر پائے جانے والے تعارض کو کیسے دفع کریں، اور اس کے پاس اپنے مدمقابل کی دلیل سے زیادہ قوی اور مضبوط دلیل ہے، لہٰذا اس کے لیے اپنے مدِّ مقابل کی اتباع نہ شرعاً صحیح ہے اور نہ عقلاً صحیح ہے، اس طرح کے اختلافات کو علما نے جائز قرار دیا ہے۔

## اسبابِ اختلاف:

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر جب ایک ہی وحی ہے اور اصل مصدر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے، تو پھر اختلاف کیوں واقع ہوا؟ تو اس سلسلے میں علما نے مختلف اسباب ذکر کیے ہیں۔ اس کے اہم اور بنیادی اسباب تین ہیں۔

(۱) کسی حکم اور کسی مسئلے کا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں معیارِ تحقیق کا اختلاف۔

(۲) نصوص کی مراد کی تعیین میں اختلاف۔

(۳) نص سے ثابت شدہ حکم کے منسوخ ہونے کے سلسلے میں اختلاف۔

## فروعی اختلاف کی تاریخ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں امت میں نہ کوئی فروعی اختلاف تھا اور نہ کوئی اصولی اختلاف تھا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس تمام مسلمانوں کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، لہٰذا حضراتِ صحابۂ کرام کو جب بھی کوئی امر پیش آتا تو وہ لوگ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی روشنی میں اس کا جواب مرحمت فرماتے تھے۔

البتہ بعضے مرتبہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو کسی کام کی بجا آوری کا حکم دیتے، اور اس کے بعد ان کے لیے سفر کی وجہ سے یا کسی اور عذر کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مراجعت ممکن نہ ہوتی، تو پھر ان میں جو لوگ اجتہاد کی اہلیت رکھتے تھے، وہ اس امر کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں کوئی عارضی فیصلہ کر لیتے، اور اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے اس معاملہ کو پیش کر دیتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے صواب اور خطا ہونے کا فیصلہ فرما دیتے۔

ایسے معاملات میں کبھی کبھی حضراتِ صحابہ میں اختلاف ہوجایا کرتا تھا، جیسے: یوم الاحزاب کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا (اس وقت جب صحابہ کو مدینہ سے دیارِ بنوقریظہ کی طرف روانہ کیا)''لایصلین أحدالعصر إلا فی بنی قریظة''اب صحابہ مدینہ سے نکل پڑے، اتفاق سے راستے ہی میں نماز کا وقت ختم ہونے لگا،تو صحابہ میں اختلاف ہوگیا،بعض نے اجتہاد کرتے ہوئے کہا کہ: "لانصلی حتیٰ ناتیھا" اوربعض نے کہا:''نصلی لم یردمنا ذالک ''اس روایت کوامام بخاری علیہ الرحمہ نے ذکر کیا ہے ،لہٰذااس کی صحت میں کوئی کلام نہیں۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے ظاہری الفاظ پر عمل کیا،جس کو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عبارۃ النص پر عمل کیا،جب کہ دوسری جماعت نے اس کی مراد کواجتہاد کے ذریعہ سے الگ طور پر متعین کرنے کی کوشش کی،اوراُنہوں نے یہ سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل تیزی کے ساتھ وہاں پہنچنے کے لیے ایسافرمایا،وہ تیزی سے چلے مگر پھر بھی نہیں پہنچ سکے،توانہوں نے کہا:﴿ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ (سورۃ نساء:۱۰۳) کا تقاضا ہے کہ ہم عصر کا وقت ختم ہونے سے پہلے اسے راستے ہی میں ادا کرلیں۔

## نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد صحابہؓ کا اختلاف:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی تک صحابہ اپنے اختلافات کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جان لیتے تھے،مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرتِ آیات کے بعد حضراتِ صحابہ میں جو اختلاف ہوتا تھا اس اختلاف کو صحابہ اپنے اجتہاد کی روشنی میں حل کرتے تھے،مگر آدابِ اختلاف کی مکمل پاسداری کرتے تھے،اس لیے کہ حضراتِ صحابہ کی جماعت وہ جماعت ہے جسے علی الاطلاق خیرالقرون کہا گیا۔عصرِ حاضر میں بعض ایسے لوگوں نے جو حضراتِ صحابہ کے مقام سے ناواقف ہیں یا تجاہلِ عارفانہ کے طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ:''ھم رجال ونحن رجال'' لہٰذا جیسے ہم سے غلطیاں ہوسکتی ہیں ان سے بھی ہوسکتی ہیں،گویا حضراتِ صحابہ کے کسی بھی امتیازی وصف کے وہ منکر ہیں۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کا گروہ تاریخِ انسانی میں ایسا گروہ گزرا ہے کہ خیراور بھلائی میں نہ تو اُن سے پہلے کوئی نظیر گزری ہے اور نہ ہی ان کے بعد کوئی نظیر پیش کرسکتا ہے۔

## حضرات صحابہ کے درمیان اختلاف کی چند صورتیں:

(۱) سب سے پہلا اختلاف جو حضراتِ صحابہ کرام کے درمیان واقع ہوا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرتِ آیات کے سلسلے میں ہوا، حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو شدت غم کی وجہ سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے، جب کہ حضرت ابوبکرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قائل تھے۔ (۲) اختلافِ دفن (۳) اختلافِ خلافت (۴) مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ قتال کے سلسلے میں اختلاف۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جزیرۃُ العرب میں اِرتداد کی ہوا پھیل گئی۔ یہ مرتدین دو قسم کے تھے۔

(۱) جزوی طور پر اسلام کے فریضۂ زکوٰۃ کے منکرین۔ (۲) متبعینِ مدعیانِ نبوت۔

قسمِ اول سے قتال کے سلسلے میں حضراتِ صحابہ میں اختلاف ہوا۔ بعض قبائل قرآنِ کریم کی آیتِ کریمہ: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ﴾ (سورۃ توبہ:۱۰۳) سے استدلال کرتے ہوئے یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ زکوٰۃ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لے سکتے تھے، اس لیے کہ قرآن نے خذ من أموالهم کہا ہے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں رہے تو ابوبکرؓ زکوٰۃ وصول نہیں کر سکتے، گویا کہ انہوں نے اِس آیت کریمہ کی فاسد تاویل کی۔

بعض قبائل کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن ادائے زکوٰۃ کے لیے تیار نہ تھے، تو ایسے جزوی منکرین کے سلسلے میں حضرت عمرؓ اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت کا موقف یہ تھا کہ اُن کے ساتھ قتال نہ کیا جاوے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أمرت أن أقاتل الناس حتّى يقولوا لا إله الا الله فمن قالها فقد عصم مني ماله ونفسه إلا بحقها وحسابه على الله تعالىٰ. فقال أبوبكر رضي الله عنه: والله لأقاتلن من فرق بين الصلاة والزكاة فإن الزكاة حق المال. والله لومنعوني عناقا كانوا يؤدونها لرسول الله صلى الله عليه وسلم لقاتلتهم علىٰ منعها. قال عمر رضي الله عنه: فوالله ما هو إلا أن قد شرح الله صدرأبي بكر رضي الله عنه للقتال فعرفت أنه الحق.

## وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چند فقہی اختلاف:

جس طرح مذکورہ امور میں حضراتِ صحابہ میں اختلاف ہوا، اسی طرح بعض فقہی مسائل میں بھی اختلاف ہوا اور وہ یہ ہیں:

(۱) مرتد قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اس میں شیخین کا اختلاف تھا۔ اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ کا موقف یہ تھا کہ جو عورتیں مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ قتال کے بعد گرفتار ہوں، انہیں آزاد کر کے اُن کے اہل کی طرف لوٹا دیا جائے، جب کہ حضرت عمرؓ کا موقف تھا کہ ان کے ساتھ کفار کے قیدیوں جیسا معاملہ کیا جائے۔

(۲) جو مفتوحہ علاقے کی زمینیں تھیں ان کا کیا کیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ کا موقف یہ تھا کہ اُس زمین کو مجاہدین اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے، اور حضرت عمرؓ کا موقف یہ تھا کہ تقسیم نہ کرتے ہوئے مصلحتِ مؤمنین کے لیے وقف کر دیا جائے۔

حضراتِ صحابہ کے اِس اختلاف کے بعد ہم بآسانی یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ''إختلفت الآراء وما اختلفت القلوب''، یعنی ان کے رائے میں تو اختلاف ہوا، مگر ان کے دلوں میں کبھی نفرتیں پیدا نہیں ہوئیں۔

جس طرح حضراتِ شیخین کے درمیان اختلاف ہوا، اسی طرح حضرت عمر و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے درمیان بھی اختلاف ہوا، اور کئی صحابہ کے مابین اختلاف ہوا، مگر ان کے اختلافات نے کبھی انہیں تنافرِ قلوب تک نہیں پہنچایا، اور حظِّ نفس کو کبھی بھی ان کے اختلاف میں دخل نہیں رہا، سوائے تحریٔ حق کے اور کوئی مقصد اُن کا نہیں ہوتا تھا۔

حضراتِ صحابہ نے ''أدب الإختلاف '' کی بے نظیر مثالیں عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور انقطاعِ وحی کے بعد اپنے پیچھے چھوڑیں، اس لیے علما نے دورِ صحابہ میں پائے جانے والے اختلاف سے جو چند امتیازی آداب رونما ہوئے ہیں، اس کی نشاندہی کی ہے اور وہ یہ ہیں:

(۱) حضراتِ صحابہ حتی المقدور اختلاف سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۲) اور اگر کسی وجہ سے اختلاف ہو بھی جاتا، نصوص کے سمجھنے میں اختلاف کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے، تو وہ اپنے موقف پر اڑے نہیں رہتے تھے، اگر اُنہیں اپنی رائے کے خلاف کوئی حق بات سمجھ میں آجاتی تو اسے قبول کرنے میں اور اپنی رائے کے خطا پر ہونے میں ذرّہ برابر بھی تامل نہیں کرتے تھے۔

(۳) اگر ان کے درمیان اختلاف بھی ہوتا، تو وہ ادب و احترام کی مکمل پاسداری کرتے تھے، اور محض نفسانیت کی بنیاد پر کسی طرح کی حد تجاوزی سے پرہیز کرتے تھے۔

(۴) حضراتِ صحابہ اختلاف کے سلسلے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ: "ألرأى مشترک" کہ رائے میں اشتراک پایا جاتا ہے۔

(۵) حضرات صحابہ کے اختلاف کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اختلاف کے باوجود یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ ضروری نہیں کہ اُن کی اپنی رائے ہی صحیح ہے، بل کہ اِس بات کا امکان ان کے یہاں پر بدرجہ اتم تھا کہ ہوسکتا ہے کہ: "ألحق فيما ذهب إليه أخوه" کہ وہ حق ہو جس کی طرف اُن کا دوسرا مسلمان بھائی رُجحان رکھتا ہے، گویا اپنی رائے پر اِصرار نہیں تھا۔

(۶) اخوتِ اسلامی ہر طرح کے اختلاف کے باوجود اُن کے یہاں ہمیشہ مقدم ہوا کرتی تھی۔ آپسی آرا میں اختلاف ہو یا نہ ہو، مگر اسلام نے جو ایک دوسرے کے حقوق بیان کیے ہیں، وہ اس کی مکمل پاسداری کرتے تھے۔

(۷) حضراتِ صحابہ کے درمیان اصولِ عقائد میں کسی طرح کا کوئی اختلاف نہیں تھا، جو بھی اختلاف ہوا وہ مسائلِ فروع میں ہوا۔

(۸) سیدنا حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت تک کِبار اور مجتہد صحابہ کو مدینہ کے اندر ہی رہنے کا حکم تھا، اُن میں سے ایک مختصر سی تعداد مکہ میں تھی، سوائے جہاد کے اور کسی غرض سے یہ مدینہ سے جدا نہیں ہوتے تھے، اور جہاں جہاد سے فارغ ہوتے مدینہ لوٹ جاتے تھے، لہٰذا حضرت عمرؓ کے دور تک اکثر و بیشتر مسائل میں حضراتِ صحابہ کا اختلاف کے بعد کسی ایک موقف پر اجماع ہو چکا تھا۔

(۹) حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں امتیازی صحابہ دو قسم کے تھے: (۱) قرا (۲) فقہا۔ قرا کی تعداد فقہا کے مقابلہ میں زیادہ تھی؛ البتہ حضراتِ صحابہ کے زمانہ کے قرا صرف خوش الحان ہی نہیں ہوتے تھے، بل کہ قرآن فہمی میں بھی مشہور تھے، ہاں وہ صحابہ جو فقاہت میں مشہور تھے ان کے مقابلہ میں اُن کا مقام اور مرتبہ کچھ کم تھا۔ ویسے تو اسلامی سیاست، ریاست اور حکومت میں قرا فقہا پر مقدم ہوا کرتے تھے، اور فقہا اُن کے معاون ہوتے تھے۔ خود جنابِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں معیارِ امامت "أقرأهم لكتاب الله" تھا۔ جیسا کہ فتح مکہ کے بعد عام الوفود کے زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ حضراتِ صحابہ میں جو فقہا تھے ان کے طریقۂ استنباط میں اختلافات پائے جاتے تھے، البتہ ان کا یہ اختلاف اُنہیں آپسی مناظرہ بازی اور حسد و کینہ پر آمادہ نہیں کرتا تھا، بل کہ اختلافِ آرا کے باوجود انہوں نے ہمیشہ امت میں اتفاق کو برقرار رکھنے کی بھرپور سعی و کوشش کی۔ یہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتہائی امتیازی وصف رہا۔

حضراتِ صحابہؓ میں مجتہدین کی تعداد امام ابن القیمؒ کے بیان کے مطابق ۲۰/ سے لے کر ۵۰/ کے درمیان رہی۔

(۱۰) حضراتِ صحابۂ کرامؓ کے درمیان جو اختلاف ہوتے تھے اس میں گویا اختلاف کرنے والے صحابی، دوسرے صحابی پر تدارک واستدراک کرتے تھے، اور اختلاف اس وجہ سے کرتے تھے، تاکہ اپنے بھائی سے اختلاف میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی کو پُر کرنے میں مددگار ثابت ہوں، عیب جوئی اور تنقید کی نیت سے کبھی صحابہ نے اختلاف نہیں کیا۔

## دورِ تابعین اور آدابِ اختلاف:

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ سیدنا حضرت عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں مہاجرین اور انصار کو خارجِ مدینہ قیام کی اجازت نہیں تھی، ہاں وہ جہاد کی غرض سے یا تعلیم کی غرض سے یا امارت وقضا کی غرض سے، غرض یہ کہ کسی بھی دینی مقصد سے مدینہ سے باہر سفر کرسکتے تھے، مگر مستقل قیام کی کہیں بھی اجازت نہیں تھی، اپنا کام پورا کرکے ان کے لیے مدینہ لوٹنا ضروری ہوتا تھا۔

حضرت عمرؓ نے حضراتِ صحابہ کو خارجِ مدینہ قیام سے جو روکا اس میں بہت سی حکمتیں تھیں، جن میں سے دو اساسی حکمتیں یہ ہیں:

(۱) حضرت عمرؓ کے دور سے قبل دورِ ابوبکرؓ میں فتنۂ ارتداد کی سرکوبی کی وجہ سے دین کی صحیح تدوین اور فقہ کا موقع نہیں ملا، اور حضرت عمرؓ چوں کہ دوراندیش تھے، تو آپؓ کا منشا یہ تھا کہ دینِ اسلام مکمل طور پر مدون اور مرتب ہوجانا چاہیے، اور اس کے لیے انہیں حضراتِ صحابہ کے تعاون کی مکمل ضرورت تھی، اس لیے کہ صحابہ کی ہی وہ جماعت تھی جس نے دین کو براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا، اس کی عملی صورتیں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کبارِ صحابہ کے طریقۂ اجتہاد کو بھی دیکھا تھا، لہٰذا مہاجرین اور انصار کا تدوین کے دور میں آپؓ کے قریب رہنا ضروری تھا، تاکہ اس عظیم عمل میں آپؓ کے معاون بن سکیں۔ اور امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کے لیے قیامت تک دین کے ہر شعبے میں صحیح رہنمائی ہوسکے۔

(۲) دوسری حکمت یہ تھی کہ مہاجرین اور انصار کو صحابہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کا بے پناہ اعزاز واکرام کرتے تھے، اور بہرحال وہ بشر تھے، تو حضرت عمرؓ کو یہ خدشہ ہوا کہ کہیں اسلام دشمن عناصر ان کی سادگی اور بھولے پن کا فائدہ اٹھا کر، انہیں استعمال کرکے امت کو اختلاف اور انتشار سے دوچار نہ کردے، اس لیے آپؓ نے خارجِ مدینہ ان کے قیام پر سختی سے روک لگائی، فللہ در عمرؓ۔

سیدنا حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور میں صحابہ مختلف بلدان اور امصار میں پھیل گئے، سب سے بڑی تعداد بصرہ اور کوفہ میں قیام پذیر ہوئی، مؤرخین کے قول کے مطابق انصار ومہاجرین میں سے تین سو صحابہ بصرہ میں قیام پذیر ہوئے، ایک تاریخی روایت کے مطابق جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معرکۂ حنین سے فارغ ہو کر واپس ہوئے تو تقریباً بارہ ہزار صحابہ مدینہ میں موجود تھے اور جب آپ کا انتقال ہوا تو دس ہزار صحابہ مدینہ میں موجود تھے، اور دو ہزار مختلف شہروں میں منتقل کیے جا چکے تھے۔

حضرت سعید بن مسیّبؒ کو روایۃُ عمر و حامل فقہِ عمر فی المدینہ کہا جاتا تھا، حضرت عطا بن ابی رباح کو حاملِ فقہ ابن عباس کہا جاتا تھا مکہ مکرمہ میں حضرت طاؤس کو "حاملِ فقہ اسامہ" کہا جاتا تھا، یمن میں یحیٰ بن کثیر کو حاملِ فقہ الصحابہ کہا جاتا تھا، اسی طرح حسنِ بصری کو بصرہ میں، حضرت مکحول کو شام میں، علقمہ کو کوفہ میں۔

مذکورہ بالا فقہا کا جو ذکر ہوا، وہ بطورِ نمونہ کے چند ہیں، ورنہ عالمِ اسلام کے ہر شہر کا یہی حال تھا کہ تابعین میں سے جو اصحابِ اجتہاد تھے، لوگ اُنہیں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، اور حضراتِ تابعین کے اجتہاد کا طریقہ بھی ہو بہو صحابہ کرام کے نہج پر تھا۔ جن آداب کا لحاظ حضراتِ صحابہ کے یہاں پایا جاتا تھا، وہ تمام کے تمام تابعین کے یہاں پر بھی ملحوظ تھے۔

حضراتِ تابعین کے دور کے بعد سے امت میں جو بھی فقہی آرا قائم ہوئیں، وہ انہیں صحابہ وتابعین کی استنباط کی ہوئی آرا تھیں، مگر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بہت ساری اختلافی آرا معدودے چند مذاہب میں سمٹ کر رہ گئیں، عام طور پر حضراتِ تبع تابعین کے دور کے بعد سے جن فقہی مسالک کو امت میں مقبولیت حاصل ہوئی، اہل سنت والجماعت کے طریقہ پر وہ کل چھ ہیں۔ جن کا دور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے تیسری صدی ہجری کے اختتام تک کا ہے، وہ چھ فقہا یہ ہیں۔

(۱) امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (۲) امام مالک بن انس (۳) امام محمد بن ادریس شافعی (۴) امام احمد بن حنبل (۵) امام ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی (۶) امام جریر طبری رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

بعض حضرات نے امام حسنِ بصری، امام سفیان بن سعید ثوری، امام لیث بن سعد اور امام سفیان بن عیینہ کے سلسلے میں بھی مستقل ان کے مذاہب ہونے کی رائے قائم کی ہے۔

اِن کے علاوہ امام داؤد بن علی بغدادی، جن کی فقہ کو فقہِ ظاہری کہا گیا، اسی طرح امام اسحٰق بن راہویہ ، امام ابوثور ابراہیم بن خالد کلبی، اِن لوگوں کے بھی مستقل فقہی مذاہب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ البتہ قرنِ رابع کے بعد امت میں صرف چار مسلک باقی رہ سکے، اور دیگر مسالک اس مسلک کے قریب کسی فقہ میں ضم ہو گئے یا ان کے تلامذہ نے اسے اچھی طرح مدون نہیں کیا، جس کی وجہ سے وہ بعد میں نہیں چل سکے، یہ اللہ رب العزت کی کسی مصلحت اور حکمت کے تحت چار کے علاوہ اور کسی کو مقبولیت نہیں مل سکی۔

فقہ اوزاعی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فقہِ حنفی میں ضم ہو گیا، اسی طرح فقہِ طبری فقہِ شافعی میں، فقہِ ظاہری فقہِ حنبلی میں، اور فقہِ حسن بصری فقہِ حنفی میں ضم ہو گیا۔

## سیاسی اختلاف کے آثار فقہی اختلاف پر:

اللہ رب العزت نے اِس دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے، لہٰذا ہر زمانے میں انسان مختلف نوعیت سے آزمائش میں مبتلا کیا گیا، امتِ محمدیہ بھی آزمائش کے مختلف اَدوار سے گزری۔ امت کی آزمائش تو دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے چل رہی تھی، البتہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے امت اندرونی اختلاف کا شکار ہوئی۔ اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے آپسی اختلاف سے دور رکھنے کے لیے دارالخلافہ کے طور پر ترک کر دیا اور کوفہ منتقل ہو گئے۔

کوفہ کا انتخاب اس لیے آپؓ نے کیا کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد اگر کسی شہر کو علمی تفوق حاصل تھا، تو وہ کوفہ کو حاصل تھا۔

دوسری طرف حضرت امیر معاویہؓ نے ملکِ شام کو اپنا دارالخلافہ تجویز کیا، اور امت میں یہیں سے سیاسی اختلاف کا آغاز ہوا، اسی مقتلِ عثمانؓ کے بعد سے وضعِ حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ مدینہ سے جب حدیث نکلتی تھی تو ایک بالشت کی ہوتی تھی، اور عراق تک پہنچ کر ایک ذراع کی ہو جاتی تھی۔ اسی لیے فقہائے عراق نے احادیث کے قبول ورد میں دیگر فقہا کے مقابلہ میں کڑی اور مضبوط شرطیں لگائیں، تاکہ وضعِ حدیث کی وجہ سے کہیں کوئی باطل رائے فقہ میں شامل نہ ہونے پائے۔

یہ سیاسی اختلاف امت کے فقہی اختلاف پر بھی اثر انداز ہوا۔ اور اہلِ حجاز و اہل عراق جہاں دو سیاسی مکتبِ فکر ہوئے وہیں دو فقہی مکتبِ فکر بھی ہوئے۔

خاص طور پر خلافتِ بنوامیہ کے سقوط کے بعد سیاسی اختلاف کا اثر فقہی اختلاف پر زیادہ ہوا۔ خلافت عباسیہ چوں کہ عراق میں وجود پذیر ہوئی، لہٰذا خلفائے عباسیین کا میلان ہمیشہ فقہِ عراق یعنی فقہِ حنفی کی طرف رہا، اور خلافتِ عباسیہ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ بھی زیادہ طویل رہا۔ خلفائے عباسیین فقہائے عراق یعنی فقہی علما کو ہر جگہ قاضی مقرر کرتے رہے، ایسے علاقوں میں جہاں پر دیگر فقہی مسالک کو رواج حاصل تھا، جس کی وجہ سے فقہائے احناف اور دیگر فقہ کے علما کے درمیان مناظرات کی نوبت پہنچ جاتی۔

البتہ آدابِ اختلاف کی رعایت عام طور پر اُن کے یہاں پر پائی جاتی تھی، بہت کم ایسا ہوا کہ آداب اختلاف کو پامال کیا گیا۔ اگر چودہ سو سال کے عرصہ میں دو چار واقعات ایسے ہوئے ہوں، تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ بابِ اجتہاد کو قرنِ رابع کے بعد مطلق طور پر بند کر دیا گیا۔ ہاں جن لوگوں میں اہلیتِ اجتہاد ہے ان کے لیے مسائلِ جدیدہ اور مختلف فیہ ایسے مسائل جن میں اجتہاد کی گنجائش ہو، امت کی عصری ضرورت کے پیشِ نظر اجتہاد کی اجازت ہے۔

## اختلافِ تنوع کے ثمرات:

جیسا کہ اِس سے پہلے اختلاف کے سلسلے میں تفصیل کے ساتھ ضروری امور پر روشنی ڈالی گئی، جس میں اس بات کا تذکرہ تھا کہ بنیادی طور پر اختلاف کی دو قسمیں ہیں: (۱) اختلاف تنوع (۲) اختلاف تضاد و تنازع۔

شریعتِ مطہرہ نے جس اختلاف کو رحمت قرار دیا، اس اختلاف سے اختلافِ تنوع مقصود ہے۔ اختلافِ تنوع درحقیقت انسان کی فکری اور عقلی صلاحیت کو ابھارنے کے لیے اللہ رب العزت نے سنتِ ربانی کے ذریعہ جاری کیا اور اختلافِ تنوع کے اثرات تاریخ میں ہمیشہ انتہائی معنی خیز اور ثمر آور رہے ہیں، اللہ رب العزت نے صرف اختلافِ تنوع کی سنت کو اشرف الخلائق انسانوں میں ہی جاری نہیں کیا، بل کہ اپنی دیگر مخلوق میں بھی اسے جاری کیا، جیسے رات اور دن کا آنا جانا، موسموں میں تبدیلی کا واقع ہونا، اللہ کی مخلوق کا مختلف اشکال میں پایا جانا یہ سب اختلافِ تنوع ہے۔

مگر انسان کے لیے اللہ رب العزت نے اختلافِ تنوع کو بر سبیلِ نعمت ذکر کیا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ﴾ (سورۃ الروم: ۲۲)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اختلافِ تنوع اللہ رب العزت کی طرف سے انسان پر بے بہا نعمت ہے ، اسی لیے بعض مفکرین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اختلافِ تنوع یہ ضرورتِ بشری ہے، اس لیے کہ اللہ رب العزت نے انسانوں کو مختلفُ الطبائع پیدا کیا، انسانوں کی اپنی بولیاں علیحدہ علیحدہ ہیں، انسانوں کی فطری میلانات مختلف ہیں، مثلاً: کسی کی طبیعت میں سختی، کسی کی طبیعت میں نرمی۔ انسان کے غور وخوض کے طریقے علیحدہ علیحدہ، کوئی کسی چیز کو دیکھ کر کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے، تو کسی کی طبیعت گہرائی کے ساتھ غور وفکر کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کرنے کی عادی ہے، کسی کی طبیعت ہمیشہ خیر کے بارے میں فکر مند رہتی ہے، تو کوئی آدمی شر کے بارے میں اِس لیے باخبر رہتا ہے کہ کہیں وہ شر میں مبتلا نہ ہو جائے ، کسی کی طبیعت طوالت پسند تو کسی کی طبیعت اختصار پسند؛ انسان کی طبیعت میں یہ وصفی اختلافِ تنوع اس کے اخذ واجتہاد اور کسی چیز پر حکم لگانے پر اثر انداز ہوتا ہے، جیسا کہ سیاسی فقہی میدان میں مختلف آرا سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

حضراتِ انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام اور حضراتِ صحابہ میں بھی بشری تقاضے کی وجہ سے یہ اختلافات پائے جاتے تھے ، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام صفتِ جلال سے متصف تھے، ابراہیم علیہ السلام صفتِ حِلم سے متصف تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام صفت رِفق وجمال سے متصف تھے۔ خود حضراتِ صحابہ میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نرم طبیعت کے مالک تھے، اور حضرت عمرؓ سخت طبیعت کے مالک تھے، کبارِ صحابہ کے ساتھ ساتھ صغار صحابہ میں بھی یہ چیز پائی جاتی تھی، مثلاً: عبداللہ بن عمرؓ یہ چھوٹے بچوں کو بالکل اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے، کہ کہیں اُن بچوں کے ساتھ لگی ہوئی نجاست میں وہ مبتلا نہ ہو جائیں، جب کہ دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بچوں کے ساتھ خوش ہو کر کھیلا کرتے تھے، اُن کی طبیعتوں کے آثار ان کے اجتہادی مسائل پر بھی ہوئے ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ باطنِ عَینین کے غسل کے قائل تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کے قائل نہیں تھے، حضرت ابن عمرؓ مَسِّ مرأۃ پر نقضِ وضو کے قائل تھے۔

## اختلافِ تنوع کے مقاصد:

شریعتِ مطہرہ نے اختلافِ تنوع کو چند مقاصد کے پیشِ نظر صرف جائز ہی نہیں ، بل کہ محمود و مستحسن قرار دیا۔ وہ مقاصد یہ ہیں:

(۱) مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا تحقق۔

(۲) اختلافِ تنوع کے ذریعہ انسان کی آزمائش و ابتلا مقصود ہے، اس لیے کہ بعض مرتبہ اختلاف کی صورت میں انسان کو اپنی رائے کے خلاف فیصلہ کرنا پڑتا ہے، مگر اتباعِ شریعت کے پیشِ نظر وہ اُس کے لیے تیار ہوجاتا ہے، کبھی اپنی رائے کو چھوڑ کر دوسروں کی رائے کو اختیار کرنا پڑتا ہے، اس صورت میں وہ کامیاب ہوتا ہے اور بہ صورتِ دیگر ناکام۔

(۳) شریعت نے اختلافِ تنوع کو اس لیے مشروع کیا تاکہ امت میں ایک طبقے کا مزاج غور وخوض کا بنے، اور امت اندھی تقلید کا شکار نہ بنے۔

(۴) اختلافِ تنوع کی گنجائش اس لیے بھی باقی رکھی گئی کہ جب شریعت کے دائرے میں رہ کر اختلاف کیا جائے گا تو محبت والفت پیدا ہوگی، اس لیے کہ اگر اخلاص ہوگا تو آدمی اپنے مخالف کے ساتھ بھی محبت کا سلوک کرے گا۔

(۵) اختلافِ تنوع کا پانچواں مقصد یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ کے جو مقاصد ہیں وہ خوب اچھی طرح سے ہر شعبۂ زندگی میں شامل ہوسکیں۔

## آدابِ اختلاف:

(۱) **الإخلاص لله والتجرد من الأهواء:** عام طور پر انسان فطری اعتبار سے اختلاف کے موقع پر حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، لہٰذا اختلاف کے موقع پر سب سے پہلے انسان کا عقلی اعتبار سے بیدار ہونا ضروری ہے، اسی لیے شریعتِ مطہرہ نے اختلاف کی گنجائش دلائل کی روشنی میں رکھی ہے، لہٰذا سب سے پہلے اختلاف کرنے والے کا صاحبِ علم اور اخلاقِ حَسنہ کا مالک ہونا ضروری ہے، اور اس کے بعد اس کے لیے آدابِ اختلاف اور اختلاف کے اخلاقیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔

علما نے کتاب وسنت کی روشنی میں سب سے پہلا جو ادب بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اختلاف کرنے والوں کو اپنی نیتوں کا اِستحضار ضروری ہے؛ کیوں کہ اکثر وبیشتر جب افراد اور جماعتوں میں اختلاف ہوتا ہے تو بہ ظاہر اُسے علمی یا فکری اختلاف کا عنوان دیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں یا تو انتقام مقصود ہوتا ہے یا اپنی عزت میں اضافہ مطلوب ہوتا ہے، جب نیت کا استحضار نہیں ہوتا، اور جب نفس کا غلبہ ہوتا ہے تو انسان خواہشاتِ نفسانیہ کی پیروی کا شکار ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے اُسے اپنے مدِّ مقابل کے دلائل قوی اور مضبوط ہونے کے باوجود سمجھ

میں نہیں آتے ،اور اِس طرح وہ راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے؛اسی لیے کتابُ اللہ اورسنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں علما نے اختلاف کی اولین شرط اخلاص کوقرار دیا ہے ؛اِس لیے کہ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اپنے خالق اور مالک کی رضا مندی ہے،نہ کہ مخلوق کی تعریف وحمد وثنا۔اسی طرح مومن کی زندگی کی غایت آخرت کی نیک بختی کوحاصل کرنا ہے نہ کہ دنیا کے عارضی نفع ونقصان کا طلب گار رہنا،اسی لیے مومن اللہ کے خاطر دنیا میں ہر چیز کی قربانی کے لیے تیار رہتا ہے ارشاد ربانی ہے:﴿ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ﴾ (سورۂ نحل:۹۶) گویا اِس آیتِ کریمہ نے اختلاف کا بنیادی سبق یہ دیا کہ مومن کی زندگی کا مقصد نہ دنیا ہے اور نہ دنیا کی عارضی جاہ وجلال اورشہرت ،اور نہ ہی اپنی کوئی ذاتی مصلحت اور نہ ہی عصبیت ، چاہے وہ ظاہری ہو چاہے وہ مخفی ہو،اسی لیے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشادفرمایا:''ألأیسرُ من الریاء شرک'' کہ ریا کا ادنیٰ درجہ بھی شرک ہے۔کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:''تعس عبدالدینار،تعس عبدالدرھم،تعس عبدالخمیصة إن أعطی رضی وإن لم یعط سخط ''الحدیث۔

اِس حدیث میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پرلعنت بھیجی اور ہلاکت کی بددعادی ،جودنیاپرست اورہواپرست ہو،بعض سلفِ صالحین نے اتباعِ ہویٰ کوبھی شرک قراردیا۔سلفِ صالحین میں سے کسی سے منقول ہے:''شرإلٰہ عبد فی الأرض الھویٰ وذالک لأنه یضل الإنسان عن الحق رغم علمه به '' کہ زمین میں سے بدترین معبود ہویٰ پرستی ہے،اس لیے کہ ہویٰ پرستی انسان کوعلم ومعرفت کے باوجودگمراہی پرڈال دیتی ہے،قرآن کریم نے اِس کی منظرکشی بڑے عجیب انداز میں کی ہے:﴿أفرأیت من اتخذ الٰھه ھواہ ﴾(۴۵:الجاثیة)۔

(۲)الخشیة: عالم کی سب سے امتیازی صفت جو اسے غیر عالم سے ممتاز کرتی ہے،وہ ہے خشیت ؛یعنی اللہ کا خوف،اسی لیے اللہ رب العزت نے تاکیدرتاکیدوحصر کے ساتھ کہا:﴿اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا ﴾(سورۂ فاطر:۲۸)

جب اختلاف کرنے والے کے دل میں خشیتِ الٰہی کارفرما ہوتی ہے،تووہ جس سے اختلاف کرتا ہے ،دائرۂ اختلاف میں رہ کر بحث کرتا ہے ،اورجب اُس کے دل میں خشیتِ الٰہی نہیں ہوتی،تووہ صرف دائرۂ اختلاف ہی سے تجاوزنہیں کرتا،بل کہ عداوت ودشمنی ،اورذاتیات ونفسانیت پراترآتا ہے،اس لیے عالم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کوصفتِ خشیت سے متصف کرے۔

مگر عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اختلاف کے موقع پر آدمی صفتِ خشیت سے عاری ہوجاتا ہے، اور جب آدمی صفتِ خشیت سے متصف ہوتا ہے تو اپنے مخالف کا ادب واحترام بھی ملحوظ رکھتا ہے بہ صورتِ دیگر یہ بات ملحوظ نہیں ہوتی۔

(۳)الإنصاف: آدابِ اختلاف کا ایک اہم ترین ادب یہ ہے کہ اختلاف کرنے والا صفِ انصاف سے متصف ہو، قرآنِ کریم نے امتِ محمدیہ سے خاص طور پر اِس چیز کا مطالبہ کیا ہے، بل کہ ان کے امتیازی اوصاف میں شمار کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ (سورۃ نساء:۱۳۵)

اس لیے علما نے لکھا ہے کہ اختلاف کی صورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی غصہ میں آپے سے باہر ہوجائے اور حق کو تسلیم کرنے سے احتراز برتے، اور ایسا بھی نہ ہو کہ کسی باطل چیز کی طرف رغبت اسے حق کو قبول کرنے سے مانع بنے، کسی چیز کی طرف اُس کی رغبت ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں وہ منصِف مزاج ہونا چاہیے، خصومت اور نزاع اسے عدل وانصاف سے روکنے والے نہ ہوں۔

(۴)التحرز من التعصب: مسلمانوں میں پایا جانے والا اختلاف عام طور پر اختلافِ تنوع ہے، جسے جزئیات کا اختلاف بھی کہا جاسکتا ہے، خاص طور پر فقہی اختلاف کے موقع پر یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ فقہا کا اختلاف حلّت وحرمت کا نہیں ہے، بل کہ ترجیح اور عدمِ ترجیح کا اختلاف ہے، لہٰذا تعصب اور عصبیت سے اجتناب اور پرہیز از حد ضروری ہے، وہ مسائل جن کی تصحیح اور ترجیح میں علمائے متقدمین ومتاخرین کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ دلائل وبراہین کی روشنی میں جو کارنامہ انجام دے چکے، اُسی پر اعتماد اور اُسی کا اعتبار کیا جائے گا۔ ہاں! البتہ عبادات کو چھوڑ کر معاملات کے مسائل میں اگر عرف وعادت کی وجہ سے صورتِ مسئلہ کے تبدیل کرنے کی ضرورت ہو تو پھر ایسے افراد جو اپنے اندر اجتہاد، استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں، وہ دلائل کی روشنی میں تغیرِ حکم کے مجاز ہوسکتے ہیں، مگر ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو اِس کی گنجائش نہیں ہے، مثلاً پچھلی صدی میں حکیم الامت مجددِ ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے افراد اور عصرِ حاضر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی جیسے افراد۔

(۵)أن یکون مقصود المخالفة براء ة الذمة بالبیان للأمة: آدابِ اختلاف میں سے ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ اختلاف کی غرض اور مقصد محض امت کے سامنے حق کی ترجمانی کرتے ہوئے اہل اجتہاد پر برأتِ ذمہ کا جو حق ہے اُسے ادا کرنا۔یعنی مخالفت صرف اس لیے کرے کہ اسے دلائل اور براہین کی روشنی میں ایسا ظن اور گمان ہو رہا ہو کہ امت کے سامنے جو بات بیان کی جارہی ہے وہ درست نہیں ہے،لہٰذا اختلاف کرنے والا مصادرِ شریعت پر غور وخوض کر کے حق کو معلوم کرے،اور پھر اپنے اس معلوم حق کو امت کے سامنے دلائل کے ساتھ پیش کردے،اس لیے کہ قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:﴿ فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْن﴾(سورۂ نحل:۴۳)اسی طرح﴿وَاِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِالْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ، وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾(سورۂ نساء:۸۳)

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اہل استنباط پر برأتِ ذمہ لازم ہے۔

(۶)أن یحرص علی الإنتفاع من المخالف: اپنے مخالف سے انتفاع کی حرص رکھنے والا ہو، یعنی جب اس کی نیت اظہارِ حق ہوگی،تو وہ اپنے مخاصم اور مدِّ مقابل سے بھی علمی فائدہ اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا،اس لیے کہ راہِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ کبر ہے،لہٰذا وہ مخالفت کرتے وقت بھی اپنے مدِ مقابل کے کلام کو غور سے پڑھے اور سنے،اِس غرض سے کہ ہوسکتا ہے کہ اسی کے کلام سے کوئی حق اور صحیح بات معلوم ہوجائے۔

اسی لیے امام شافعی علیہ الرحمۃ نے فرمایا:" واللہ ما أبالي أن یظهر الحق علی لساني أو علی لسان خصمي" انتہی۔کہ قسم بخدا مجھے اس چیز کی بالکل پرواہ نہیں کہ حق میری زبان سے صادر ہو یا میرے مدّ مقابل کی زبان سے،ارشادِ ربانی ہے:﴿ فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾ (سورۂ زمر:۱۷،۱۸) کہ بشارت دے دو! میرے ان بندوں کو جو کسی بھی بات کو غور سے سنتے ہیں،اور اس میں جو بہتر ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں۔

(۷)أن یحقق المسائل: آدابِ اختلاف میں سے یہ بھی ایک اہم ترین ادب ہے کہ وہ جس مسئلہ میں مدِّ مقابل سے اختلاف کرے،اصل مصادر اور مراجع سے خوب اچھی طرح اس کی تحقیق کرلیا کرے ،اِسی لیے علما نے لکھا ہے کہ جب کسی چیز پر حکم لگایا جائے،اور خاص طور پر ایسی چیز اور ایسے صورتِ مسئلہ پر،جس میں اختلاف پایا جاتا ہو،تو اس کی تحقیق کے لیے چھ مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔

۱.....**تخریج المناط**: یعنی جس صورتِ مسئلہ کو بیان کیا جارہا ہو، اس کے لیے علت کیا ہوسکتی ہے ؟ اِس لیے کہ احکام کا مدار علتوں پر ہوا کرتا ہے۔

۲.....**تنقیح المناط**: تنقیحِ مناط کہا جاتا ہے کسی جدید صورتِ مسئلہ پر جو حکم لگایا جائے، اس کے لیے شریعت کے کسی اصول اور قانون کا سہارا لیا جائے۔

۳.....**التحقق و التثبت**: کہ جس صورتِ مسئلہ پر حکم عائد کیا جارہا ہے، اس کے تمام پہلوؤں کا بہ غور جائزہ لے لیا جائے، صرف سرسری طور پر یا محض کسی سے سن لینے پر حکم نہ لگایا جائے۔

۴.....**التحقق من قیام الحجة**: یعنی جب کسی چیز پر حکم عائد کیا جائے، تو اِس طور پر کہ دلائل کے ساتھ ساتھ تمام شرائط اور موانع کی تطبیق بھی اُس پر کردی جائے۔

۵.....مذکورہ تمام مراحل کے بعد جب کسی چیز پر حکم لگائے تو اس حکم کو بالکل واضح انداز میں لگائے۔

۶.....کسی چیز پر حکم لگاتے وقت مصالح اور مفاسد پر نظر رکھی جائے، اور زمان و مکان اور افراد کے بارے میں بھی نتائج کے اعتبار سے اچھی طرح غور وخوض کیا جائے۔

۸.....**التثبت و التبیُّن**: اختلاف کے اہم ترین آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مدِّ مقابل کی جانب سے جس رائے کا علم ہو اُس کے سلسلے میں مخالفت میں جلد بازی سے کام نہ لے، بل کہ باوثوق اور معتبر ذرائع سے اچھی طرح یہ معلوم کرلے کہ واقعۃً مدّ مقابل کی یہی رائے ہے، اس کے بعد اگر اختلاف کی گنجائش ہو تو اختلاف کرے۔

۹.....آدابِ اختلاف میں سے ایک اہم ترین ادب یہ بھی ہے کہ کسی پر فسق یا کفر کا حکم لگانے میں یا نفاق کا حکم لگانے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔ عام طور پر لوگ اس ادب کا لحاظ نہیں کرتے اس طور پر جب کسی معین شخص کو باطل فکر اور نظریہ رکھنے والے کے ساتھ دیکھتے ہیں، تو اس پر بھی اسی باطل نظریہ کے حامل ہونے کا حکم لگادیتے ہیں، جب کہ وہ شخص اس سے بَری ہوتا ہے۔

۱۰..... **أن یحمل کلام المخالف علٰی أحسنه**: فقہ الخلاف کے آداب اور قواعد میں سے یہ بھی ہے کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرے کہ اپنے مخالف کے کلام کو صحت پر محمول کرے اگر تاویل کی گنجائش ہو، اس لیے کہ جو آدمی اپنی کوئی رائے بیان کرتا ہے، تو وہ اس کا مالک ہوتا ہے، اور وہی اس بات کا زیادہ حق دار ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کی تفسیر کرے، خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ رائے ایسی ہو جس میں مختلف توجیہات کی گنجائش ہو، تو ایسے موقع پر اختلاف کرنے والے کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے طور پر کسی ایک توجیہ کو مراد لے کر

کوئی حکم اخذ کر لے؛ بل کہ اگر وہ بہ قیدِ حیات ہے تو براہِ راست اس سے معلوم کرے کہ اس کے کلام کی کیا مراد ہے؟ اور اگر وہ فوت ہو چکا ہو اور اس کی بہت ساری تصنیفات وتالیفات ہوں تو اُن سب کا مطالعہ کر کے اس کی مراد جاننے کی کوشش کرے، اور جب ثابت ہو کہ اس کی مراد درست نہیں ہے تو مخالفت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۱۱......آدابِ اختلاف میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ اپنے مدّ مقابل پر فسق اور فجور کا حکم نہ لگائے، جب تک کہ فسق وفجور کے حکم لگانے کے تمام اصول وضوابط اس پر منطبق نہ ہوں۔

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**أربع من كن فيه كان منافقا خالصا، ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق،حتى يدعها.إذاؤتمن خان وإذا حدث كذب، وإذاعاهد غدر وإذا خاصم فجر**"(بخاری)

۱۲......آدابِ اختلاف میں ایک اہم ادب یہ ہے کہ اگر اختلاف کرنے والے پر اپنی خطا ظاہر ہو جائے تو وہ اپنی خطا کو قبول کر کے بلا تامّل حق کا اعتراف کر لے۔

اسی طرح اگر مدِّ مقابل اپنی خطا کا اعتراف کر لے تو اس کے اُس اعتراف اور معذرت کو بھی قبول کر لے، اور اس کے اعتراف کے بعد اُس کا ہرگز چرچا نہ کرے۔

۱۳......آدابِ اختلاف میں سے یہ بھی ہے کہ جس سے اختلاف کرے اسے اپنے سے بہتر سمجھے۔ "**من تواضع لله رفعه الله**" کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک دعا ہے "**أللّٰهم اجعلني في عيني صغيرًا وفي أعين الناس كبيرًا**" اپنے کو چھوٹا سمجھے گا، تو اختلاف کے موقع پر کئی فوائد ظاہر ہوں گے، مثلاً: مدِّ مقابل کا احترام کرے گا، اپنی غلطی کے ظاہر ہونے پر اسے جلد قبول کر لے گا وغیرہ۔

۱۴......آدابِ اختلاف میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے مدِ مقابل کے امتحان کی غرض سے کسی مسئلہ کو نہ اٹھائے۔

۱۵......آدابِ اختلاف میں سے ایک ضروری ادب یہ بھی ہے کہ آدمی جس قول کی مخالفت کرے، اس سے تعرض کرے؛ البتہ اس کے قائل اور قائل کے کردار یا اس کی ذات سے تعرض نہ کرے، اس کی نیت پر حملہ نہ کرے۔

۱۶......آدابِ اختلاف میں سے یہ بھی ہے کہ اختلافِ رائے کی وجہ سے قطعِ کلامی اور قطعِ تعلق نہ کرے۔

۱۷......آدابِ اختلاف میں سے یہ بھی ہے کہ اگر مدِّ مقابل کے ساتھ بھلائی کے کسی کام پر تعاون کی ضرورت پیش آئے، اور مصلحت اس کی متقاضی ہو تو تعاون کرنے میں مبادرت کرے، یہاں تک کہ فقہا نے مسلمانوں کی کسی مصلحتِ عامہ کی خاطر مبتدع کے ساتھ بھی بھلائی پر تعاون کی گنجائش بیان کی ہے، اسی لیے ہم

دیکھتے ہیں کہ ہمارے محدثین نے فرقِ باطلہ کے علما ومحدثین کی روایتوں کو بھی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے؛ بل کہ امام بخاری ومسلم علیہما الرحمۃ نے بھی، اور اُن کے ساتھ لفظِ مبتدع کو بھی ذکر نہیں کیا، بل کہ علما نے تو حقوق کے باب میں اہلِ بدعت کی شہادت قبول کرنے کی بھی گنجائش بیان کی ہے۔

۱۸.....آدابِ اختلاف میں سے یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے موقع پر بھی ہمیشہ صفتِ تواضع سے متصف رہے، اسی لیے علما نے لکھا ہے کہ اختلافِ رائے کی صورت میں اگر اُس کی اپنی رائے صحیح ثابت ہو، تو اس کا اعلان نہ کرتا پھرے، اور اپنے مدِ مقابل کی خطا اور اس کی بدعت کو عام کرنے کا بیڑا نہ اٹھائے، بل کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اسے اُس نے حق تک رسائی نصیب فرمائی، اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کرے۔

۱۹.....آدابِ اختلاف میں سے یہ ہے کہ مدِ مقابل کی جانب سے کوئی تکلیف پہونچے، تو اس پر صبر کرے، اس کے ردِّ عمل پر نہ اتر آئے۔

۲۰.....آدابِ اختلاف میں سے یہ ہے کہ اپنے مدمقابل کے ساتھ نرمی سے پیش آئے، اور سخت رویہ اختیار نہ کرے۔

۲۱.....آدابِ اختلاف میں سے یہ بھی ہے کہ اگر مدِّ مقابل پر ظلم کیا جارہا ہو تو اس کی مدد کرے، اگر مدد کرنے کی طاقت ہو۔

۲۲.....آدابِ اختلاف میں سے یہ ہے کہ اگر اپنے مخالف اور مدمقابل میں خوبیاں پائی جارہی ہوں تو اُن کو بیان کرے، اور ان کا اعتراف کرے، صرف اُن کی غلطیوں کے پیچھے نہ لگا رہے۔

۲۳.....آدابِ اختلاف کا آخری ادب یہ ہے کہ جس سے اختلاف کرے، اسے ایسے نام سے یاد کرے جسے وہ پسند کرتا ہو، اور برے لقب سے یاد کرنے سے احتراز کرے، اپنے دل کو اس کے بارے میں صاف رکھے اور اپنی زبان کو بدکلامی سے بچائے۔

## ألأسبا ب المانعة عن قبول الحق:

امام ابن القیم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ قبولِ حق سے مانع کئی اسباب ہیں:

(۱)جهالة: فإن من جهل شيئا عاداه وعاداأهله ۔(۲)بغض وعناد (۳)حسد وكينه۔(۴)والتقليدالآبائي: بلا دلیل اپنے پیشواؤں کی پیروی۔(۵)ہوائے نفس: عزتِ نفس اور اس کی خواہش۔(۶)قبولِ حق کی صورت میں اپنے دوست واحباب، خاندان اور قبیلہ کی مخالفت کا ڈر۔

# مسلم سلطنتوں میں ہندو اُمراء اور مذہبی رواداری

تلخیص وترتیب از کتاب:

## "اُمرائے ہنود"

یعنی (اُن ہندوؤں کے حالات جو سلطنتِ مغلیہ میں ممتاز عہدوں پر سرفراز رہے)

مؤلف: منشی محمد سعید احمد صاحب مارہروی ملخص: مفتی عبد المتین صاحب اشاعتی کانڑگانوی (۱)

موجودہ حالات میں بعض ہندو برادران نے مسلمانوں پر طرح طرح کے الزامات اور بہتان باندھنے شروع کیے ہیں جس میں سے ایک یہ کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ اقتدار میں برادران وطن پر ظلم کیا۔ تو یہ مضمون تاریخی حقائق کو اجاگر کرتا ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح اپنے دورِ اقتدار میں ملک کے غیر مسلم برادران خاص طور پر ہندو برادران کے ساتھ حسن سلوک کیا، یہی نہیں بل کہ انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ تو آیئے! اس مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں۔

### ہندوستان کے اصلی باشندے:

ہندوستان کے اصلی باشندے (گونڈ، بھیل، آدی واسی، دلت وغیرہ) جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے، اور شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے، اس کے بعد جیحون (اُمو دار یہ) اور سیحون (سردار یہ؛ یعنی ماوراء النہر کے علاقے، مثلاً: بخاریٰ سمرقند، بدخشاں، خجند، طشقند، خراسان، خوارزم، ترمذ وغیرہ) کے میدانوں سے "آرین/آریہ" نام کی ایک زبردست قوم نے آکر، دھیرے دھیرے پورے ملک ہندوستان پر اپنا قبضہ جمالیا، یہاں کی سرسبزی، شادابی اور زرخیزی دیکھ کر، یہیں زمین گیر ہو گئے۔ یہ قوم نہایت ذہین، طبّاع اور اُس زمانے کی اعلیٰ درجے کی مہذب و تعلیم یافتہ تھی، انہوں نے علمِ الٰہی، فلسفہ، حکمت، نجوم، ریاضی وغیرہ میں قابلِ قدر ترقی کی،

---

(۱) ☆ بین القوسین پیراگراف کا اضافہ۔ ☆ بعض الفاظ کی تسہیل۔ ☆ بعض جملوں کی تعبیر میں تغیر یسیر۔
☆ اکثر و بیشتر جلی عناوین کا اضافہ۔ ☆ وہ پیراگراف جن کی طرف زیادہ توجہ درکار ہے اُن کے نیچے خط کشی۔
☆ بعض جگہوں پر ضروری انگریزی الفاظ کی اسپلن کا اضافہ۔ ☆ اخیر میں ہندو راجاؤں کے دیئے گئے عہدے و مناصب اجمالی انداز میں۔

جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر زراعت کے قابل بنایا، تجارت، صنعت وحرفت میں نام پیدا کیا، غرضیکہ ہر قسم کی تہذیب وشائستگی پھیلا کر ہندوستان کو جنت نشاں بنایا، لیکن سخت تعجب ہوتا ہے کہ تہذیب وشائستگی کے باوجود، اس فاتح قوم کا رویہ اپنے مفتوحین کے ساتھ سخت ظالمانہ ومعاندانہ تھا، جب ان لوگوں نے ہندوستان میں قدم رکھا، تو ملک کے اصلی باشندے لڑتے لڑتے دائیں بائیں جنگلوں اور پہاڑوں میں گھُس گئے، کچھ لوگ فتح یابوں (آریہ) کی غلامی اور خدمت گاری کے کام میں آئے، جن کو انہوں نے ''شودر'' (ذلیل خدمت گار) کا لقب دیا۔

## قوانین ''منو'':

اس فاتح قوم کے مشہور ومعروف مجموعۂ قوانین ''منو'' میں (جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نوسو برس قبل کا لکھا ہوا ہے)، سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ لکھی ہوئی ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

(۱) متبرک (برہمن)

(۲) سپاہی (چھتری)

(۳) لخنتی (ویش)

(۴) خدمتی (شودر)

یعنی برہمنوں کو غایت درجے کی عظمت وبزرگی، اور شودروں کو نہایت درجے کی ذلت وخواری دی گئی ہے۔ اور ''منو'' نام کا پورا قانون صرف تین برتر فرقوں (برہمن، چھتری، ویش) کی خاطر بنایا گیا، اور چوتھا فرقہ (شودر) صرف اُن کا خدمت گار ہے، خاص کر برہمنوں کی خدمت کرنا اس کے فرضِ منصبی میں شامل ہے۔ اگر کسی شودر کو برہمن کی خدمت کا موقع میسر نہ ہو، تو بالترتیب چھتری یا ویش کی خدمت حاصل کرے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے، تو پھر دست کاری؛ مثلاً: معماری، نجاری، مصوّری، محرری وغیرہ کے پیشہ کو اختیار کرے۔

## قانونی جبر وتشدُّد اور ظلم وستم:

برہمن فرقہ اگر سخت سے سخت، اور بڑے سے بڑا جرم بھی کر لے، تو وہ آزاد ہے، اسے کسی سزا کا مستحق نہیں سمجھا گیا، بل کہ صرف خفیف تنبیہ پر اکتفا کیا گیا، جب کہ دیگر تین فرقوں کی جانب سے اگر برہمن فرقہ کی شان میں ہلکی سی بھی گستاخی سرزد ہو، تو اس کی دو چند سزا مقرر کی گئی تھی۔

شودر فرقہ کو ''بید شاستر'' اور مذہبی کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں، اور نہ ہی کوئی برہمن کسی شودر کے سامنے ''بید شاستر'' یا کوئی مذہبی کتاب پڑھ سکتا ہے۔

شودر کوصرف ''ہوم'' (ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم جس میں منتر پڑھتے ہوئے آگ میں گھی ڈالتے جاتے ہیں) کرنے کی اجازت ہے،لیکن کوئی برہمن شودر سے ہوم نہیں کرواسکتا،اگر کروالیا،تو بڑا سخت گناہ ہے،جس کا کفارہ بھی دینا پڑتا تھا۔

شودر کو دنیوی کاموں میں نصیحت کرنا،یا دھرم شاستر کے مسائل سکھانا،یا اُس کے گناہ کے کفارہ کا طریقہ بتانا برہمن کو''آسم ورتا'' نامی دوزخ میں ڈالتا ہے۔

کوئی برہمن شودر سے نذر وتحفہ نہیں لے سکتا،اس پر سخت ممانعت وتاکید کی گئی ہے،اگر کوئی برہمن لے لے،تو اس گناہ کا کفارہ شودر کے تحفہ کا واپس کرنا ہے۔

اگر کوئی برہمن فاقے سے جاں بلب ہو،تو شودر سے خشک اناج لے سکتا ہے،مگر اس کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاسکتا،(چاہے جان چلی جائے)۔

شودر اپنے آقا (برہمن،چھتری،ویش) کے پس خوردہ (جوٹھا) سے ہی کھائے،اور آقاؤں کے ردّ کردہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے۔

شودر کو دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں،کہ وہ دولت مند ہوکر شاید کسی برہمن کے لیے رنج وتکلیف کا باعث بنے۔

شودر اگر کسی اعلیٰ فرقہ کے کسی آدمی کو گالی دے،تو اس کی زبان کاٹ لی جائے۔

شودر اگر برہمن کے پاس ایک ہی فرش پر بیٹھ جائے،تو اُس کی سُرینوں (چوتڑوں) کا گوشت کاٹ ڈالا جائے۔

شودر اگر برہمن کو دھرم کی باتیں بتائے،یعنی نصیحت کرے،تو اُس کے منھ اور کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈالا جائے۔

شودر کے قتل کا کفارہ (آریہ مذہب ''منو'' میں) بلی،کتے،چھپکلی،مینڈک وغیرہ کے مار ڈالنے کی طرح ہے۔

برہمن ذات کا کوئی آدمی کسی دوسری ذات (شودر) کے آدمی کو مار ڈالتا،تو اُس کو کچھ برت،خیرات اور پوجا کرنے کی سزا دی جاتی تھی۔

(آج بھی دادری،الور،جھارکھنڈ،ہریانہ،اُناؤ وغیرہ کے واقعات دہشت گردی کی مکمل عکاسی

کررہے ہیں، کہ قاتلوں اور مجرموں کو اب تک سزا نہیں ملی، جب کہ اس کے برعکس؛ جرم تو کجا محض دہشت گردی کے بے جا شک وشبہ اور الزام میں بے شمار مسلم نوجوانوں کو فرضی انکاؤنٹر کا شکار بنادیا گیا، اور بہتوں کو پسِ زندان سڑنے کے لیے ڈال دیا گیا، کسی شاعر نے اسی حقیقت کی تصویر اپنے شعر میں یوں پیش کی ہے):

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!!!!!

شودر کو اگر اس کا مالک آزاد بھی کردے، تو بھی وہ زندگی بھر خادم ہی رہے گا، مخدوم نہیں بن سکتا، کہ خالق نے اس کو اسی حال میں رکھنا پسند کیا ہے۔

ان چند مثالوں سے فاتح قوم کا، مفتوح قوم کے ساتھ بے رحمی، بے جا جبر وتشدُّد اور ظلم وستم کا مظاہرہ ہوتا ہے، ورنہ اس طرح کے اور بھی ظالمانہ قوانین اور مثالیں موجود ہیں۔

اور مفتوحین کے ساتھ ظالمانہ وجابرانہ برتاؤ صرف آریہ قوم ہی پر محدود نہیں، بل کہ اسلام سے پہلے تمام دنیا میں فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوحین کو جانوروں سے بدتر سمجھا ہے، رومن ایمپائر نے تمام مفتوحہ قوموں کو غلام بنا رکھا تھا۔ ہندوستان میں شودروں کی حالت بدتر تھی۔ بختِ نصر نے یہودیوں کا بے دردی سے قتلِ عام کیا تھا۔ قبطی فرعونیوں نے بنی اسرائیل (یہود) کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا تھا، وغیرہ۔

## جب اسلام آیا:

اسلام نے دنیا میں قدم رکھتے ہی اِس عام رواج کو دفعۃً مٹادیا، اور مفتوحین کے ساتھ مساوات کا درجہ قائم کرکے دنیا کو سکھادیا کہ حقوقِ عامہ میں جس قدر آدمی آسمان کے نیچے ہیں سب برابر ہیں، آج کی تمدن وتہذیب یافتہ قومیں مساوات کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ اسلام کی فیاضی کا مقابلہ نہیں کرسکے۔

جس زمانے میں دنیا کے تمام ملکوں، خصوصاً یورپ میں مذہبی آزادی کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا، اسلامی ممالک میں غیر قوموں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ہندوستان میں سب سے پہلے سندھ کو مسلمانوں نے فتح کیا، اس وقت مشہور سپہ سالار ''محمد بن قاسم رحمہ اللہ'' نے تمام ملک میں مُنادی کرادی کہ:

کسی کے مذہب میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی جائے گی، ہر شخص کو اختیار ہے کہ نہایت آزادی سے

اپنے مذہبی رسوم بجالائے۔ اس کے بعد برہمنوں کو بلاکر حکم دیا کہ اپنی مندر تعمیر کرالیں۔ ملک کے محاصل سے فیصدی تین روپیہ جو ہمیشہ سے مندروں کے خرچ کے واسطے ملتا آیا ہے بدستور ملتا رہے گا۔

جب خاص ہندوستان میں مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو یہاں بھی انہوں نے مذہبی آزادی کے اُصول کو نہایت فیاضی سے قائم رکھا۔

مسلمان فاتحوں نے حالتِ جنگ اور مخصوص حالات کے علاوہ؛ امن کے زمانے میں کبھی مندروں کو نہیں لوٹا، اور نہ مورتیوں کو توڑا، بل کہ اپنی طرف سے مندروں کے اخراجات اور پجاریوں کے وظائف کے واسطے بہت سی جاگیریں عطا کیں۔ (اکثر یورپی مؤرخین اور سیاحوں نے مسلمانوں کے عہد کی تاریخ کو نہایت متعصّبانہ نظر سے لکھا، اور اسی تاریخ کو اسکولی نصابوں میں شامل بھی کیا گیا، جس کی وجہ سے ہندو برادرانِ وطن مسلمان بادشاہوں سے نفرت کرنے لگ گئے، بل کہ تلافیٔ مافات کے لیے عام مسلمانوں پر ہی ظلم ڈھانے کا جواز حاصل کرلیا؛ البتہ بعض یورپی مؤرخین نے گرچہ اکثر و بیشتر حقیقت کو نظر انداز ہی کیا، مگر قدرے اعتراف بھی کیا ہے۔):

## حقیقت وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے!

مذہبی آزادی کے مذکورہ اُصول (جو عہد محمد بن قاسم میں بیان کیا گیا) کو اکبرِ اعظم کے دورِ حکومت میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی، اور ہندوؤں کے ساتھ حد درجہ رعایت کا معاملہ کیا گیا، یہاں تک کہ شاہی اوقاف جو مندروں کے لیے مقرر ہوتے تھے، اُن کا بھی لحاظ کیا گیا، اور ہندوؤں کے مذہب میں دست اندازی نہ کرنے کی تاکید کی گئی۔ (لہٰذا مسلم بادشاہوں پر اعتراض کہ اُن کے عہد میں نئے مندر بننے کی اجازت نہ تھی، سراسر غلط ہے)، دہلی، آگرہ، متھرا، بٹ ایشر وغیرہ میں جو اسلامی قوت وسطوت کے خاص مرکز تھے، بہت سے شاہانِ اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اِس وقت تک موجود ہیں، چنانچہ "بندرابن" کے مشہور "گوبند دیو جی، گوپی ناتھ جی، مدن موہن جی" (مندر)، مہاپربھو چیتن جی کے چیلے؛ روپ سناتن گوشائین نے مسلمانوں ہی کے عہد میں بنوائے تھے۔

بنگالہ کی مسلم حکومت میں بہت سے عیسائی مذہبی جماعتیں اپنے مذہبی اعمال کو آزادانہ اور بلا دقّت عمل میں لاسکتے تھے، مزید جگہوں پر ان عیسائیوں کی تعداد ۲۵ ہزار سے زائد تھی۔

دکن کے شاہانِ سلف کے زمانے میں غیر مذاہب والوں کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی، ڈاکٹر برنیر نے اپنے سفر نامہ میں "ستی" کے بیان میں لکھا ہے کہ: مسلمان جو اس ملک کے فرماں روا ہیں، اِس وحشیانہ رسم کے

نیست ونابود کرنے میں حتی المقدور کوشش کرتے ہیں، اگر چہ اس کے امتناع کے واسطے کوئی مقررہ قانون نہیں ہے، کیوں کہ اُن کی تدبیرِ مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے، بل کہ اُن کے مذہبی رسوم کے بجالانے میں اُن کو آزادی دیتے ہیں۔

اسی طرح دہلی کے مشہور میلہ ''سورج گہن'' کے اشنان اور پوجا پاٹ کی رسموں کو مسلم بادشاہوں نے منع نہیں کیا۔

موسیو تھیو نیو فرانسیسی سیاح نے اپنے (۱۶۵۵ء سے ۱۶۶۸ء تک کے) سفر نامۂ ہندوستان میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی اکثر بستیوں میں مندر بنے ہوئے تھے، ہندو گاڑیوں میں جاتے ہوئے جا بجا ملتے تھے، جو ان مندروں میں اپنی پوجا کے واسطے آئے تھے۔

مغلوں کے صوبۂ بالاگھاٹ اور سلاطینِ دکن کے قلمرو میں عیسائیوں کے بہت سے کالج، اور خانقاہیں موجود تھیں، عیسائی پادری اپنے مذہب کی اشاعت کے واسطے برابر آتے جاتے تھے، اور نہایت آزادی سے اپنے کام میں مصروف تھے۔

رائے بہادر لالہ بیجناتھ اپنی کتاب ''ہندوستان گذشتہ وحال'' میں مسلم حکومت کے طریقۂ کار سے متعلق لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے مذہب میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی تھی، نہ اُن سے کوئی دشمنی کا برتاؤ ہوتا تھا، بہت سے ہندو حساب اور مال کے محکموں میں نوکر ہوتے تھے، مبارک خلجی کے وقت میں کل گورنمنٹ کا طریقہ ہندوانہ تھا، اور ہندو لوگ اپنے مذہب کو کم تبدیل کرتے تھے۔ (مطلب اُن پر کوئی جبر واِکراہ نہیں ہوتا تھا، کہ وہ اسلام قبول کریں، اگر ایسا ہوتا تو آج ہندوستان مسلم اکثریت والا ملک ہوتا۔)

اسلامی عہد حکومت میں مذہبی آزادی کا اِس سے زیادہ کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ ہندوؤں کے بڑے بڑے واعظ اصلاح کنندگان اور موجدانِ مذہب نہایت آزادی سے اپنے اپنے مذہب اور طریقے کی اشاعت میں سرگرم تھے، اور کوئی ان کو نہ روکتا تھا، اور جب تک کوئی شخص ملک کے پولیٹکل (Political) معاملات سے الگ تھلگ رہتا، کبھی اُس کے مذہبی معاملات میں دست اندازی نہ کی جاتی تھی، چنانچہ ''گُرو رامانند، بابا کبیر داس، گورو نانک، مہاپربھو چیتن جی، روپ سناتن گوشائین، بلبہ آچاریہ جی، بابا سورداس جی، گوشائین تُلسی داس، بابا تو کارام'' وغیرہ کے حالات اِس کے ثبوت میں موجود ہیں، اور ہندوؤں کی طرح تعلیم یافتہ مسلمان بھی اُن کو عزت وعظمت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

## جزیہ (ٹیکس) کی حقیقت:

بعض لوگ مذہب اسلام پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ غیر مذہب والوں پر کافر ہونے کا ٹیکس جزیہ کے نام سے جبرًا لگایا جاتا تھا، جس سے بچنے کے لیے غیر قومیں اسلام قبول کرنا گوارا کر لیتی تھیں، یہ الزام بھی سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جزیہ کی حقیقت یہ ہے کہ جزیہ دراصل فارسی کے لفظ "گزیہ" کا معرب ہے، جس کے معنی "خراج" کے ہیں، سب سے پہلے نوشیروان نے جو دنیا میں "عادل" لقب سے مشہور ہے، جزیہ کے قواعد مقرر کیے تھے، اور عموماً اہلِ فوج کو اِس ٹیکس سے بری رکھا تھا۔ اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اُس کی رُو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے واسطے مجبور کیا جاسکتا تھا، جب غیر مذہب والوں پر اسلام کی حکومت ہوئی، اور اُن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑی، تو چوں کہ اُن کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق حاصل نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پُر خطر خدمات کے واسطے بہ خوشی راضی ہو سکتے تھے، اس لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام "جزیہ" تھا۔ (گویا جزیہ برائے محافظت وصول کیا جاتا تھا، بر بنائے ظلم و جبر نہیں۔) اور جزیہ کی عام شرح تین روپیہ اور چھ روپیہ سال تھی، خاص خاص حالتوں میں زیادہ تعداد بیس روپیہ سالانہ تھی، اگر کسی کے پاس لاکھوں روپے ہوتے، تو بھی اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا۔

مزید برآں! بیس برس سے کم عمر اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے، عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون اور مفلس لوگ جن کے پاس دوسو درہم سے کم ہوں، جزیہ سے مستثنیٰ تھے، کیا کوئی شخص خیال کر سکتا ہے کہ ایسے ہلکے ٹیکس سے بچنے کے لیے دنیا میں ایک شخص نے بھی اپنا مذہب چھوڑا ہوگا۔ جب کہ جزیہ (ٹیکس) کے مقابلے صرف مسلمانوں سے زکوۃ وعشر کا ٹیکس اُس سے زیادہ مقدار میں وصول کیا جاتا تھا۔

نیز اگر کسی غیر قوم نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی، تو وہ بھی مسلمان فوجیوں کی طرح جزیہ سے بری رکھے گئے۔ اور جزیہ کا یہ رواج ہمیشہ، ہر مسلم حکومت میں نہیں رہا، بل کہ کبھی موقوف ہوا، کبھی مقرر ہوا۔ جیسا کہ اکبر اعظم کے عہد میں جب ہندوؤں نے فوجی ملازمت اختیار کر لی، تو عام طور سے جزیہ معاف کر دیا گیا۔

اورنگ زیب رحمہ اللہ نے "ست نرائنی" فرقہ اور دیگر ہندوؤں کی بغاوت سے برافروختہ ہو کر جزیہ مقرر کر دیا، لیکن جو ہندو فوجی ملازمت میں تھے وہ جزیہ سے مستثنیٰ رہے، جیسے کہ راجپوتانہ کے جملہ راجہ فوجی خدمات انجام دیتے تھے، وہ جزیہ سے بری تھے۔

## مذہبِ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا!:

ہندوستان میں بادشاہوں پر یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ اُنہوں نے ہندوؤں کو جبراً مسلمان کیا، اور ہندوستان میں مذہبِ اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا، اِس غلط اور متعصّبانہ الزام کی تردید غیر مذہب والوں کی تحریروں سے کی جاتی ہے:

جو فاتحینِ اسلام شمالی ہند میں شاہی خاندانوں کے بانی ہوئے، یا جنہوں نے دکن میں اسلامی سلطنتیں قائم کیں، اُن کو مذہب کی کچھ پروا نہ تھی، اُن میں اکثر ایسے تھے جن کو تبلیغِ مذہب کی مہلت ہی نہ ملی، کیوں کہ یا تو ملک کے فتح کرنے میں اُن کا وقت صرف ہوا، یا خانہ جنگیوں سے اُن کو فرصت نہ ہوئی، یہ مسلمان فاتح اکثر وحشی مغل یا تاتاری ہوتے تھے، پیغمبرِ عرب کے دین پر خود اُن کو استحکام نہ تھا، انہوں نے جو سلطنتیں قائم کیں، اُن کی حیثیت ہمیشہ جنگی رہی۔ (یعنی اکثر و بیشتر مسلم بادشاہوں (مثلاً: خلجی، تغلق، لودی وغیرہ) نے بس ملکوں اور شہروں کی فتح کو پیشِ نظر رکھا، اسی کی خاطر جنگیں کیں، اُنہوں نے اپنے دورِ سلطنت میں قلعوں، عمارتوں پر تو خوب محنتیں کیں، لیکن دلوں پر اور رعایا کی آخرت کے بنانے پر محنتیں نہیں کیں، ورنہ آج ہندوستان مکمل طور پر مسلم ملک ہوتا، یا کم از کم مسلم اکثریتی ملک ہوتا۔)

خاندانِ مغلیہ میں اورنگ زیب رحمۃ اللہ علیہ، اور جنوبی ہند میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان رحمہما اللہ پر مذہبی سختی، اور ہندوؤں کو جبراً مسلمان کرنے کے اِلزام بہت لگائے جاتے ہیں، جب کہ پروفیسر آرنلڈ کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیبؒ کے عہد کی کتبِ تواریخ میں جبراً مسلمان کرنے کا کہیں ذکر نہیں، اس طرح کی روایتیں صرف مقامی اور خاندانی ہیں۔ اسی طرح حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں جن ہندو خاندانوں کو جبراً مسلمان کرنے کی روایت ملتی ہے، وہ بھی غلط ہے، کیوں کہ ان ہندو خاندانوں کا مسلمان ہونا اِن بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اورنگ زیب نے ترقی دین کے جوش میں نومسلموں کے ساتھ کھلے ہاتھوں فیاضی تو کی، لیکن غیر مذہب کے (ہندو، عیسائی وغیرہ) لوگوں پر مذہبی باتوں میں سختیاں نہیں کیں۔

## ہندوستان میں اشاعتِ اسلام:

ہندوستان میں مسلمانوں کی عمل دار قائم ہونے سے پہلے ہی داعیانِ اسلام کے ذریعے سے اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا، داعیانِ اسلام ہندوستان کے مختلف دور و دراز ملکوں اور راجپوتانہ کے ریگستانی حصوں میں پہنچ گئے تھے، اور نہایت سلامت روی سے اسلام کی اشاعت میں مصروف تھے، جہاں جہاں اِن نیک نیت

داعیانِ اسلام کا قدم پہنچا اسلام کو اپنی اشاعت میں بلا جبر و اِکراہ بڑی اور مستقل کامیابی حاصل ہوئی، اسلام ہر شخص سے خود مخاطب ہوا، اور فرمان رواؤں سے لے کر مفلسوں تک میں سے لاکھوں کو اپنا پیرو بنالیا۔ بہت سی قومیں جو صدہا سال سے ہندوؤں کے طبقے سے خارج، اور نہایت ذلت وخواری سے اپنے دن کاٹ رہی تھیں، اُن کو اسلام نے اپنی اخوت کے دائرے میں لے کر عزت کے اعلیٰ درجے پر پہنچا دیا۔

اسلام کو اُن مقامات میں جہاں اسلامی عمل داری اور اقتدار نہ تھا، بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، بہ نسبت اُن مقامات کے جہاں مسلمانوں کی حکومت نہایت شان وشوکت، رفعت وعظمت، اور قوت وسطوت کے ساتھ مدتوں سے قائم تھی، مثلاً: جنوبی ہندوستان اور مشرقی بنگالہ میں جہاں مسلمانوں کی پولیٹکل (Political) قوت بہت ہی ضعیف وکم زور تھی، لیکن مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اور دہلی آگرہ کے قرب وجوار میں پولیٹکل (Political) قوت مضبوط ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔

داعیانِ اسلام نے تعداد کے لحاظ سے جیسی کامیابی صوبۂ بنگال میں حاصل کی، اُس کی نظیر کسی دوسرے صوبے میں نہیں ملتی، صوبۂ بنگال میں، جب سن ۱۴۰۴ء میں جٹ مل کا باپ ''راجہ کانس'' مر گیا، تو اُس نے راج کے تمام سرداروں کو جمع کیا، اور اُن کے سامنے مسلمان ہونے کا قصد ظاہر کیا، اور کہا کہ ایسی حالت میں اگر تمہیں میری سلطنت سے اِنحراف ہو، تو میں بہت خوشی سے اپنے چھوٹے بھائی کو راج (سلطنت) کا مالک کردوں گا، تمام سرداروں نے متفق ہوکر جواب دیا کہ ہم آپ کے مطیع اور فرماں بردار ہیں، اُمورِ دنیوی میں مذہب اور دین کا کچھ کام نہیں ہے، ''جٹ مل'' نے علماء لکھنوتی کو طلب کر کے مذہبِ اسلام اختیار کیا، اور اپنا نام ''جلال الدین'' رکھا، اس کے زمانۂ حکومت میں کثرت سے لوگ مسلمان ہوئے۔

اسی طرح عالمگیر کے عہد میں کِشتوار (صوبۂ کشمیر) کے راجپوت راجہ نے حضرت شاہ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہ کی کرامتوں کا مُشاہَدہ کر کے اسلام قبول کیا، اور راجہ کے مسلمان ہوتے ہی رعایا بھی کثرت سے مسلمان ہوگئی۔

کشمیر کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ نے بھی چودہویں صدی عیسوی میں کسی درویش ''بلبل شاہ'' نامی بزرگ کی ہدایت وتلقین پر مذہب اسلام قبول کیا تھا۔ (معلوم ہوا کہ بادشاہ جٹ مل اور راجپوت راجہ وکشمیری بادشاہ پر کسی نے جبر واِکراہ نہیں کیا تھا، وہ اپنی رضا وخوشی سے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور چوں کہ مقولہ ہے:" **الناس علی دین ملوکھم** " کہ رعایا اپنے حکم رانوں اور قائدوں کے دین پر ہی چلتی ہے، لہٰذا جٹ مل، راجہ راجپوت کشتوار کی اکثر وبیشتر رعایا بلا جبر واِکراہ مسلمان ہوگئی۔)

غرضیکہ ان نیک نیت داعیانِ ملتِ اسلامیہ نے جو انسانوں کے دلوں کے بادشاہ تھے، اپنی اخلاقی قوت سے اکثر سلطنتوں کی کایا پلٹ دی، اور اپنا روحانی واخلاقی اثر غیر مسلم قوموں پر ایسا چھوڑا کہ سن ۱۸۹۱ء کی سرکاری مردم شماری میں صرف ہندوستان کے مغربی وشمالی علاقوں اور اَودھ میں ۲۳۰۳۶۴۳/ ہندوؤں نے جو اِس صوبہ کی کل ہندو آبادی کے ۷۸-۵۲/ تھے، اپنا مذہب پیر پرست لکھوایا تھا۔

## مذہب ہنود کی نسبت مسلمان بزرگوں کی رائے:

حضرت مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمۃ (جو سلوک وتصوف میں بہت بڑے پایہ کے بزرگ گزرے ہیں، یہاں تک کہ قاضی ثناء اللہ علیہ الرحمۃ کو آپ کی کفش برداری پر ناز تھا)، ان سے کسی نے دریافت کیا کہ ہندو مذہب کی نسبت ہم کو کیا اعتقاد رکھنا چاہیے؟ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا (جس کا خلاصہ یہ ہے) کہ:

جس قدر اہلِ ہند کی پورانی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رحمتِ الٰہی نے انسان کی ابتدائی پیدائش کے زمانے میں اُن کے معاد اور معاش کی درستی کی غرض سے ایک کتاب ''بید'' جس کے چار دفتر ہیں، اور جو تمام امر ونہی اور واقعاتِ گزشتہ اور آئندہ کا مجموعہ ہے، ایک فرشتہ ''برہما'' کے ذریعے سے جو اِیجادِ عالم کا واسطہ ہے، نازل کی، اُس زمانے کے علمائے مجتہدین نے اِس کتاب سے چھ مذہب استنباط کر کے عقائد کی بنیاد اُن پر قائم کی، اِس فن کو ''دھرم شاستر'' کہتے ہیں، جس سے ''علمِ کلام'' مراد ہے۔ اسی طرح چار قومیں قرار دیں، اور چار طریقے اُس کتاب سے مستنبط کر کے ہر طریق کے لیے ایک مسلکِ خاص مقرر کیا، اور تمام اعمال وافعال کی بنیاد انہیں طریقوں پر قائم کی، اِس فن کو ''کرم شاستر'' کہتے ہیں، جس سے ''علمِ فقہ'' مراد ہے۔

ان کے تمام فریق خدا کی وحدت کو تسلیم کرتے ہیں، اور تمام عالم کو حادث اور مخلوق مانتے ہیں، اور نظامِ عالم اور حشر ونشر جسمانی اور نیک وبد کی سزا وجزا کا اقرار کرتے ہیں۔ الحاصل! اُن کے اُصولِ مذہب میں ایک ایسا نظم ونسق پایا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین بھی مُرتَّب ہے، لیکن منسوخ شدہ ہے۔

ہماری شریعت میں ادیانِ منسوخہ میں سے سوائے یہود ونصاریٰ کے کسی دین کا ذکر نہیں کیا گیا، حالاں کہ اس کے علاوہ بہت سے دین منسوخ ہو چکے ہیں، اور بہت سے مذاہب اِس صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئے، پس غور کرنا چاہیے کہ آیتِ کریمہ ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ . ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممالک ہند میں بھی رہنما وپیغمبر بھیجے گئے ہیں، جن کے احوال اُن کی کتابوں میں موجود ہیں، اور

اُن کے اخبار و آثار سے جو ہنوز (اب تک) باقی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ذی رُتبہ اور صاحبِ کمال تھے، اور خدا کی رحمت نے اِس وسیع سرزمین میں بھی ہندوؤں کے مصالح واَغراض کو ملحوظ رکھا ہے۔

اور جب کہ ہماری شریعت حسبِ تصریح ﴿مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ اکثر انبیا کے حال سے ساکت ہے، تو ہم کو بھی اِن لوگوں کے حق میں سکوت اختیار کرنا چاہیے، نہ ہم کو ان کے مقلدین کے کفر و اِلحاد پر ایمان واجب ہے، نہ اُن کی نجات پر اعتقاد فرض ہے، لیکن اگر تعصب نہ ہو، تو احتمالِ حُسنِ ظن موجود اور متحقّق ہے۔

مشہور مؤرخ ''البیرونی'' جو سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان میں آیا تھا، ہندوؤں کی نسبت لکھتا ہے:

''ہندو گو بُت پرست کہے جاتے ہیں مگر بُت پرستی عوام الناس میں ہے، عقلا میں نہیں ہے، وہ ایک خدا کو- جس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے، جو اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو قادرِ مطلق ہے، جو دانائے کل ہے، جو سارے (جہان) میں موجود ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، اور سب کی حفاظت کرتا ہے، جو اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، جس کی مشابہت کسی چیز سے نہیں ہوسکتی- مانتے ہیں۔''

فاضل بے نظیر علامہ ابوالفضل ''آئینِ اکبری'' میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی کتابوں میں نہایت بے بہا اور اعلیٰ ہدایتیں ہیں۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ حضور ''کنہیا جی'' کے حق میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ بہتر تو یہ ہے کہ اُن کے حق میں چُپ رہنا چاہیے، لیکن بھاگوت سے جو ہندوؤں کی معتبر کتاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''کنہیا جی'' اولیا میں سے تھے۔

مولوی عبد العزیز صاحب لکھنوی مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''راجہ رام چندر'' اور ''کنہیا جی'' وغیرہ اگلے بزرگوں کو بُرا کہنے سے (مسلمان) توبہ کریں، البتہ جو ہندو اُن کو خدا سمجھ کر پُوجتے ہیں، اُن کی رسموں اور میلوں اور تماشوں سے لاکھوں کوس بھاگیں۔

''تھانیسر'' ہندوؤں کا متبرک مقام ہے، وہاں ہر سال اشنان کا میلہ نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا، سلطان سکندر لودھی نے جیسے سید سالار مسعود غازی کے نیزہ کا مشہور میلہ بند کرایا، ایسے ہی تھانیسر میلے کے بند کرنے کا بھی ارادہ ظاہر کیا، تو مشہور بزرگ عالم ''میاں عبد اللہ اجودھی'' نے اس معاملے میں بادشاہ کی سخت مخالفت کی، اور نہایت آزادی سے فرمایا کہ بُت خانے کو ویران کرنا کسی طرح جائز نہیں، اور جس حوض یا دریا میں

قدیم (زمانے) سے عنسل ہوتا آیا ہے، اُس کی ممانعت کرنا کسی طرح رَوا نہیں ہے۔ (چنانچہ بادشاہ سکندر لودھی نے اپنے اِس خیال کو ترک کر دیا۔)

سلطان سکندر والیِ کشمیر کے عہد میں ''سیہ بُت'' نام کا ایک برہمن مسلمان ہوگیا، اور ترقی پا کر وزارت کے درجے پر پہنچ گیا، اس نومسلم نے ہندوؤں کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، جب سکندر کے بیٹے سلطان زین العابدین کا دور آیا، تو اس نے علما وفضلائے عہد کے مشورے سے ''سیہ بُت'' کے عہد کے تمام احکام منسوخ کر کے، اُن کل برہمنوں کو جو سیہ بُت کے خوف سے ملک سے نکل گئے تھے، دور دراز کے شہروں سے سفرِ خرچ بھیج کر بلا لیا، اور اُن کے واسطے جاگیریں مقرر کر دیں، اور اپنی رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی دے کر مندروں کے اخراجات کے واسطے جاگیریں اور وظیفے مقرر کر دیئے، جو لوگ سیہ بُت نومسلم کے خوف سے مسلمان ہوگئے تھے، اُن کے واسطے حکم دیا کہ جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں، چنانچہ وہ سب اپنے اصلی مذہب کی پیروی کرنے لگے، بل کہ سلطان زین العابدین نے جزیہ بھی معاف کر دیا۔

## یہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟

اِس قسم کی عام مذہبی آزادی کے مقابلے اگر کسی خاص بادشاہ کے اصلی یا فرضی و بناوٹی مذہبی تعصُّب کے واقعات کو پیش کر کے یہ کہا جائے کہ اسلامی حکومت میں مذہبی آزادی کا نام تک نہ تھا، ظلم نہیں تو کیا ہے؟ اگر کسی خاص بادشاہ نے مقررہ اُصول کے خلاف کیا، تو اُس کا اعتراض سب بادشاہوں پر نہیں ہوسکتا۔

خود ہندوستان ہی میں بودھ، جین اور برہمن مذہب کے پیروکار ایک دوسرے کے مندروں اور مورتیوں کو تباہ و برباد کر چکے ہیں، شمس العلما مولوی ذکاءاللہ خان گجرات کی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ملک گجرات میں جین اور برہمن مذہب مروّج تھے، جو ایک دوسرے کے استیصال کے درپے رہتے تھے، ہمیشہ ان کے درمیان میں جنگ و پیکار رہتی تھی، ایک دوسرے کے عبادت خانوں کو مسمار کرتے تھے، جن کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں، ابتدا میں جین مذہب والوں کا ستارہ چمکا، آخر کو برہمن مت کا عروج ہوا۔ اسی طرح بودھ مذہب والوں نے اپنے عروج کے زمانے میں ہندوؤں کے مندروں کو غارت کیا، جنہیں ''شنکراچاریہ جی مہاراج'' نے ازسرِ نو تعمیر کرایا۔

## ہندوستان سونے کی چڑیا:

ہندوستان کی تمام تاریخیں اِس بات کی شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں مال و جائداد

، قانون اور معاشرت کے تمام اُمور میں ہمیشہ فاتح اور مفتوح کے حقوق کو مساوی درجے پر قائم رکھا ہے، جب کوئی نیا ملک فتح ہوا، تو امن وامان قائم ہونے کے بعد جس قدر مال وجائداد جس کے قبضے میں تھا، عموماً بحال رکھا گیا۔

شیر شاہ سوری کے عہد تک دیہاتی انتظام اور وصولِ مال گزاری کا وہی انتظام قائم رہا، جو ہندوؤں کے عہد سے چلا آتا تھا، شمالی ہند میں اول شیر شاہ سوری اور اس کے بعد اکبر اعظم کے مشہور ومعروف (ہندو) وزیر "راجہ ٹوڈرمل" اور جنوبی ہند میں "ملک عنبر" نے دیہات کا سلسلۂ انتظام از سرِ نو قائم کیا، تمام ملک کی پیائش ہوکر مال گزاری مقرر کی گئی۔

پُرانے زمین داروں کا قبضہ بحال رکھا گیا، اگر چہ ہمارے مؤرخین نے اِس قسم کے واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن یورپ کے جو سیّاح اِس عرصے میں ہندوستان آئے، اُن کے سفرناموں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ فاتحین کے اِس فیّاضانہ طرزِ عمل سے "ہندوستان سونے کی چڑیا" بنا ہوا تھا۔

سن ۱۴۲۰ء میں نِکولوڈی کونٹی (Nicolodi Conti) یورپی سیّاح ہندوستان میں آیا تھا، لکھتا ہے کہ گجرات اور گنگا کے کنارے پر بہت سے شہر اور خوب صورت باغ اور باغیچے تھے، اور ماراضیہ (Maragia) تک پہنچنے میں اُس کو چار بڑے شہر ملے، ماراضیہ میں سونا چاندی (اور) جواہرات بکثرت تھے۔

اسی طرح باربوسہ (Barbosa) اور برتمال (Bartimal) کا بیان ہے کہ کیمبے ایک بڑا خوب صورت شہر تھا، جس کے چاروں طرف ملک شاداب اور سب قوموں کے سوداگروں سے آباد تھا۔

## ہندوستان انٹرنیشنل تجارتی مرکز:

افریقی مسلم سیّاح "ابن بطوطہ" محمد شاہ تغلق کے عہد میں ہندوستان آیا، اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ یہاں پر بہت بڑے بڑے شہر اور قصبے ہیں، ملک کی حالت بہت اچھی ہے، دہلی سے ملتان تک پچاس دن کا سفر ہے، مگر ڈاک کا انتظام ایسا اچھا ہے کہ پانچ روز میں خط پہنچ جاتا ہے، ہرکارے اور سوار ڈاک پہنچاتے ہیں، میل کے ایک ایک ثلث پر گاؤں آباد ہیں، گاؤں کے باہر ہرکاروں کے بیٹھنے کی بُرجیاں بنی ہوئی ہیں، بادشاہ پردیسیوں کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے ہیں، شہر "مدورا" (مدورائی چینائی) مثل دہلی کے ہے، "مالابار" میں ایک بالشت جگہ بھی کاشت سے خالی نہیں ہے، ہر شخص کے پاس باغ ہے، اور باغ کے درمیان میں مکان ہے، چاروں طرف لکڑی کی باڑ ہے، چین، عرب، فارس، افریقہ کے جہاز ہندوستان میں آتے ہیں، شرقی اور غربی کناروں پر

بڑی تجارت غیر ملکوں کے ساتھ جاری ہے، اور ملک کی اندرونی تجارت بھی کم نہیں ہے۔

ٹیورنیر (Tauernier) شاہ جہاں کے عہد سے متعلق لکھتے ہیں کہ شاہ جہاں اپنی رعایا پر مثل بادشاہ کے حکومت نہیں کرتا، بل کہ ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسا باپ بیٹوں سے کرتا ہے، اور گو اُس کی گورنمنٹ میں کچھ سختی معلوم ہوتی ہو، مگر عام طور سے رعایا کے جان و مال کی بڑی حفاظت ہے۔

شہنشاہ جہانگیر نے تخت نشیں ہو کر سب سے پہلے جو بارہ احکام صادر فرمائے تھے، اُن میں ساتواں حکم یہ تھا کہ ''حکام خالصہ اور جاگیردار خود کاشت نہ کریں، اور نہ رعایا کی زمین چھینیں۔''

سلطان محمود خلجی والیٔ مالوہ جب احمد آباد بدر کو فتح کیا، شاہی باورچی خانے کی ترکاری بونے کے واسطے زمین میسر نہ ہو سکی، تو مقامی بزرگ شہری مولانا شمس الدین حق گو سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین میں ترکاری بوتا ہو، تو بتائیے کہ قیمت دے کر اُس سے خریدی جایا کرے۔

اگر کسی بادشاہ کو کسی مسجد یا اور کسی عمارت کے واسطے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی، تو بیش قرار معاوضہ دے کر لی جاتی تھی، چنانچہ جامع مسجد آگرہ کے واسطے شاہ جہاں کے عہد میں جو زمین لی گئی، اُس کی قیمت اصل قیمت سے دس پندرہ گنا زیادہ دی گئی تھی۔

## قانونی حقوق میں فاتح اور مفتوح دونوں برابر:

قانونی حقوق میں سب سے ضروری حق، قصاص کا حق ہے، یعنی خون کے معاملے میں فاتح اور مفتوح کے حقوق برابر سمجھے جائیں، اسلام نے نہایت فیاضی سے اس معاملے میں بھی مساوات کا حق قائم رکھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں اُس کے ایک چار ہزاری امیر ملک تعیق بن جامدار نے اپنی جاگیر بدایوں میں ایک غریب فرّاش کو کوڑوں سے اتنا پٹوایا کہ وہ مر گیا، اُس کی بیوی دربارِ شاہی میں دادخواہ ہوئی، ثبوتِ جرم کے بعد سلطان نے اپنے امیر کو اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ بھی مقتول فراش کے پاس جا پہنچا، اُس کے بعد اُس کی لاش بدایوں کے دروازے پر لٹکوا دی گئی۔

شہنشاہ جہانگیر کے عہد کے مشہور امیر خان عالم کے بھتیجے ''ہوشنگ'' نے ایک غریب کو مار ڈالا، جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا، خود اس مقدمے کی تحقیقات کر کے اُس کے قتل کا حکم صادر کیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں ایک مشہور اور خاندانی امیر سید کبیر بارہہ ایک راجپوت کے قصاص میں قتل کیا گیا۔

(ابھی ماضی قریب میں شاہِ سعودی شیخ سلمان نے اپنے کسی رشتہ دار کو قصاص میں قتل کروایا، یہ بھی بلا امتیاز وغیر جانب داری کے ساتھ انصاف کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔ اور ویسے بھی قصاص جبر وتشدُّد سے بھری، اور لحہ بہ لحہ موت کے منھ میں جا رہی دنیا کے لیے ایک حیات وزندگانی کا پیغام ہے، میرے پروردگار کا کلام خوب سچا کلام ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يآ اُوْلِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ – اور اے عقل رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی (کا سامان ہے) اُمید ہے کہ تم (اس کی خلاف ورزی سے) بچو گے۔)

قصاص کے علاوہ دیگر مقدمات دیوانی وفوج داری میں بھی فاتح ومفتوح کی کوئی تمیز نہ تھی۔ علی العموم بادشاہ بھی دن میں ایک مرتبہ دربارِ عام کیا کرتے تھے، اور اُس میں بلا کسی روک ٹوک کے ہر ادنیٰ واعلیٰ شخص کو حاضر ہو کر دادخواہی کی اجازت تھی، کسی قسم کے انصاف کے واسطے کورٹ فیس، وکیل، تحریری درخواست وغیرہ کی ضرورت نہ تھی۔ (جس ہندوستان میں مسلم بادشاہوں کے عدل وانصاف کا اعتراف خود متعصب وجانب دار غیر مسلموں نے کیا، اور مجبور ہو کر اپنی تحریروں میں مسلم شاہوں کے عدل وانصاف کی داستانوں کو چھیڑا، آج اُسی ہندوستان کی عدالتوں سے انصاف کی دیوی رخصت ہو چکی ہے، عدل وانصاف کا جنازہ نکالا جا چکا ہے، ایک ہلکے سے مقدمے کے لیے بھی سالہا سال تک انتظار کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ مدعی ومدعیٰ علیہ اس دنیا سے سدھار جاتے ہیں، اور پھر کہنا پڑتا ہے کہ):

"فیصلہ آتے آتے گزر گئے وہ!"

سلطان غیاث الدین بلبن اپنے بیٹوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کیا کرتا تھا کہ <u>اگر تم عاجزوں پر کسی طرح کا ظلم روا رکھوگے، تو میں تمہیں بھی اس کی سزا دوں گا۔</u> (آج ہمارے لیڈروں اور امیروں کا حال یہ ہے کہ اُن کی اولاد اپنے آپ کو ہر طرح کے قانون سے بالاتر سمجھتی ہے، اور جو جی میں آتا ہے کر گزرتی ہے، اُس پر نہ مقدمہ درج ہوتا ہے، نہ اس کے خلاف مظلوم کی عدالت میں کوئی شنوائی ہوتی ہے، اور خود لیڈر یا امیر اپنی اولاد کو رسمی مقدمے سے بری کرنے یا ضمانت دلانے کے لیے کوشاں رہتا ہے، اُس پر مستزاد یہ کہ "انصاف کی دیوی" مظلوم کو نظر انداز کرتے ہوئے، اُس کی ضمانت بھی بہت جلد منظور کر لیتی ہے، اور کیوں منظور نہ ہو، کہ):

"ننگے ایک حمام میں سب ہیں!"

شیر شاہ سوری کا مقولہ ہے کہ <u>عدل تمام فضائل میں ایسا محمود ہے کہ سلاطینِ اسلام اور غیر اسلام سب</u>

کو پسند ہے، کوئی طاعت عدل کے برابر نہیں، کفر واسلام دونوں عدل کے مستحق ہیں۔ (شیر شاہ سوری کا مذکورہ مقولہ گویا آیتِ کریمہ: ﴿اعدلوا هو أقرب للتقوىٰ﴾ کی ہی تفسیر ہے۔)

اکبر اعظم نے ہندوؤں کے مقدمات کے فیصلے کے واسطے برہمنوں کو مقرر کیا تھا۔

## جہانگیر کی زنجیرِ عدل:

جہانگیر نے تخت پر قدم رکھ کر سب سے پہلا حکم یہ صادر کیا تھا کہ ایک زنجیر تیار کی جائے، اور اُس کا ایک سرا قلعۂ آگرہ کے شاہ برج پر لٹکایا جائے، دوسرا دریائے جمنا کے کنارے ایک سنگین میل سے باندھ دیا جائے، اور تمام ملک میں منادی کردی جائے کہ اگر حکامانِ عدالت کسی مظلوم کی فریاد نہ سُنیں، یا مُستغیث کا اطمینان اُن کے فیصلے سے نہ ہو، تو اُس کو لازم ہے کہ اِس زنجیر کو ہلائے، اُس کی فریاد سنی جائے گی، اِس زنجیر کا نام ''زنجیرِ عدل'' تھا۔

شاہ جہاں کی طرح منتظم بادشاہ مغلوں میں نہ ہوا، اُس کے عہد میں عدالتوں میں پورے طور سے انصاف کیا جاتا تھا۔ اہالیانِ دربار اور عوام میں کوئی فرق نہ تھا۔

## سب کا ساتھ سب کا وِکاس:

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عدل وانصاف کے بارے میں ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیّاح اپنے سفرنامے میں دربارِ عام وخاص کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اس موقع پر مستغیث جو عرضیاں پیش کرتے ہیں وہ تمام وکمال بادشاہ کے ملاحظہ اور سماعت میں آتی ہیں، اور بادشاہ بذاتِ خود مستغیثوں سے دریافتِ حال کرتا، اور اکثر ستم رسیدہ لوگوں کو فوراً داد دیتا ہے، اور ہفتے میں ایک دن خلوت میں کامل دو گھنٹے تک ایسے دس غربا کی عرضیاں سنتا ہے، جو مستغیثوں میں سے چُن لیے جاتے ہیں، اور جن کے پیش کرنے کا کام ایک نیک، دولت منداور مُسن (عمر دراز) شخص کے سپرد ہے، اور ایک دن عدل وانصاف کے کمرے میں جس کو ''عدالت خانہ'' کہتے ہیں، دو بڑے قاضیوں کے ساتھ بیٹھ کر دادرسانی کرتا (ہے)، اور اس میں کبھی ناغہ نہیں دیتا۔ اِس سے بخوبی عیاں ہے کہ ایشیائی بادشاہ جن کو ہم اہلِ یورپ جاہل اور ناتراشیدہ خیال کرتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنی رعایا کی داددہی اور انصاف رسانی میں جو اُن پر واجب ہے، غفلت نہیں کرتے۔

یہی سیاح جب سفر کشمیر میں بادشاہ اورنگ زیب کے ہم راہ، اپنے آقا کے ساتھ گئے، تو وہاں کا حال

لکھتے ہیں کہ ہم اپنی حاجت روائی لوٹ کھسوٹ سے بھی نہیں کر سکتے ہیں، کیوں کہ ہندوستان میں ایک ایک بِسوہ (ایک بیگھے کا بیسواں حصہ) زمین خالصہ شریفہ (سرکاری زمین جس میں کسی اور کا حق نہ ہو) سمجھی جاتی ہے، اور رعیت پر دست درازی اور تعدّی (ظلم وزیادتی) کرنا گویا بادشاہ کے مال میں دست اندازی کرنا ہے۔

ہندوستان میں (مسلم حکومت کے خاتمہ کے) کئی برسوں بعد اب یہ تجویز پیش ہے کہ ایگز کیوٹیو (عالمانہ) اور جوڈیشل (عدالتی) اختیارات ایک حاکم کے اقتدار سے نکال کر علیحدہ علیحدہ حکام کے سپرد کرنا چاہیے، یہ دونوں اختیارات ایک حاکم کے سپرد ہونے سے جس طرح اکثر موقعوں پر انصاف کا خون ہوتا ہے، وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے عہدِ حکومت میں اِن دونوں محکموں کو بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا، یعنی قاضیوں اور مفتیوں کو صوبہ داروں کے اقتدار سے نکال کر مقدماتِ جزئی اور کلی میں خودمختار کر دیا، اور اِس کل محکمہ کا افسر قاضی عبدالوہاب احمد آبادی کو مقرر کر کے "قاضی القضاۃ" کے نام سے موسوم کیا، اورنگ زیب کی وفات تک یہ محکمہ صوبہ داروں اور حکامِ ضلع کی ماتحتی سے آزاد رہا۔

سن ۱۰۸۲ء میں اورنگ زیب عالم گیرؒ نے ایک نیا حکم جاری کیا تھا کہ جس شخص کو سرکارِ شاہی پر کسی قسم کا دعویٰ ہو، وہ نہایت آزادی سے وکیلِ شاہی کے مقابلے میں اپنا دعویٰ عدالت میں رجوع کر سکتا ہے، حکامِ عدالت کے نام ہدایت جاری ہوئی کہ اگر اُن کی عدالتوں میں اس قسم کا کوئی دعویٰ دائر ہو، تو بلا رُو رعایت اُس کا فیصلہ کریں، اگر دعویٰ ثابت ہو، تو سرکارِ شاہی سے اُس کا روپیہ ادا کیا جائے، تمام صوبوں کے صدر مقاموں اور بڑے بڑے شہروں میں شاہی وکیل متعین کیے گئے کہ ہمیشہ قاضی کی عدالت میں حاضر رہیں۔

## بِن سیوہ کے میوہ:

معاشرت کے تمام اُمور میں ہندو بھی مسلمانوں کے برابر حق دار سمجھے جاتے تھے، بخشش، سخاوت، خیرات ومبَرّات میں نہ صرف بادشاہِ وقت بل کہ عام مسلمانوں کی نگاہوں میں بھی ان کو مساویانہ درجہ حاصل تھا، دربار میں لیاقت کے بموجب اُن کے ساتھ اعزاز کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔

سلطان سکندر لودھی نے جس کے تعصب کی بہت سی حکایتیں مشہور ہیں جہاں مسلمانوں کو بڑی بڑی جاگیریں مرحمت کیں، وہاں ہندوؤں کو بھی جنہوں نے اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی، جاگیریں عطا کیں۔

جب شیر شاہ سوری نے اپنے عہدِ سلطنت میں رہتاس گڑھ (پنجاب) سے ستار گاؤں (بنگالہ)

تک، آگرہ سے برہان پور تک، آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک، اور لاہور سے ملتان تک چار بڑی سڑکیں بنوائیں، تو ہر سرائے میں جہاں مسلمانوں کے واسطے ہر قسم کی آسائش کا سامان مہیا کیا گیا، وہاں ہندوؤں کے واسطے بھی علیحدہ مکانات بنوا کر ایک برہمن کو متعین کیا تھا، اُس کا فرض تھا کہ ہندو مسافروں کے پینے کے واسطے ٹھنڈا پانی اور نہانے کے واسطے گرم پانی تیار رکھے، بچھونے بچھانا، رسوئی بنانا، گھوڑے وغیرہ کے واسطے دانہ اور گھاس کا انتظام کرنا بھی اُسی کے متعلق تھا۔ ہندو مسافروں کو کھانے پینے کا کچا سامان اور مویشی کے لیے بچالی (ایک قسم کی گھاس جو گھوڑے کے تھان پر بچھائی جاتی ہے)، دانہ وچارہ مفت سرکار شاہی سے ملتا تھا، چاروں سڑکوں پر سترہ سو سرائیں تھیں، اور ہر سرائے میں یہ انتظام کیا گیا تھا۔

شیر شاہ کے بعد سلیم شاہ نے باپ کے عہد کی ہر سرائے میں ایک ایک خیرات خانہ جاری کیا، جس سے فقیروں کو اس قدر کھانا دیا جاتا تھا، جو اُن کے واسطے کافی ہوتا تھا۔

## ہندو عالموں اور پنڈتوں کا شاہی اعزاز:

شہنشاہ اکبر کے دربار میں جہاں بڑے بڑے عالم فاضل اور باکمال مسلمان جمع تھے، وہیں بڑے بڑے قابل اور نامور پنڈتوں کو وہی اعزاز اور رتبہ حاصل تھا، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ہندو علما کے حسبِ ذیل نام شمار کیے ہیں: ''مہادیو، بھیم ناتھ، بابا بلاس، نراین سیوجی، مادھو، رام بھدر، سری بھٹ، مادھوسرستی، جدروپ، بشن ناتھ، مدسوون، رام کشن، نارائن اسرم، بلبھدر مصر، ہنرجی سور، باسدیو مصر، وانو درہٹ، باہن بھٹ، رام تیرتھ، بدہ نواس، نرسنگ، گوری ناتھ، برم اندر، گوپی ناتھ، بجی سین سور، کشن پنڈت، نہال چند، بھٹا چاریہ، کاشی ناتھ۔''

جہانگیر کے دربار میں ''بھٹا چاریہ بنارسی، پھتان مصر، جدوپ سناسی، جوتک رائے منجم'' کو بڑا اعزاز حاصل تھا۔

شاہ جہاں کے عالی شان دربار میں ''ہرناتھ'' نامی ہندو فاضل کو ''مہاپاتر'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا، اسی طرح ''جگناتھ'' نامی ہندو فاضل ''مہا کب رائے/ ملک الشعراء'' سے موصوف تھا۔

اورنگ زیب عالم گیرؒ کے دربار میں ''سُندر'' نامی برہمن بڑا ہوشیار وفہیم تھا، جو ''مہا کب رائے/ ملک الشعراء'' کے خطاب سے موصوف تھا۔ غرضیکہ کوئی اسلامی دربار ایسا نہ تھا جس میں ہندو فاضل اعزاز وتوقیر کے ساتھ موجود نہ ہو۔

## ہندوؤں کے لیے شاہی جاگیریں:

مسلمان بادشاہوں نے جس قدر جاگیریں ہندوؤں کو مرحمت کی تھیں، اُن میں سے بہت سی اس وقت تک موجود ہیں، جس کی تصدیق ہر ضلع کے رجسٹر معافیات سے ہوسکتی ہے۔

## ہندوؤں کے لیے شاہی لنگر:

محمد عادل شاہی والی بیجاپور کے عہد میں مسجدوں کے لنگروں سے جہاں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا ملتا تھا، وہیں ہندو محتاجوں کو خشک غذا دی جاتی تھی، ہر شخص کو حسب ذیل جنس ملتی تھی:

آرد۔ گندم۔ چاول۔ دال۔ گھی۔ نقد برائے لکڑی و مصالح۔

مساجد میں جہاں مسلمانوں کے واسطے پانی کی سبیل ہوتی تھی، اُسی کے قریب ایک سبیل ہندوؤں کے واسطے بھی لگائی جاتی تھی، جس میں ایک برہمن پانی پلانے کے واسطے نوکر ہوتا تھا۔

ایک روز محمد عادل شاہ بیجاپور میں شام کے وقت اپنے قصر کی چھت پر کھڑا تھا، چاروں طرف مکانوں سے دھواں نکلتا معلوم ہوتا تھا، لیکن ہندوؤں کے محلّہ ''بہمن پلی'' سے دھوئیں کا نشان نہ دکھائی دیا، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ اس محلے کے ہندو برہمن صرف ایک ہی مرتبہ دوپہر کو کھاتے پکاتے ہیں، بادشاہ نے اسی وقت اُن برہمنوں کے وظائف مقرر کردیئے۔

## ہندوؤں کے لیے دھرم پورہ اور جوگی پورہ:

بادشاہ اکبر نے شہروں اور منزلوں میں جابجا (مسلمانوں کے ٹھہرنے کے لیے) ''خیر پورہ''، اور (ہندوؤں کے ٹھہرنے کے لیے) ''دھرم پورہ'' کے نام سے دو دو مکانات بنوادیئے تھے، جن میں ہر قسم کا سامانِ آسائش سرکارِ شاہی سے ملتا تھا، اور جب آگرہ کے دھرم پورہ میں جوگی بکثرت آنے لگے، تو اُن کے واسطے ایک اور مکان بنوا کر اُس کا نام ''جوگی پورہ'' رکھ دیا۔

## ہندوؤں سے برادرانہ سلوک:

شاہانِ وقت کے علاوہ مسلمان امرا بھی ہندو مسلمان، دونوں کے ساتھ یک سا سلوک کرتے تھے۔ معاشرت میں ہندو مسلمانوں میں کوئی تمیز نہ تھی، بل کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی ہندوؤں سے برادرانہ سلوک شروع کردیا تھا۔

## ہندوؤں کے ملکی حقوق:

یہ ایک فطرتی میلان ہے کہ فاتح اور مفتوح قوم میں ہمیشہ عداوت ہوا کرتی ہے، اسی وجہ سے دنیا کی تمام فاتح قوموں نے اپنی مفتوح قوموں کو محکومیت کے درجے سے اوپر نہیں بڑھنے دیا۔ تہذیب وشائستگی کے لیے مشہور یورپ کی مہذب سلطنتوں نے بھی فاتح اور مفتوح کے ملکی حقوق میں حدِ فاصل قائم کر رکھی ہے، یعنی فلاں فلاں حقوق اور عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں، مفتوح قوم کا کوئی شخص خواہ کسی قسم کی لیاقت کیوں نہ رکھتا ہو، وہ حقوق یا عہدے نہیں پاسکتا، برخلاف اس کے صدیوں پیشتر اسلامی حکومتوں نے اپنی مفتوح قوموں کو اس فیاضی سے انتظامِ سلطنت میں شریک کر رکھا تھا کہ اُن میں اور فاتح قوم کے افراد میں کچھ تمیز نہ تھی، ہر شخص بلا خیالِ نسل ورنگ اعلیٰ سے اعلیٰ ملکی عہدے پر مامور ہوسکتا تھا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے عربوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کو فتح کیا، سندھ کے برہمنوں نے جب اطاعت قبول کر لی، تو محمد بن قاسم (فاتح سپہ سالار) نے "برہمن آباد" پر فوج مقرر کر کے اُس کا اہتمام اُنہیں کے سپرد کیا، اور انہیں برہمنوں میں سے لائق اشخاص کو منتخب کر کے مجلسِ شوریٰ کا ممبر مقرر کیا۔

خاص ہندوستان میں غلام، خلجی، تُغلق، لودھی خاندانوں کے فرماں رواؤں کے دور میں وصولِ مال گزاری کا، ہندوؤں کے عہد کا وہی پرانا طریقہ قائم رکھا گیا، لہٰذا مال اور حساب کے محکموں میں بہت سے ہندو ملازم تھے۔

## ہندوؤں کی تعلیم کا نظم:

سب سے پہلے سکندر لودھی نے ہندوؤں کو فارسی پڑھا کر، ملکی عہدوں پر سرفراز کیا۔ اس کے بعد وہ ملازمتِ شاہی میں برابر ترقی کرتے رہے۔

## ہندوؤں کی مالی حالت:

شیر شاہ کے عہد میں بہت سے ہندو دیگر ملکی عہدوں پر فائز تھے، اور مسلمانوں کے مقابلے میں جو عام طور سے فوجی خدمات پر مامور ہوتے تھے، اُن کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔

## ہندوؤں کے لیے اعلیٰ عہدے:

ہندوستان میں سب سے زیادہ اکبر اعظم نے ہندوؤں سے اپنائیت پیدا کی، اور اُن کو اعلیٰ ملکی عہدوں پر سرفراز کیا، اکبر کے دور میں ہم قوم اور غیر قوم کا فرق بالکل نہ رہا تھا، سپہ داری اور ملک داری کے جلیل القدر عہدے مسلمانوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے، دربار کی صف میں دو ہندو ایک مسلمان، یا دو مسلمان ایک

ہندو برابر نظر آنے لگے۔ اور ہندوؤں کے ساتھ اس قسم کی فیاضی کا برتاؤ صرف اکبر تک ہی مخصوص نہیں، بل کہ سلطنتِ مغلیہ کے اخیر عہد تک ہندو برابر ترقی کرتے رہے، جہانگیر، شاہ جہاں اور عالم گیر نے (جنہیں نہایت متعصب خیال کیا جاتا ہے) ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا۔

## ہندو مسلمان بھائی بھائی:

شاہ جہاں کے عہد میں ہندو مسلمان بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے رفیقِ حال تھے، بادشاہ کا ایک وزیر مسلمان تھا، تو دوسرا ہندو، ایک فوج کا افسر پٹھان یا مغل ہوتا، تو دوسری کا راجپوت، یہ اُس پر دم دیتا، وہ اِس پر جاں نثار کرتا تھا۔

## اورنگ زیب عالمگیرؒ پر غلط الزام:

اورنگ زیب عالم گیر پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو بادشاہی ملازمت سے باز رکھا، سراسر غلط بیانی ہے، بل کہ اُن کے عہد میں ہندو بڑے سے بڑے عہدے پر سرفراز تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے حقوق میں کسی قسم کا فرق نہ تھا، ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ: مغل بادشاہ اگرچہ مسلمان اور بُت پرستوں کے مخالفِ مذہب ہیں، لیکن بہت سے راجاؤں کو ہمیشہ اپنی ملازمت میں اور اکثر اپنے ساتھ رکھتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسے کہ اپنے مسلمان امیروں اور سرداروں کے ساتھ، اور مسلمان امیروں کی مانند اِن کو بھی فوج کی حکومتوں اور سرداریوں پر مقرر و مامور کرتے ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ کے قول کے مطابق اورنگ زیب رحمہ اللہ کے ''فرامین ومُراسَلات'' میں مذہبی آزادی کا وہ جامع اُصول درج ہے، جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔ (اس جامع اُصول کی محض ایک مثال ہی سے عدلِ عالمگیری کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ) عالم گیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازم جو تن خواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے، اس علت میں برخاست کردیئے جائیں کہ وہ آتش پرست ہیں، اور ان کی جگہ کوئی تجربہ کار اور معتبر مسلمان مقرر کیا جائے، کیوں کہ قرآن شریف میں آیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَآءَ﴾؛ یعنی اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ نے عرضی پر تحریر فرمایا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے، اور نہ اِن معاملات میں تعصُّب کو جگہ مل سکتی ہے، اور اس قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾؛ تم کو تمہارا دین اور ہم کو ہمارا دین۔ (عالمگیری انصاف کے لیے اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہوسکتی ہے!)

## اورنگ زیب کی صحیح پہچان حضرت تھانوی کی زبان سے:

حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا: لوگ عالمگیر رحمۃ اللہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کیا ہے، یہ بالکل غلط ہے، عالمگیر پابندِ شرع تھے۔ بارہ ہزار متن احادیث کے حافظ تھے،قران لکھ لکھ کر ہدیہ کرکے گذارا کرتے تھے، اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے ان کے سامنے۔ **لا اکراہ في الدين** کا حکم موجود تھا وہ اس کے خلاف کیوں کر کر سکتے تھے۔ (بحوالہ شاہراہِ علم، فقہ المناسبات)

## مغل دورِ حکومت کے ہندو اُمراء:

مغل بادشاہ اکبر کے دور میں کل ۴۱۶/عہدے تھے، جن میں سے ۳۵۳/ پر مسلمان، اور ۶۳/ عہدوں پر ہندو فائز تھے۔

شہزادہ جہانگیر کے دورحکومت میں ۴۶/ ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

شاہ جہاں کے دور میں کل ۶۲۲/عہدے تھے، جن میں سے ۴۶۷/ پر مسلمان، اور ۱۵۵/عہدوں پر ہندو متمکن تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمہ اللہ کے دورِ حکومت میں ۶۷/ ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

(یعنی صرف اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں کل ۳۳۱/اعلیٰ عہدوں پر مشہور ہندو راجہ ومہاراجہ مقرر تھے، بقیہ دیگر چھوٹے موٹے مختلف عہدوں پر بھی بے شمار ہندو متمکن تھے، مگر اُن کو تاریخ میں جگہ نہیں دی گئی، اسی طرح دیگر مسلم بادشاہوں کے عہد میں بھی بے شمار ہندو مختلف عہدوں پر فائز رہے ہوں گے، اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔)

## مشہور اور اعلیٰ عہدوں کے نام:

ہفت ہزاری......سات ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

شش ہزاری...... چھ ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

پنج ہزاری...... پانچ ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

چہار ہزاری......چار ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

سہ ہزار و پانصدی......ساڑھے تین ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

سہ ہزاری......تین ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

دو ہزار و پانصدی......ڈھائی ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

دو ہزاری......دو ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

ہزار و پانصدی......ڈیڑھ ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

ہزاری......ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ۔

پانصدی......پانچ سو سپاہیوں کا دستہ۔ (یہ سب اُس زمانے کے اعلیٰ و ممتاز عہدے تھے۔)

## ہندؤو کے ساتھ اولاد کی طرح برتاؤ:

سلطنتِ مغلیہ کے فرماں رواؤں کا برتاؤ اپنے امیروں کے ساتھ اولاد کی طرح تھا، بعض بعض امیروں (راجاؤں) نے کئی کئی مرتبہ بغاوت کی، مگر جب دربار میں شرمندگی اور عفو و تقصیر کی التجا کی، تو ہمیشہ قصور معاف ہو گیا، اور پھر سے ذمہ داری کی خدمتوں پر مامور کر دیا گیا۔

## دکن مسلم سلطنت میں ہندؤوں کی ملازَمت:

دکن میں مسلمانوں کی جدا سلطنت قائم ہوتے ہی ہندو کثرت سے ملازمت میں داخل ہونے لگے۔ شمالی ہند اور دکن میں اگر چہ اکثر برہمن طبابت اور نجوم کے وسیلے سے مسلمان بادشاہوں اور امیروں کی صحبت میں رہتے تھے، لیکن شاہی ملازمت کو ذلیل سمجھ کر اس سے پرہیز کرتے تھے، "کانکو بہمن" شمالی ہندوستان اور دکن میں پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے مسلمان بادشاہوں کی نوکری اختیار کی، اور اس کے بعد برابر اُس کی (بہمنی) قوم ترقی کرتی گئی۔

صاحبِ تاریخِ فرشتہ کا بیان ہے کہ اب تک (یعنی ۱۰۱۶ء تک) کل شاہانِ دکن کے دفتروں میں برہمن ہی برہمن (عہدوں پر) نظر آتے ہیں، فیروز شاہ بہمنی نے اپنے عہد (سن ۸۰۰ء سے سن ۸۲۵ء) میں بہت سے برہمنوں کو اُموراتِ ملکی میں صاحبِ دخل کر کے امرائے کبار میں شامل کیا۔

ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور نے (سن ۹۴۱ھ سے سن ۹۶۵) برہمنوں کی خاطر سے کل دفاتر شاہی سے فارسی زبان کو خارج کر کے ہندی زبان کو رائج کیا، اور برہمنوں کو بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا۔ غرضیکہ مسلمانوں کے اخیر عہد تک تمام شاہی دفتروں اور وصولِ مال گزاری کے عہدوں پر برہمن بلاشرکتِ غیرے قابض رہے۔

مسلمانوں کے بعد مرہٹوں کے زمانے میں بھی برہمنوں کا وہی دور دورہ رہا، اور کچھ عرصے تک وہ کل ہندوستان کے مالک بنے رہے، اور آج کل (یعنی ۱۹۱۰ء میں) بھی صوبۂ بمبئی اور ریاست حیدرآباد اور بڑودہ وغیرہ کی سرکار و دربار میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز ہیں، اور محکمۂ حساب و کتاب میں تو ایسے حاوی ہیں کہ دیگر قوموں کو اس محکمے میں نوکری کا ملنا دشوار ہو گیا ہے۔

(آج بھی برہمن طبقہ خصوصاً، اور چھتری، ویش طبقہ عموماً پورے ملکِ ہندوستان کے مشہور کاروباروں پر چھایا ہوا ہے، اور موجودہ سیاست میں تو صرف اُن کا ہی طوطی بول رہا ہے، اور روزانہ اَیری غیری نتھّو خیری میڈیا پر آپ مودی و یوگی راج کی اَینڈی بَینڈی حرکتیں دیکھ ہی رہے ہیں۔ مسلمانوں کا اللہ ہی بھلا کرے!)

## دکن میں مرہٹوں کا عروج:

دکن میں سب سے پہلے ملک عنبر نے مرہٹوں کو اپنے سواروں میں بھرتی کرنا شروع کیا، اس کی فوج میں ''لکھ جی'' نامی ایک سردار نے ایسی ترقی پائی کہ دس ہزار سواروں کی سرداری کے منصب پر سرفراز ہو گیا۔ اس کے بعد ''مالو جی'' شیواجی کا دادا، اسی سرکار میں پنج ہزاری (پانچ ہزار سواروں کی رسال داری) پر مامور ہو کر صاحبِ جمعیت ہوا۔

## مسلم سلطنت کا زوال:

اس کے بعد عادل شاہی حکومت کی غفلت سے ''شیواجی'' کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا، اور مسلمانوں کی اِس ناعاقبت اندیشی و بے جا فیاضی کا جو نتیجہ ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ جس دن سے سلاطینِ اسلام نے ہندو اور مسلمانوں کی تفریق کرنی شروع کی، اُسی دن سے سلطنت کا تنزُّل شروع ہو گیا، لیکن یہ خیال محض تاریخی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

اکثر مؤرخین کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کا اپنی مفتوح قوم کو اُمورِ سلطنت میں دخیل کر کے محکومیت کے درجے سے بڑھانا اُن کی سلطنت کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔

## تنزُّل بھی تعصُّب سے پاک:

اسلامی سلطنت کے تنزُّل کے زمانے میں بھی ہندوؤں سے کسی قسم کا تعصُّب نہیں برتا جاتا تھا، وہ انتظامِ سلطنت میں پورے طور سے دخیل تھے، مثلاً: ''راجہ رتن چند، راجہ نول رائے، مہاراجہ اجیت سنگھ راٹھور، دھیراج راجہ جے سنگھ سوائی، راجہ گُرودھر بہادر'' وغیرہ مکمل طور سے اُمورِ مملکت میں دخیل تھے۔

# ہندو راجاؤں کے دیئے گئے عہدے ومناصب

## راجہ اُدے سنگھ راٹھور عرف موتہ راجہ:

راجہ مالدیو، فرماں روائے جودھپور کا بیٹا، جو جاہ وحشمت، شوکت وسطوت اور امارتِ لشکر میں جملہ راجگانِ ہندوستان میں ممتاز تھا، اس کے بڑے بیٹے راجہ اُدے سنگھ راٹھور کے ساتھ بادشاہ اکبر نے ایسی دل رُبائی ودِل داری کی کہ اکبر کی محبت اس کے دل میں گھر کرگئی، اُس نے اکبر کی محبت میں اپنے عظیم الشان وتاریخی خاندان کی رِیت رسوم، مبارک ونامبارک سب باتوں سے قطع نظر کرکے ۹۹۴ھ میں اپنی لائق وفائق بیٹی "مان متی"، جو "جگت گسائین" کے نام سے مشہور تھی، کی شادی ولی عہد سلطنت شاہزادہ سلیم (جہانگیر) سے کردی، اُس دن سے یہ عظیم الشان خاندانِ راٹھور مغلیہ خاندان کی محبت اور وفاداری اور جاں نثاری کا دَم بھرنے لگا، اِس شادی کے بعد راجہ اُدے سنگھ منصب ہزاری پر سرفراز ہوا، اور وطن کی حکومت بطورِ جاگیر کے قرار پائی۔

راجہ کی بیٹی "جگت گسائین" جو عام طور سے "جودہ بائی" کے نام سے مشہور ہے، نہایت دانش مند، نیک طینت، خوش بیان، شیریں کلام، حاضر جواب، اور باسلیقہ بیگم تھیں، اِنہیں کے بطن سے سن ۹۹۹ھ یا سن ۱۰۰۰ھ میں بمقام لاہور، شاہزادہ خرّم (شاہ جہاں) پیدا ہوئے۔

## مذہبی رُسومات کی اجازت وآزادی:

قلعہ اکبرآباد (آگرہ) اور فتح پور سیکری میں جودہ بائی کے عالی شان محلات اس وقت تک موجود ہیں، قلعہ کے محل میں ایک طرف پر کہتا را، اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک پائے جاتے ہیں، جس سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ محلاتِ شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کی رسومات اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔

(طوالت کے پیشِ نظر، اب آگے صرف راجاؤں کے منصب، خطاب، انعام اور خدمت کو ہی لکھا جاتا ہے۔) (ع۔م)

## راجہ آسکرن کچھواہا:

منصب: عہدِ اکبری میں منصب ہزاری ذات، اکبرآباد کی صوبہ داری،

خطاب: راجہ۔

خدمت: اعظم خان کوکہ کے ساتھ دکن کی مہم، راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ صوبہ بہار میں تعیین۔

### راجہ انوپ سنگھ بڑ گوجر (آنی رائے سنگھ ولن):

منصب: عہدِ اکبری کے اخیر میں خواصوں کا سردار، عہدِ جہانگیر میں امرائے خاص میں شمولیت، عہدِ شاہجہانی میں منصب سہ ہزاری، منصب ہزار و پانصدی۔

خطاب: راجہ۔

انعام: خلعت وجمدھر مرصع۔

خدمت: مہمات دکن وغیرہ۔

### راجہ اُداجی رام:

منصب: امرائے تیموریہ کے زمرے میں شامل، منصب چہار ہزاری ذات، منصب پنج ہزاری ذات، اس کے انتقال کے بعد قدرداں بادشاہ (شاہ جہاں) نے اُس کے خوردسال بیٹے "جگ جیون" کو منصب سہ ہزاری ذات پر مقرر کیا۔

خطاب: راجہ۔

انعام: چالیس ہزار روپیہ نقد۔

خدمت: مہم دولت آباد۔

### راجہ انرودہ گوڑ بن راجہ بیتھلداس گوڑ:

منصب: ہزار و پانصدی ذات، (۱۹ر جلوس شاہ جہانی)، منصب سہ ہزاری ذات، و منصب سہ ہزاری و پانصدی ذات

خطاب: راجہ۔

انعام: نقارہ، اسپ وفیل۔

خدمت: قلعہ رن تھنبور کی قلعہ داری، بادشاہ عالمگیر کی تخت نشینی (۱۰۶۹) کے بعد مہم شجاع۔

### راجہ امر سنگھ نروری:

منصب: دربارِ شاہ جہانی میں منصب ہزاری ذات و شش صد سوار، منصب ہزار و پانصدی ذات، و ہزار سوار۔

خطاب: راجہ۔

انعام: نرور کے قرب و جوار کا علاقہ جاگیر میں مرحمت ہوا۔

خدمت: قلعہ داریٔ نرور، مہم قندھار، مہم بلخ و بدخشان در معیت اورنگ زیب، صوبۂ دکن کی کمک برائے اورنگ زیب پر مامور، مہم آسام۔

# ملک کے بدلتے منظر نامہ میں مسلمانوں کا طرزِ فکر وعمل

مفتی عبدالقیوم صاحب مالیگانوی (استاذ جامعہ اکل کوا)

اِس وقت ملک کی باگ ڈور اور لگام ایسے افراد اور عناصر کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے؛ جن کے اقوال وافعال سے اسلام اور مسلم دشمنی عیاں ہے۔ جن کے اقتدارِ اعلیٰ میں اکثریت سے آنے کی وجہ سے بہ ظاہر ملک اور اس کے دستور کی سالمیت پر خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں، جن کی سوچ وفکر سے اکثریتی رجحانات ظاہر ہو رہے ہیں، ایسے میں مسلمان بڑے ہی سراسیمگی اور اضطرابی کیفیت کا شکار ہیں۔ چناں چہ ان تغیر پذیر حالات میں ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس ملک میں کیسے رہنا ہے؟ اس کے لیے چند بنیادی امور کو مدنظر رکھ کر بصیرت کے ساتھ غور فکر کر کے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا، نہ صرف ضروری ہے بل کہ اپنے اور اپنی نسلوں کے مستقبل میں ایمان وعقیدہ کی سلامتی کے لیے لازم اور ضروری ہے۔

**سب سے پہلی بات:** یہ ہے کہ مایوسی ہمارے لیے کفر ہے۔ حالات سے مایوس ہونا اور انہیں اعمال کی بجائے اسباب، اقتدار اور حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ جوڑنا عقیدۂ اسلام کے خلاف ہے۔ مایوسی اہل کفر کا شیوہ ہے نہ کہ ہمارا، چناں چہ اللہ رب العزت نے ہمیں مایوسی اور ناامیدی سے بچنے کی تاکید کی اور ارشاد فرمایا:

﴿لَاتَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَايَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ﴾

**دوسری بات:** یہ کہ برسرِ اقتدار پارٹی ملک پر پہلی مرتبہ تخت نشیں نہیں ہوئی، بل کہ اس سے پہلے بھی وہ اقتدارِ اعلیٰ پر آ چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی جیت، ان کے اقتدار سے گھبرانا اور پست ہمتی کا شکار ہونا مسلمان کی ایمانی جرأت اس کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی اس کے عقیدہ میں اس کی گنجائش ہے۔ اس لیے کہ ہمارا ایمان اور عقیدہ یہ ہے کہ ساری کائنات پر حکمرانی خدائے واحد لازوال کی ہے ارشادِ قرآنی ہے:

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

بل کہ یہ وقت حکمران پارٹی کے لیے موقعۂ امتحان اور وقتِ آزمائش ہے کہ وہ کس طرح نعمتِ اقتدار کا حق نبھا کر ملک کی عوام کو اُن کے حقوقِ واجبہ سے سرفراز کرتے ہیں یا پھر ظلم وجور کے راستہ پر چل کر آئندہ اپنے وجود اور اقتدار کو بھی خطرہ میں ڈالتے ہیں۔

تیسری بات جس کا ہمیں ہر وقت استحضار رکھنا ضروری ہے کہ ہمارا نظریہ ملک کا مفاد اور اس کی ترقی ہے۔ ماضی میں بھی ہم نے اِس ملک کو ہر قسم کی ظاہری اور معنوی ترقیات سے ہمکنار کیا تھا، چناں چہ تاج محل کی خوب صورتی ورعنائی، لال قلعہ کی مضبوطی واستحکام اور قطب مینار کی بلندی نے جہاں اس کے ظاہر کو دیدہ زیب اور دلکش بنایا تو وہیں پر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانیت اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی صوفیت نے اس کے باطن کو مہذب اور ایسا لائقِ توجہ بنادیا کہ دیگر علاقوں سے آنے والے زائرین وسیّاح اس کی دونوں قسم کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لہٰذا اب بھی ہمیں سیاسی انسان کی حیثیت سے نہیں، بل کہ سماجی انسان کی حیثیت سے اپنی افادیت اور نافعیت کو ثابت کرنا ہوگا اور موجودہ انسانوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ ہمیں ملک میں بارہویں کھلاڑی کی حیثیت سے نہیں جو گیارہ میں سے کسی ایک کے آؤٹ ہونے کا انتظار کرتا ہے، بل کہ ہمیں اُن گیارہ میں جگہ چاہئے، جن کی اپنی مستقل حیثیت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہمارے پاس دو راستے ہیں ایک تعلیم دوسرا تجارت۔

**پہلا راستہ علم:** جس سے ہمارا عقیدہ بھی متعلق ہے کہ جہالت کے سارے اندھیرے علم کی روشنی سے کافور ہوتے ہیں کیوں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے احکامات تو بعد میں آئے، لیکن زیور علم سے آراستہ ہونے کا حکم پہلی وحی ''اقرأ'' کے ذریعہ پہلے آیا۔

**دوسرا راستہ تجارت:** تو وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سنت ہے کیوں کہ آپ نے بذات خود تجارت کر کے اپنے کفیل اور محسن چچا ابوطالب کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاجروں کو تین مرتبہ برکت کی دعا دی، لہٰذا صداقت وامانت کے ساتھ تجارت کرنے والا تاجر کبھی نقصان نہیں اٹھا سکتا۔

نیز ہمارے پاس تعلیم ہے تو ہم دوسروں کو دینے والے ہیں ورنہ لینے والے ہوں گے۔ کیوں کہ جاہلوں سے کہا گیا کہ: ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ جن کے پاس علم نہیں وہ اہل علم سے پوچھیں۔ جس میں دوسروں کی احتیاج اور ضرورت ہے۔

**تیسری بات:** جو ہمیں بھی اور خصوصاً حکمراں جماعت کو یاد رکھنا چاہئے کہ ملک کی ترقی اور اس کا استحکام ۱۸ر فیصد مسلمانوں کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر ہمیں نظر انداز کیا گیا اور ہمارے حقوق لازمہ اور واجبہ امن و امان، عدل وانصاف، نیز سرکاری وغیر سرکاری ملازمتوں سے محروم کیا گیا تو پھر اکثریتی طبقہ بھی مامون ومحفوظ

نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ تاریخ انسانیت اس بات کی شاہد ہے کہ کسی کا سکون چھین کر خود کا سکون چاہنے والا کبھی پُرسکون نہیں رہا ہے۔ کسی نے اسی بات کو منظوم کرتے ہوئے کہا ؎

جلیں گے ہم تو ؛ جل جائے گا سارا گلستاں مالی
سمجھ مت صحن گلشن میں ، مرا ہی آشیانہ ہے

دنیا میں حکومتیں آتی جاتی رہی ہیں اور رہیں گی ۔حادثات اور واقعات پیش آتے ہیں اور آتے رہیں گے اور اب تک جتنے حوادث و حالات انسانیت پر رونما ہوئے ہیں ان میں سب سے عظیم سانحہ؛ جو پوری ملت اسلامیہ پر بجلی بن کر گرا، بالخصوص صحابہ جیسی اولواالعزم جماعت جس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی اور جس وقت عمر فاروقؓ جیسے شیر دل اور باشعور انسان کے بھی ہوش اڑ گئے ۔اسی وقت مرتدین اور منکرینِ زکوۃ کی جماعت نے مزید انتشار، سخت تفرقہ اور بھونچال پیدا کر دیا اتنے سنگین اور دل دوز حالات میں آج کل کی طرح چوک چوراہوں پر بیٹھ کر صرف تبصرے اور شکوے شکایت سے کام نہیں لیا، بل کہ پیش آمدہ حالات کے سلسلہ میں مضبوط و مستحکم تدابیر، رہنما اصول اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے حالات کا پوری بیدار مغزی کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چناں چہ ابوبکر صدیقؓ اٹھے اور تمام صحابہ کو مسجد نبوی میں مجتمع فرما کر ایک کلیدی اور پُراثر خطاب کیا جو انہیں کی غیرتِ ایمانی اور حمیتِ اسلامی کا حصہ ہے فرمایا: ''اَیَـنْقُصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ'' کہ ابوبکر کے ہوتے ہوئے دین میں کتر بیونت کیسے ہوسکتی ہے؟ گویا کہ امت کو پھر سے مہذب، مرتب اور منظّم کرنے کے لیے کمر بستہ ہوکر دوبارہ کھڑا ہونے کا حوصلہ عطا کیا۔

چناں چہ اس واقعہ کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہمیں مایوسی سے نکل کر ہوش میں آکر حوصلوں کی بلندی اور عزائم کی پختگی کے ساتھ مضبوط تدابیر کے ذریعہ عظمت رفتہ کو واپس لانے اور اپنی ناکامی کو کامیابی سے بدلنے کے لیے ٹھوس لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

تاکہ ملک کی دیگر اقوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہماری تاریخ حالات واقعات اور حوادث زمانہ سے مرعوب اور خوفزدہ ہوکر بیٹھ جانا نہیں ہے۔ یہ ہماری ہی تاریخ ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد بھی ہم مجتمع ہو گئے۔ سقوط بغداد کے بعد بھی ہم نہیں ٹوٹے اور نہ ہی ۱۸۵۷ء کا سانحہ ہمیں ختم کر سکا۔ اور تقسیم ہند کے وقت بھی ہم نے اپنے

آپ کو سنبھالا ۱۹۴۷ء کے بعد بھی ملک میں اپنے وجود کو باقی رکھنے میں کامیاب رہے۔

مذکورہ تمام باتوں کے ساتھ فیصلہ کن بات یہی ہے کہ اگر ہم اللہ کی اطاعت اور اس کی بندگی پر آجائیں، اس کی مرضیات کو اپنی چاہت اور اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں، اسلام کی تعلیمات کو زندگی کے شعبہ میں حرز جان بنالیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ، آپ کی پاکیزہ اور ضرب المثل زندگی کو اپنے اعمال اور احوال سے انسانیت کے سامنے؛ بالخصوص برادران وطن کے سامنے پیش کریں گے تو یقیناً اللہ کی ذات بابرکت ہماری نصرت کے لیے متوجہ ہوگی اور نہ صرف ہمیں عزت اور کامیابی ہی ملے گی، بل کہ اللہ قادر مطلق اسلام دشمن افراد، جماعتوں، تنظیموں کو ہمارا دوست بھی بنائے گا اور اسلام کو تعمیر وترقی کے لیے استعمال بھی کرے گا (وَمَا ذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ)

اس کی روشن مثال تاریخ میں اندلس کی تباہی پھر اس کی نشأۃ ثانیہ ہے، جہاں ہماری ۸۰۰/سالہ زریں وتابناک حکومت تھی۔ جسے تاتاری قوم نے کچل کر رکھ دیا تھا اور یہ سمجھ رہے تھے کہ اندلس سے ہم نے اسلام کو جڑوں سے اکھیڑ دیا ہے، اسلام کا وجود صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے نیست ونابود کر دیا ہے۔ لیکن اللہ رب العزت نے وہاں اسلام کو دوبارہ زندہ اور آباد کرنے کے لیے اس نے تاتاری قوم ہی میں سے ایسے سعادت مند افراد کو جنم دیا؛ جنھوں نے اسلام کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ چناں چہ وہاں دوبارہ اسلام کی شعاعیں اور ایمان کی کرنیں چمکنے لگیں اقبال مرحوم نے اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم؛ جس کی تخریج کا کام امام بخاریؒ نے فرمایا ہے اسی کی تائید کرتی ہے (إن اللّٰہ لیؤید ھٰذا الدین بالرجل الفاسق) کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید اور حفاظت کا فریضہ فاسق و فاجر شخص سے لے سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اصلاح کی فکر کے ساتھ دین کی خدمات کے لیے قبول فرمائے آمین!

☆.....☆.....☆

# علما کی آڑ لے کر دین پر حملے استعماری طاقتوں کا ہتھیار

محمد اسماعیل بدایونی متفرقات *in*TAHAFFUZ' NAVEMBER 2008

علم ایک نور ہے....ایک روشنی ہے....جو اندھیروں میں راستہ دکھاتی ہے...ایک رہبر ہے، جو اچھائی اور برائی سکھاتی ہے...آج علم کی بہاریں چار سو نظر آتی ہیں۔مگر ایک سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے علم کی شمع کس نے روشن کی؟ کس نے انسان کو انسانیت سے روشناس کرایا؟ کس نے زندگی کو رموز زندگی سے آگاہ کیا؟

...دین مصطفوی اور تعلیمات مصطفیٰ نے چند صدیوں میں تاجدار مدینہ ﷺ کے غلاموں نے انسانی معاشرہ کو؛ جو حسن بخشا...انسانی تمدن کو جو نکھار عطا کیا...اور علم کو انسان کے ماتھے کا جھومر قرار دیا...کیا آج تک دنیا اس کی مثال پیش کر سکی ہے۔س''اہل عرب جاہل، اجڈ اور گنوار تھے...وحشی اور خونخوار تھے...نگاہ محمد ﷺ نے ان کے سینوں کو علوم وحکمت سے معمور کر دیا...مقتدی تھے مقتدا بن گئے...پیش رو تھے پیشوا بن گئے...غلام تھے آقا بن گئے...عام تھے خاص بن گئے...جاہل تھے عالم بن گئے...ایک کتاب نہیں، سو کتابیں نہیں، لاکھوں کی تعداد میں وہ کتابیں تصنیف کیں؛ جن کے ایک ایک لفظ میں علم وعرفان کے سمندر سمودئے اور علم وعرفان کے وہ دریا بہائے کہ آج تک انسانیت ان سے استفادہ کر رہی ہے۔

قرآن حکیم نے بارہا علم اور اہل علم کی عظمت کو بیان فرمایا: ﴿یرفع اللّٰہ الذین آمنو منکم والذین اوتواالعلم درجات﴾ (سورۃ المجادلہ ۲۸ آیت ۱۱)

اللہ تعالیٰ ان کے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا ان کے درجات بلند فرمائے گا۔

(قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون. (سورۃ الزمر ۲۳ آیت ۹)

آپ پوچھئے کیا کبھی برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل۔

انما یخشی الله من عباده العلماء (سورۃ فاطر ۲۲ آیت ۲۸)

اللہ کے بندوں میں سے صرف علما ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں۔

﴿وتلک الامثال نضربها للناس وما یعقلها الاالعالمون﴾ (سورۃ العنکبوت ۲۰ آیت ۴۳)

اور یہ مثالیں ہیں، جو ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم۔

صرف آیت قرآنی ہی نہیں، بل کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات سے مسلمانوں کے دلوں میں علم کی محبت کا جذبہ پیدا فرمایا۔ جس کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں نے اپنی زندگیاں علم کے لیے وقف کر دیں۔ انہوں نے اپنی مادی ضروریات سے بے نیاز ہو کر الہامی علم کے نور سے اپنے سینوں کو منور کیا۔ اور اسی الہامی علم کی خوشبوؤں سے اپنے دماغ کو معطر کیا، قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کو اپنے سینوں میں محفوظ کیا، اسے سپرد قلم کیا اور پھر پورے خلوص کے ساتھ اسے ملت کی آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کیا۔

یہ ہی وہ وارثانِ نبوت تھے، جنہوں نے حیات طیبہ کے ہر لمحہ کو اپنے ذہنوں کے صفحات میں محفوظ کیا اور آپ کی زندگی کے ہر ہر لمحہ کا مکمل اور جامع ریکارڈ تیار کیا، جو بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلی آپ کی ہر ادا.....آپ کا ہر عمل...آپ کی مبارک زندگی کا ایک ایک گوشہ پوری دیانت داری سے آئندہ نسلوں کو منتقل کیا۔

قرآن حکیم نے مسلمانوں کو اس کائنات میں غور و تدبر کرنے کا بار بار حکم دیا اور مسلمانوں نے اس ارشاد خداوندی کی تعمیل میں اپنی زندگیاں کائنات کے مخفی رازوں کا کھوج لگانے میں صرف کر دیں۔

اور یہ وہ وقت تھا جو یورپ سائنس کے لفظ سے بھی آگاہ نہ تھا اور پورے کا پورا یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت نہ ان کے یہاں روڈ تھے اور تعلیمی ادارے۔ اگر رات کے وقت کوئی شخص اپنے گھر سے نکلتا تو اپنی ہی غلاظت میں ڈوب جاتا۔

یہ وہ وقت تھا جب اسلامی ممالک میں علم کی ضیا بکھر رہی تھی۔

مسلمانوں نے نہ صرف مدارس قائم کئے' کتابیں لکھیں' بل کہ خلفا، سلاطین اور حکمرانوں کی علم پیروی نے کتابوں سے محبت کو ملت اسلامیہ کی پہچان بنا دیا۔

امرا کی کتابوں سے محبت اور علم پیروی کا یہ حال تھا کہ علما کے ساتھ وزرا بھی علوم کے حصول میں دلچسپی لیتے۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں۔

علما کے ساتھ وزرا، امرا اور سلاطین بھی کتب خانوں اور رصد گاہوں میں جا بیٹھتے۔ حکمت یونان کو جسے دنیا بھول چکی تھی پھر زندہ کیا۔ قرطبہ سے سمرقند تک ہزاروں درس گاہیں قائم کیں' ان میں طلبہ کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بقول ول ڈیوان' جغرافیہ دانوں' مورخوں' منجموں' فقیہوں' (محدثوں' طبیبوں اور حکیموں کے ہجوم کے باعث سڑکوں پر چلنا مشکل تھا (یورپ پر اسلام کے احسانات صفحہ ۱۳۷ از ڈاکٹر جیلانی برق مزید آگے لکھتے ہیں۔

جب شیخ سعدیؒ (۱۲۹۱ئی) بغداد کے دار العلوم نظامیہ میں داخل ہوئے اس وقت زیر تعلیم طلبہ کی تعداد

سات ہزار تھی۔اوراس میں ابھی مزید طلبہ کی گنجائش تھی۔مرزا حیرت اپنی کتاب (حالات سعدی) میں لکھتے ہیں کہ دارالعلوم نظامیہ پورا ایک شہر تھا۔لاتعداد کمرے اور وسیع ہال؛ جس میں دس ہزار انسان سما سکتے تھے۔دارالعلوم میں قرآن وحدیث ُفقہ،فلسفہ، ریاضی ُہیئت اور دیگر علوم کی تدریس کا پورا انتظام تھا۔ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا تھا، جہاں یونانی ُ عبرانی ُلاطینی ُسنسکرت اور فارسی پڑھائی جاتی تھی۔تیراندازی ُتیغ بازی اور گھوڑ سواری کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔

(یورپ پر اسلام کے احسانات صفحہ۱۴۲ بحوالہ معرکہ مذہب وسائنس)

یہ علم ہی تھا جس نے مسلمانوں کو انفرادیت عطا کی اور جب تک حکمراں اس علم کی سرپرستی کرتے رہے ُعالم اسلام ترقی کرتا رہا۔ان کی نظریاتی اور علاقائی سرحدیں محفوظ رہیں۔

علما کی یہ قدردانی تھی کہ بڑے سے بڑا جابر بھی ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ُعلما کی آمد پر تخت سے اٹھ کر استقبال کرتا۔ان کے معمولی سے جھونپڑے میں بیٹھ کر ان کی گفتگو سننے کو نہ صرف آخرت کے لیے بہتر تصور کرتا؛ بل کہ دنیا و بادشاہت کے استقلال اور استحکام کی ضمانت بھی گردانتا۔بڑے سے بڑے سلطان کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ اس منصب کی تحقیر کر سکے یا اسے ختم کرنے کا تصور کر سکے۔لیکن رفتہ رفتہ علمائے کرام ُشیخ الاسلام کے بعد اسے مولویت کے مقام پر لایا گیا جیسے جیسے مقام بدلتا گیا نام میں بھی تبدیلی آتی گئی۔

علما کے استحصال سے کیسی صورتحال سامنے آئی۔قدرت اللہ شہاب اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں: بر ہام پور سنگلاخ پہاڑیوں اور خاردار جنگل میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔جس میں مسلمانوں کے بیس پچیس گھر آباد تھے۔ان کی معاشرت ہندوارانہ اثرات میں اس درجہ ڈوبی ہوئی تھی کہ رومیش علیہ" صفدر پانڈے" محمود مہنتی ،کلثوم دیوی اور پربھا دئی جیسے نام رکھنے کا رواج تھا۔گاؤں میں ایک نہایت کچی مسجد تھی،جس کے دروازے پر اکثر تالا پڑا رہتا تھا۔جمعرات کی شام کو دروازے کے باہر ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔کچھ لوگ نہادھو کر آتے تھے اور مسجد کے تالے کو عقیدت سے چوم کر ہفتہ بھر کے لیے دینی فرائض سے سبکدوش ہوجاتے تھے۔

ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک مولوی صاحب گاؤں میں آکر ایک دوروز کے لیے مسجد کو آباد کر جاتے تھے.اس دوران میں اگر کوئی شخص وفات پا گیا ہوتو مولوی صاحب اس کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے تھے۔نوزائیدہ بچوں کے کان میں اذان دیتے تھے۔کوئی شادی طے ہوگئی ہوتی تو نکاح پڑھوا دیتے تھے۔بیماروں کو تعویذ لکھ دیتے اور اپنے اگلے دورے تک جانور ذبح کرنے کے لیے چند چھریوں پر تکبیر پڑھ جاتے تھے۔اس طرح مولوی صاحب کی برکت سے گاؤں والوں کا دین اسلام کے ساتھ ایک کچا سا رشتہ بڑے مضبوط دھاگے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔(شہاب نامہ ص ۱۵۷)

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب مزید آگے لکھتے ہیں:

برہام پور گنجم کے اس گاؤں کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار میرے دل میں مسجد کے ملا کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔ایک زمانے میں ملا اور مولوی کے القاب علم وفضل کی علامت ہوکرتے تھے'لیکن سرکار انگلشیہ کی علمداری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم وثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ وروغن چڑھتا گیا'اسی رفتار سے ملا اور مولوی کا تقدس بھی پامال ہوتا گیا۔رفتہ رفتہ نوبت بایں جارسید کہ یہ دونوں تعظیمی اور تکریمی الفاظ تضحیک وتحقیر کی ترکش کے تیر بن گئے۔داڑھیوں والے ٹوٹھ اور ناخواندہ لوگوں کو مذاق ہی مذاق میں ملا کا لقب ملنے لگا' کالجوں اور 'یونیورسٹیوں اور دفتروں میں کوٹ پتلون پہنے بغیر دینی رجحان رکھنے والوں کو طنز وتشنیع کے طور پر مولوی کہا جاتا تھا۔مسجدوں کے پیش اماموں پر جمعراتی،شبراتی،عیدی،بقرعیدی اور فاتحہ درود پڑھ کر روٹیاں توڑنے والے،قل اعوذ کے ملاؤں کی پھبتیاں کسے جانے لگے۔لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھوں کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ محلے کی مسجد میں ظہر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ کس طرح ہوتی رہتی ہے؟ کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں میں نرم وگرم لحافوں میں لپٹے ہوئے اجسام کو اس بات پر کبھی حیرت نہ ہوئی کہ اتنی صبح منہ اندھیرے اٹھ کر فجر کی اذان اس قدر پابندی سے کون دے جاتا ہے؟ دن ہو یا رات،آندھی ہو یا طوفان،امن ہو یا فساد،دور ہو یا نزدیک،ہر زمانے میں ہر شہر شہر،گلی گلی،قریہ قریہ،چھوٹی بڑی،کچی پکی مسجدیں اسی ایک ملا کے دم سے آباد تھیں جو خیرات کے ٹکڑوں پر مدرسہ میں پڑھا تھا اور در بدر کی ٹھوکریں کھا کر گھر بار سے دور کہیں اللہ کے کسی گھر میں سر چھپا کر بیٹھ رہا تھا۔اس کی پشت نہ کوئی تنظیم تھی'نہ کوئی فنڈ تھا نہ کوئی تحریک تھی۔اپنوں کی بے اعتنائی'بیگانوں کی مخاصمت'ماحول کی بے بسی اور معاشرے کی کج ادائی کے باوجود اس نے نہ اپنی وضع قطع کو بدلا اور نہ اپنے لباس کی مخصوص وردی کو چھوڑا۔اپنی استعداد اور دوسروں کی توفیق کے مطابق اس نے کہیں دین کی شمع 'کہیں دین کا شعلہ'کہیں دین کی چنگاری روشن رکھی۔برہام پور گنجم کے گاؤں کی طرح جہاں دین کی چنگاری بھی گل ہوچکی تھی۔ملا ہی نے اس کی راکھ کو سمیٹ سمیٹ کر بادمخالف کے جھونکوں میں اڑ جانے سے محفوظ رکھا۔یہ ملا ہی کا فیض تھا کہ کہیں کام کا مسلمان'کہیں محض نصف نام کے مسلمان ثابت وسالم وبرقرار رہے اور جب سیاسی میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آبادی کے اعداد وشمار کی جنگ ہوئی تو ان سب کا اندراج مردم شماری کے صحیح کالم میں موجود تھا۔برصغیر کے مسلمان عموماً اور پاکستان کے مسلمان خصوصاً ملا کے اس احسان عظیم سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہوسکتے،جس نے کسی نہ کسی طرح 'کسی نہ کسی حد تک ان کے تشخص کی بنیاد کو(ہر دور اور ہر زمانے میں قائم رکھا۔(شہاب نامہ ص ۱۵۸)

مولوی کا یہی کردار تھا جو فکری اغوا کے راستے کا پتھر سمجھا جاتا رہا۔

یہی علمائے کرام تھے جو نظریاتی سرحدوں کی حفاظت فرماتے رہے' اسی نظریاتی فوج کے خلاف عام مسلمانوں کو بغاوت پر ابھارا گیا، یہ فوج نامساعد حالات کے باوجود قوم کی فکری اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتی رہی اسی لیے یہ استعمار کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور اس رکاوٹ کو ہٹانے کے لیے بڑا منظّم طریقہ کا اختیار کیا گیا۔ مسلم لیگ (ن) کے سیاسی رہنما جاوید ہاشمی لکھتے ہیں:

لارڈ میکالے نے ہندوستان پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے لیے تعلیمی نظام کا نصاب تیار کیا تھا، جس کے مقاصد میں لارڈ میکالے نے کہا کہ برٹش راج کی مضبوطی کے لیے مقامی لوگوں کو ایک حد تک شامل کرنا ہماری مجبوری ہے اس لیے انہیں ایک محدود سوچ کی تعلیم دے کر اپنے کے لیے استعمال کیا جائے۔

مزید آگے لکھتے ہیں۔

لارڈ میکالے نے ۲/فروری ۱۸۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو تقریر کی وہ مختصر مگر جامع تھی ۔انہوں نے کہا کہ معزز اراکین پارلیمان! میں نے ہندوستان کے طول وعرض میں بار بار سفر کیا۔ دنوں راتوں میں گھوما پھرا ہوں۔ میری آنکھیں آج تک ایک ایسے شخص کو دیکھنے کے لیے ترستی ہیں جو یہاں بھکاری ہو' یا جو لٹیرا ہو، اس ملک میں ایسی دولت دیکھی ہے ایسی بلند اخلاقی قدریں دیکھی ہیں اور اتنی بڑی ہستیوں سے ملا ہوں کہ مجھے پختہ یقین ہوگیا ہے کہ ہم کبھی اس ملک کو فتح نہیں کرسکیں گے جب تک اس قوم کی ریڑھ کی ہڈی نہ توڑ دیں' اس قوم کی ریڑھ کی ہڈی کیا ہے؟ ان کا روحانی اور تہذیبی ورثہ. یہی وجہ ہے کہ با آواز بلند تجویز پیش کرتا ہوں کہ ہم ان نظام تعلیم اور ان کی ثقافت کو بدل کر رکھ دیں۔ دیکھنے میں خواہ یہ لوگ گندمی یا سانولی رنگت رکھتے ہوں لیکن ان کے سینوں کے اندر سفید فام انگریز کا دل دھڑکتا ہو۔

(تختہ دار کے سائے تلے ص/۱۱۲۶۱ از جاوید ہاشمی مطبوعہ جہانگیر بکس اپریل ۲۰۰۷)

اس نظام تعلیم کو اور مرکز تعلیم کو جہاں سے علما بن کر نکلتے ہیں، جہاں سے یہ اس علم کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں، جنہیں اہل صلیب نے ہر جگہ بجھانے کی کوشش کی، ہر جگہ مذہبی شخصیات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

مشہور مستشرقین ''کیرن آرم سٹرانگ''، لکھتی ہیں: اتاترک نے تمام مدرسوں کو بند کردیا۔ صوفی سلسلوں کو دبایا اور مرد وخواتین کو جدید مغربی لباس پہننے پر مجبور کیا اس طرح کے اقدامات ہمیشہ تخریبی ہوا کرتے ہیں۔

اسلام ترکی سے معدوم نہیں؛ بل کہ وہ زیر زمین چلا گیا۔ محمد علی نے مصری علما پر پابندیاں لگائیں، ان کی وقف املاک چھین لیں اور انہیں اثر ورسوخ سے محروم کر دیا۔ بعد ازاں جمال عبدالناصر (۷۰۔۱۹۸۱ء) نے اسلام کی عسکری مخالفت کی۔ ایران میں بہلوی بادشاہ بھی اپنے سیکولرازم کے معاملے میں سفاک تھے۔ رضا شاہ (۴۱۔۱۸۷۸ء) نے علما سے وقف املاک چھین لیں اور شریعت کی جگہ ایک سول نظام نافذ کر دیا۔

(مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال از کیرن آرم سٹرانگ ص ۱۷۴۔۱۷۵ مطبوعہ نگارشات پبلشرز لاہور)

مزید آگے لکھتی ہیں جنرل محمد ایوب خان (۶۹۔۱۹۵۸ء) کی حکومت ویسے ہی جارحانہ سیکولرازم کی مثال تھی، جس کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے اوقاف کو قومالیا اور ریاستی کنٹرول کے تابع (CIVIL) مدرسوں کی تعلیم پر پابندیاں لگا دیں اور ایک خالصتاً سیکولر نظام قانون رائج کیا۔ ان کا مقصد اسلام کو ایک مہذب مذہب بنانا تھا (مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال از کیرن آرم سٹرانگ ص ۱۷۸ مطبوعہ نگار پبلشرز لاہور)

یہ ایوب خان کون تھے؟ پروفیسر گل شہزاد سرور اور فرحت شہزاد اپنی کتاب ''مطالعہ پاکستان'' میں یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

یہ وہ زمانہ تھا جب اس برصغیر میں مسلمانوں پر تعلیم وترقی کے سب ہی دروازے بند کر دئے گئے تھے۔ لارڈ میکالے کا فتویٰ تھا کہ یہاں پر جو نظام تعلیم رائج کیا جائے وہ ایسے انسان پیدا کرے جو رنگت میں تو بے شک ہندوستانی ہوں' لیکن چال ڈھال' فہم وفراست، ذوق ومذاق' اخلاق واطوار اور ذہنی اعتبار سے انگریز ہوں۔ اس پالیسی کے تحت جب فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا تو برصغیر کے ہزاروں مسلمان علما وفضلا بہ یک نوک قلم غیر تعلیم یافتہ قرار دے دئے گئے۔ اس فیصلے کا ہندوؤں نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ اس لیے کہ انہیں انگریزی سے کوئی خاص محبت تھی' بل کہ صرف اس لیے کہ انہیں فارسی سے چڑ تھی' کیوں کہ اس زبان کا رابطہ مسلمانوں سے تھا۔

یوں بھی جب ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ گل ہو گیا تو انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ کوشش یہ تھی کہ اس برصغیر میں ہر اس امکان کو ختم کر دیا جائے، جس میں مسلمانوں کو دوبارہ سر اٹھانے کا ذرا سا شائبہ بھی موجود ہو۔ یہاں پر مسلمان ہی ایک ایسی قوم تھی جس میں حکومت کرنے کی صلاحیت بھی تھی' روایت بھی تھی اور ہزار سالہ تجربہ بھی حاصل تھا۔ چناں چہ اس قوم کا سر کچلنا دونوں کا فرض منصبی قرار پایا۔

(شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب ص ۱۰۴ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۶ء)

مزید آگے لکھتے ہیں:

گورنمنٹ اسکولوں میں دینی تعلیم پر مکمل پابندی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم تھی۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد تھی کہ (دین کے بغیر تعلیم کا کوئی نظام نہ مکمل ہوسکتا ہے نہ قابل قبول۔ (شہاب نامہ۱۰۴)

صرف یہی نہیں؛ بل کہ یہ تک کہا گیا کہ مذہبی کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ بس عمل کے لیے نماز پڑھ لی جائے اور روزہ رکھ لیا جائے کافی ہے اس کے علاوہ مذہبی کتابوں کے پڑھنے سے کیا حاصل ہوگا؟

سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

بڑے بڑے معمم و مشتمل قدوس عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ واصول وتفسیر وحدیث وعلم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائی جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ ودرست رہیں اور علوم غریبہ کے ریلے میں نہ بہہ جائیں۔ مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں، بل کہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جائیں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بد اعتقادی پھیلے گی اس لیے کہ سوائے قرآن مجید کے؛ جس قدر کتب مذہبیہ اس زمانہ تک موجود ہیں ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں۔

ایسی حالت میں ان کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزرار درجہ بہتر ہے۔ مسلمانوں ہونے اور بہشت میں جانے کو خدا کو ایک اور پیغمبر کو برحق جاننا کافی ہے' عمل کو نماز پڑھ لینی اور روزہ رکھ لینا بس ہے۔ انم غیر مفید کتابوں کے پڑھنے سے کیا حاصل ہے۔

(جریدہ ۳۴۔۲۰۰۶ء جلد ششم صفحہ ۳۳ مطبوعہ شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی بحوالہ تہذیب الاخلاق ص ۱۹۲۔۱۹۴)

اسی جریدہ میں محسن الملک کے حوالے سے پیراگراف بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ تمام کتب مذہبیہ جو اس زمانہ تک موجود ہیں' ہزاروں غلطیوں سے معمور ہیں۔ کوئی ایک کتاب بھی ہمارے ہاتھ میں ایسی نہیں آتی ،جس میں کوئی نہ کوئی ایسی بڑی غلطی ہمارے سامنے نہ آتی ہو جو اسلام کی سچی اور صحیح حقیقت کو وہمی اور خیالی امر کی طرف مائل نہ کر دیتی ہو (ایضاً صفحہ ۱۴ بحوالہ مجموعہ لیکچرز محسن الملک ص ۳۶۷)

صرف یہی نہیں بل کہ علما کا علمی استحصال یوں بھی کیا گیا ہے۔

سرسید احمد خان لکھتے ہیں۔

ہماری قوم کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلی درجہ تعلیم دیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہ نکلے گا جو مسلمانوں میں انگریزی علوم کی ترقی دینے کا حامی اور خواہش مند ہو۔

جس حیثیت و درجہ کے یہ لڑکے ہیں ان کو انگریزی پڑھانے سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہونے کا۔ ان کو اسی قدیم طریقہ عام تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے اور ملک کے حق میں اور قوم کے حق میں زیادہ تر مفید ہے کہ ان لڑکوں کو کچھ لکھنا اور پڑھنا اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آجائے اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں، جن سے نماز روزہ کے ضروری ضروری مسائل، جو روزمرہ پیش آتے ہیں اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں۔

(جریدہ ۳۴۔۲۰۰۶ء ص ۲۲ بحوالہ مکمل مجموعہ لیکچرز ۱۸۵۔۱۸۶)

علما کے استحصال میں صرف ایک جانب ہی سے حملہ نہیں کیا گیا، بل کہ اہم اور لائق فخر طبقہ پر کئی جہت سے حملہ ہوا۔ خاکسار تحریک بھی ان میں سے ایک ہے۔ اس اہم مقاصد میں اہم مقصد یہی ہے۔

خاکسار تحریک کے چودہ نکات یا چودہ اصول میں تیسرے نمبر پر یہ ہے:

مولوی کا آج کل کا بتایا ہوا راستہ غلط ہے۔ خاکسار سپاہی اس غلط مذہب کو صفحہ زمین سے مٹانے اور اس کی جگہ ''نبوی نظام'' کو پھر رائج کرنے کے لیے اٹھا ہے (ایضا صفحہ ۷۰ بحوالہ غلط مذہب نمبر ۴ ص ۱۶)

۱۳۵۰ر سال کے بعد یہ تحریک کیوں اٹھی؟

اس کے مقاصد کیا ہیں؟ کیا یہ حقیقی طور پر دین اسلام کے لیے کوشاں ہیں یا در پردہ کچھ اور مقاصد ہیں اور ان کا یہ نبوی اسلام کیا ہے؟ صرف ان کی یہ عبارت پڑھ لیجیے۔

عمل کے اسلامی معنی اگر سمجھانا چاہتے ہو تو جاؤ مصطفیٰ کمال (اتاترک) کو دیکھو کہ کیا کر رہا ہے؟ امان اللہ کو دیکھ کہ اس نے کیا کیا تھا؟ (ایضا ۱۷ بحوالہ غلط مذہب ص ۴)

یہ بالکل وہی تحریک ہے جس کے اثرات سابق صدر محترم پر بھی نظر آتے تھے اور سابق صدر صاحب کے بھی سب سے بڑے آئیڈیل مصطفیٰ کمال اتاترک تھے۔

یہ صدائے بازگشت کوئی نئی نہیں، بل کہ علمائے اسلام صلیب کی آنکھوں میں ہمیشہ خار بن کر کھٹکتے رہے کیوں کہ انہوں نے قرآن وسنت کی تعلیم اور حق بات کی تلقین کرتے ہوئے کبھی اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کی۔ ان

کی زندگیاں قرآن کی تعلیم اوراس کے اسرار ورموز سمجھاتے ہوئے وقف ہوگئیں۔اسی لیے آج سے کوئی سو برس قبل برطانوی وزیراعظم گلیڈ اسٹون نے پارلیمنٹ میں قرآن کریم کا نسخہ لہراتے ہوئے کہا تھا کہ ''جب تک یہ کتاب مسلمانوں میں پڑھائی جاتی رہے گی اس وقت تک مسلمانوں میں مذہبی جنون باقی رہے گا'' اوراسی مذہبی جنون کو ختم کرنے کا سب سے آسان حل یہ ہے کہ علما کا استحصال کیا جائے تا کہ نہ کوئی دینی علم حاصل کرے اور نہ کوئی اس کو پڑھائے۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کی فضیلت یوں بیان فرمائی۔

''خیر کم من تعلم القرآن و علمه''

تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جو قرآن حکیم سیکھے اور سکھائے۔

قرآن اور قرآنی تعلیم اہل صلیب کی نگاہ میں کس طرح کھٹکتی ہے؟ مبشر''تکلی'' اسلام کی تباہی کے لیے یہ تدبیر پیش کرتا ہے۔ہمیں سیکولر بنیادوں پر مدارس کے قیام کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔کیوں کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نے جب اہل مغرب کی درسی کتابیں پڑھیں اور اجنبی زبانیں سیکھیں تو قرآن اور اسلام پر ان کا اعتقاد متزلزل ہوگیا۔(ضیاالنبی جلد ششم ص ۲۵۴ بحوالہ قوی الشر المتحالفہ)

مشہور مستشرق اور مبشر ''صموئیل زویمر'' جو اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے مشہور ہے وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو نصیحت کرتا ہے۔

جب تک مسلمان عیسائی مدارس میں داخلہ لینے سے ہچکچاتے ہیں، اس وقت تک ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے لیے لادینی مدارس کھولیں اور ان مدارس میں ان کے لیے داخلہ آسان بنائیں۔یہی مدارس طلبہ کے اندر اسلامی روح کو ختم کرنے میں ہمارے مدد ومعاون ثابت ہوں گے۔

(ضیاء النبی جلد ششم ص ۲۵۴/ بحوالہ قوی الشر المتحالفہ)

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ایک منظم سازش کے تحت علمائے کرام کے وقار کو تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی تعلیمات سے نفرت پیدا کرنے کے لیے مغربی تعلیم کو پروان چڑھایا گیا اور ان جامعات سے فارغ التحصیل طلبہ وطالبات کو ہی اعلی عہدوں پر فائز کیا گیا۔جب کہ علمائے کرام کے لیے تین چار ہزار ماہوار پر مدرسے میں پڑھانا خطبات کرنا اور زیادہ سے زیادہ نکاح پڑھانے جیسے فرائض رہ گئے۔

## علما کا معاشی استحصال:

علمائے کرام کے معاشی استحصال کے لیے جہاں ان پر ملازمتوں کے دروازے بند کئے گئے وہاں مجبوری کے تحت محدود تعداد میں دی جانے والی ملازمتوں میں تنخواہوں کی مقدار بھی کم رکھی گئی۔اوراس میں جہاں غیروں کا ہاتھ ہے وہاں اپنوں کی کرم فرمائیاں بھی کم نہیں۔ہم ہزاروں روپے جلسوں میں خرچ کر دیتے ہیں مگر عالم دین جوتقریر کرتا ہے اس کو ہم کچھ بھی نذرانہ نہیں دیتے۔

ذرا سوچئے توسہی.....کیا عالم دین کی یہ قدر دیکھ کر کوئی شخص عالم دین بننا چاہے گا؟نہیں ہرگز نہیں۔

کیا عالم دین بغیر کتابوں کے مطالعہ کر سکے گا؟اور کتابیں بازار میں کیا مفت ملتی ہیں،نہیں تو پھر علما کے علمی اور معاشی استحصال میں ہمارا بھی برابر کا ہاتھ ہے۔

ہمیں کیسی حکمت عملی اپنانی چاہئے مئی ۲۰۰۵ کا جام نور ملاحظہ فرمائیں جس میں یہ اشتہار چھپا۔

ہندوستان کے بڑے شہروں میں سے ایک معروف ومشہور شہر کی جامع مسجد کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کے جامع امام کی ضرورت ہے۔

(۱)وسیع النظر عالم دین ہو۔(۲)بہترین حافظ اور خوش الحان قاری ہو۔ (۳)وجیہ اور باوقار ہو۔

(۴)خطبات پر قدرت ہو۔

دینی وشرعی امور کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی حالات پر اس کی نظر ہو،مشاہرہ کی ماہانہ رقم ۲۵ سے ۳۰ ہزار ہو سکتی ہے۔رہائش وغیرہ کا عمدہ انتظام الگ(ماہنامہ جام نور دہلی ۲۰۰۵)

اگر اس طرز پر ہم علما کی عزت افزائی فرمائیں تو یقین جانئے ہمارے مدارس سے نور ونکہت کا وہ سیلاب برآمد ہوگا کہ ہر طرف اسلامی معاشرہ کے خدوخال ابھر کر سامنے آجائیں گے۔

اور ہمیں اب اس جانب توجہ دینی چاہئے،تاکہ ہمارے یہاں مدارس میں طلبہ کی تعداد بڑھے اور نیز طلبہ کی تربیت اسی نہج پر ہو کہ وہ اسلام کے خلاف عالمی سازشوں پر گہری نظر رکھ سکے۔

## علما کا نفسیاتی استحصال اور تحقیر:

اسلام دشمنی نے یہود ونصاریٰ اور ان کی پروردہ سیاسی جماعتوں کو اس قدر ذہنی اور اخلاقی طور پر دیوالیہ کر دیا اور انہوں نے علما کی نفسیاتی تحقیر کے لیے کئی طریقے اپنائے،ہر داڑھی والے شخص کو خواہ اس کا ذاتی

کردار کیسا ہی ہو، وہ دین سے واقف ہے یا نہیں، اوئے مولوی کہہ کر پھبتی کسی جانے لگی۔ مولانا، علامہ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے۔ علما کا امتیاز ختم کر دیا۔ سیاسی جلسوں میں علمائے کرام پر پھبتیاں کسی گئیں، علما کے لیے مولوی کی اصطلاح عام ہو گئیں، بعد میں تحقیر کے لیے اسے ملا ملا نئے ملا نے حلوہ خور، جیسے القابات کی شکل اختیار کر لی۔

برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے ہوٹل کے بیروں اور دربانوں کے لیے پگڑی، کلاہ اور اچکن کا لباس مقرر کیا جو آزادی کے دور میں علما کا لباس تھا۔

غرض تحقیر کے لیے ہر وہ طریقہ اپنایا گیا جس سے علما کی تحقیر ہو سکے۔

معمولی تنخواہیں اور معاشرتی طور پر معاشی بدحالی نے اعلیٰ لوگوں کو اس جانب سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر انہوں نے اپنے بچوں کو عالم دین بنایا تو ان کے بچوں کا وہی حشر ہوگا جو آج اس محلّہ (برہام پور) کے مولوی صاحب کا ہے چناں چہ اکثر مسجدوں کی امامت بھی جاہل اور نادان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔

## علما کی کردار کشی:

دین اسلام کو مٹانے کے لیے دین کے محافظوں کی کردار کشی کی گئی اور یہ تصور عام کر دیا گیا کہ یہ مولوی ہی قدامت پرست ہے۔ ہماری تنزلی کا سب سے بڑا سبب یہ مولوی ہے اور اس کی بنائی ہوئی اسلامی اقدار (جو درحقیقت مولوی کی نہیں، بل کہ نبی کریم ﷺ کی عطا کردہ ہیں) ہی درحقیقت قوم کی تنزلی کا سبب ہیں اور یہ منظر پاکستان اور ہندستان ہی میں نہیں؛ بل کہ پوری دنیا میں عام ہے۔ اگر ترکی کو یورپی یونین میں شامل ہونا ہے تو تمام اسلامی اقدار کو پامال کرنا ہوگا، مولوی کا حکم' حجاب' اسکارف' داڑھی' ٹوپی یہ تمام اقدار ترک کرنا ہوں گی۔

اسلامی ثقافت کے مظاہرہ داڑھی' اونچی شلوار اور ٹوپی پہننے والے ہر شخص کو متعصب' تنگ ذہن اور متشدد سمجھا جانے لگا۔ مولویوں کے ظلم کی داستانیں عام کی گئیں۔ اس کی مثال محترمہ کا درج ذیل بیان ہے۔

پاکستان میں عورت' ملاّ' شوہر، ساس اور سسر کے ظلم کا شکار ہے۔ خواتین کو ایک سازش کے تحت پس ماندہ رکھا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان خواتین کی قابلیت اور ذہانت گھر کی چار دیواری کے اندر رہنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ (روزنامہ جنگ ۱۶ جنوری ۱۹۹۲ء)

عبارت کو غور سے ملاحظہ کیجئے۔ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ "ملاّ" بے چارہ چار دیواریوں میں گھس کر عورت پر شوہر، ساس اور سسر سے زیادہ مظالم ڈھا رہا ہے۔گھر سے باہر نکلنے والی ایسی خواتین کی قابلیت کا عالم یہ ہے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ چار دیواری میں رہنے کا حکم "ملا" نے نہیں اللہ نے دیا ہے۔

(وقر ن فی بیو تکن (سورہ احزاب آیت ۳۳ پ ۲۲)

"اور اپنے گھروں میں قرار سے رہو"

اور یہی محترمہ لندن کے ایک نائٹ کلب میں دو پاکستانی خواتین کے برہنہ رقص کے حوالے سے جواب دیتے ہوئے کہتی ہیں۔

"وہ دونوں باغی عورتیں ہیں ان کے باغی ہونے کی وجہ بھی ملا، ساس اور سسر ہیں"

(روزنامہ جنگ ۱۶ فروری ۱۹۹۲)

ہر کردہ ناکردہ جرم ملا ہی کے کھاتے میں آتا ہے۔

عورتوں پر ظلم کون کر رہا ہے؟ ملاّ۔ ترقی کا دشمن کون؟ ملاّ۔ قدامت پرست کون؟ ملاّ۔ زوال کی وجہ کون؟ ملاّ

ہر جرم "ملا" ہی کے کھاتے میں آتا ہے۔

علمائے کرام کی تحقیر کے لیے جدیدیت کے علمبردار نام نہاد اسکالرز شرم و حیا کی کج کلاہ کو اتار کر پھینک دیا اور آبروئے علم کو یوں بے آبرو کرتے نظر آتے ہیں۔

جدیدیت کے علمبردار علما کی تحقیر میں پروفیسر علی حسن مظفر یوں رقم طراز ہیں:

ملا کے کئی روپ ہیں۔کبھی بے چارہ دنیا سے بے نیاز نظر آتا ہے، کبھی وہ اپنے آپ کو دنیا سے لاتعلق ظاہر کرتا ہے، کبھی دنیاداروں کے سامنے چندہ کی "بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔

(اکیسویں صدی اور ہمارے علما۔ص ۴۷ از پروفیسر علی حسن مظفر مطبوعہ انجمن ارتقائے ملت گوجرانوالہ فروری ۲۰۰۳ مئی)

مزید آگے کچھ اس طرح چراغ ظلمت جلاتے ہیں:

یہاں (مدارس میں) مولویوں کی کون سی قسم تیار ہوتی ہے۔ٹیلنٹ تو اللہ تعالی نے ہر شخص میں دیا ہوا ہے۔چناں چہ جو اعلیٰ نسل کے مولوی رہتے ہیں وہ "علامئی" بن جاتے ہیں اور جو نیم اعلیٰ نسل کے ہوتے ہیں وہ مسجدوں کے خطیب بن جاتے ہیں اور جو عام نسل کے مولوی ہوتے ہیں وہ مسجدوں کے امام بن جاتے ہیں۔

یہ بے چارے اعلیٰ علوم یعنی (دینی اسکالروں اوراور دنیاوی مفکروں کی کاوش) سے بے بہرہ ہوتے ہیں، مگر اپنے مبتدیوں کو بتاتے ہیں کہ وہ عالم وقت ہیں اور امامت کو اپنا حقیقی منصب سمجھتے ہیں۔

(اکیسویں صدی اور ہمارے علما ص ۵۷)

اور اپنی ایک دوسری کتاب میں لکھتے ہیں:

وہ دن'' قسمت ترین دن ہوگا'' جب قوم ملا سے اور ملا کی تحقیق سے چھٹکارا پالے گی۔

(روایات اصل دین نہیں ص ۸ از پروفیسر علی حسن ظفر مطبوعہ (ویز ابل اسلامک پلبلیکیشنز وی آئی پی لاہور ایڈیشن سات ۲۰۰۴ء)

اس نہج پر علمائے کرام کے خلاف پروپیگنڈہ اور مہم منظّم طور پر چلائی گئی۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے علما کے متعلق برین واشنگ کی جانے لگی۔ ٹی وی ڈراموں میں داڑھی والے کردار بدمعاشوں اور غنڈوں کو دیئے گئے' جب کہ شریف اعلی طبقے سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ اور اچھے کردار کلین شیو کو دئے گئے۔ مزاحیہ خاکوں میں علما کا مذاق اڑایا گیا۔ ڈراموں میں ترکی ٹوپی جو کسی دور میں خلافت اور مرکزیت کا شعار تھی مزاحیہ کرداروں کو پہنادی گئی غرض یہ کہ ایک منظّم انداز میں یہ کوشش کی گئی کہ علمائی کردار کو قوم کے ذہنوں میں معاشرہ کا ایک بوجھ راسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ پی ٹی وی کے ڈائریکٹر ذوالفقار بخاری کے اس بیان کو غور سے پڑھیے جو انہوں نے ٹی وی اسٹیشن کے قیام کے موقع پر دیا۔

منافقت اور متضاد کردار کے لیے منفی ڈرامہ کرداروں کو داڑھی لگائیے' مضحکہ خیز کرداروں اور یتیم العمل کرداروں کو مشرقی لباس پہنائیے' یہ یاد رکھئے کہ آپ کو تمام کرداروں اور اناؤنسروں کو وہ لباس پہنانا ہے، جو ہمارے ترقی یافتہ معاشرے میں سوسال بعد رائج ہونا چاہئے۔ جو یک فیصد اوپر کے طبقے پر رائج ہے۔

(مسلمانوں کی فکری اغوا: ص ۱۰۴۔۱۰۵ از مریم خنساء مطبوعہ دار الکتب سلفیہ بحوالہ ویڈیو جزیشن ص ۱۳)

اور اب صورتحال یہ ہے کہ قدامت پرست علما کے بجائے ان لوگوں کو آگے لایا جارہا ہے جو مغربیت سے مرعوب ہیں اور ان علما کو جو روشن خیال اور لبرل ہیں۔ اور انہیں اس پر فخر بھی ہے کہ اسلام کی لغت میں ہم ان کو علمائے سوء کہہ سکتے ہیں۔

یہ بناوٹی مولوی اسلام کے متعلق شکوک وشبہات پھیلا کر مسلمانوں کا اسلام پر سے اعتماد ختم کردیتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ان کا اہم مقصد ہے۔

## علما کی آڑ میں اسلام کی مخالفت:

خواہشات نفسانی بھی عجیب ہوتی ہے۔انسان ہی نہیں رہنے دیتے اور جب انسان خواہشات کا غلام ہوجاتا ہے تو نفسانی خواہشات آقا کا روپ دھار لیتی ہے اور پھر" کیا حکم ہے میرے آقا"۔انسان یہ نعرہ لگاتا نظر آتا ہے۔

سلفی خواہشات کا نہ تھمنے والا سیلاب جب اسلام کی لگائی ہوئی حدود سے آکر ٹکرانے لگتا ہے تو اس کا بس نہیں چلتا کہ یہ حدود، یہ بندسب توڑ دے لیکن جب بس نہیں چلتا تو ملا کی آڑ لے کر ان مضبوط فیصلوں پر سنگ باری شروع کردی جاتی ہے۔کہ یہ ملا کا اسلام ہے' ملا ازم اور ملائیت کی اصطلاحات وضع کردی گئیں۔

اسلام کے مسلمہ اصولوں کو ملا کا اسلام قرار دے کر اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی عام ہوگئی۔

ایک معروف صحافی یوں رقم ارہیں:

جس میں جمہوریت شامل ہے ہم اس اسلام کے پیروکار ہیں ملا کی اسلام میں جمہوریت نہیں" (نوائے وقت ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء)

## کیا اسلام کی کئی اقسام ہیں؟

جمہوری اسلام' ملا کا اسلام' سوشلسٹ اسلام کمیونسٹ اسلام' لبرل اسلام' روشن خیال اسلام اور جدید اسلام نہیں نہیں اور ہرگز نہیں۔

اسلام تو صرف ایک ہے۔یہ انسانوں کی وضع کردہ نظریات کا معجون مرکب نہیں، اللہ تعالیٰ کا دین خالص ہے، جس میں جمہوریت اور کسی اور نظریہ کی ملاوٹ کی گنجائش نہیں-اس کا اعلان ہے کہ ﴿**الا للّٰہ الدین الخالص**﴾ (سورہ الزمر آیت ۳ پ ۳۲)

خبردار! صرف اللہ کے لیے ہے دین خالص"

"حدود و آرڈیننس خواتین کو پسماندہ رکھنے کے لیے ملاوٹ کی ایک گہری سازش ہے"

(روزنامہ جنگ ۱۶ فروری ۱۹۹۲ء)

واضح کرتا چلوں کہ حدود و آرڈیننس کی دفعات قرآن کی" سورہ نور" اور کتب احادیث کی نصوص پر مشتمل ہے- حد قذف، حد رجم کسی ملا نے نہیں؛ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی معصیت کے تحفظ کے لیے مقرر کی ہے- اس حدود اللہ کو پرویز مشرف نے پارہ پارہ کر ڈالا - اس کی تفصیلات ہم اپنے رسالہ" حدود و آرڈیننس کے محرکات اور اس کے معاشرتی اثرات" میں لکھ چکے ہیں-غرض یہ کہ علما کی آڑ لے کر دین پر حملے کرنا استعماری ایجنڈوں کا ایک ہتھیار ہے-ایک سیاسی رہنما کا یہ بیان بھی ملاحظہ کیجیے-

''ہم ملا کی وکٹ پر نہیں بل کہ ذوالفقار کی وکٹ پر کھیلیں گے کیوں کہ ہم سیکولر ہیں''۔

(روزنامہ جنگ ۱۹ مئی ۱۹۹۲ء)

سیکولر کسے کہتے ہیں؟ کون لوگ ہیں سیکولر؟ وہ جن کا کوئی مذہب نہیں یہاں بھی ملا کو اسلام کے ہم معنی استعمال کی گیا۔

مولویوں کے خلاف سینوں میں اتنا زہر بھر دیا گیا ہے کہ موقع بے موقع محل بے محل خواہ وہاں مولوی پر تبرا بھیجنا ضروری ہے یا نہیں؛ مگر بھیجے بغیر چین نہیں ملتا۔ جیسے نعیم بخاری صاحب کا یہ بیان:

''ڈش انٹینا ہماری گردنوں پر آ گیا ہے۔ ۸۴۰۰/روپے کا ہو گیا ہے، گھروں میں عام ہو رہا ہے، لیکن ہمارے مولوی ابھی تک بکھیڑوں میں الجھے ہوئے ہیں'' یہ لوگ کہاں رہ رہے ہیں؟ تاریخ کی گھڑی مڑتی نہیں، چاہے موڑے جائیں، ہم جانتے ہیں کہ ہم اچھے مسلمان تھے؛ مگر آج ہم سب سے گئے گزرے ہیں۔ مولوی فتویٰ دیتا ہے کہ'' تو کافر ہے اور تو مسلمان'' اسلام کا نام لے کر بعض مولوی اور سیاست دان عوام کو دھوکا دیتے ہیں، گناہ کرتے ہیں اور ہمیں صبر کی تلقین کی جاتی ہے کہ یہاں دکھ سکھ سہ لو، دوسرے جہاں میں تمہیں حور ملے گی- نہریں بھی اور جنت بھی، ہمیں آج تک وعدۂ حور سے بہلایا جاتا ہے اور ہم بہل جاتے ہیں'' (جنگ ۲۶ جون ۱۹۹۲ء)

بیان کی بے ربطگی مولویوں کے خلاف ذہن میں ابلنے والے جوش وخروش کی غماز ہے۔ رو میں اس قدر بہہ گئے کہ جنت وحور وقصور پر بھی تنقید کر گئے۔ حالاں کہ یہ وعدہ مولوی کا نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کا ہے اور پورا قرآن اس پر گواہ ہے۔

مدیحہ گوہر علما کے خلاف کچھ یوں زہر افشانی کرتی ہیں: ٹیلی ویژن پر عریانی اور فحاشی کا الزام سراسر غلط ہے۔ محض سر سے دوپٹہ اتار دینا عریانی نہیں، مارشل لا کے دور میں جو کلچر ہم پر مسلط کیا گیا تھا وہ'' ہمارا کلچر نہیں ہے۔ کچھ مولوی حضرات اس چیز کو مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں معاشرہ کو درپیش دوسرے مسائل نظر نہیں آ رہے۔ رقص وموسیقی ہمارے کلچر کا حصہ ہیں۔ میں ٹیلی ویژن کو ورلڈ کپ کے موقع پر کلچرل پروگرام کروانے پر مبارکباد دیتی ہوں۔ محض چند داڑھی والے آ کر بدتمیزی کرتے ہیں، اسمبلیوں میں ٹھڈے مارے جاتے ہیں۔ الیکشن میں عوام انہیں رد کر دیتے ہیں۔ محض غیر ملکوں کی پشت پناہی کی وجہ سے یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے ہیں: عہد نبوی میں اسلام کے خلاف ایسے پر جوش غیظ وغضب کے کافرانہ مظاہرے پر اللہ نے ارشاد فرمایا: (**قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبر قد بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون**) (سورہ آل عمران آیت ۱۸۸)

ان کی عداوت تو ان کی زبان سے ظاہر ہو چکی اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ بہت زیادہ

(خطرناک) ہے۔اگر تم عقل مند ہو تو ہم نے: تمہارے لیے آیت بیان کر دیں۔ نیز فرمایا: (**عضوا علیکم الانامل من الغیظ قل مو تو ا بغیظکم ان اللہ علیم بذات الصدور**) (سورہ آل عمران آیت ۱۱۹)

وہ تو مارے غصہ کے انگلیاں چباتے ہیں کہہ دو کہ اپنے غصہ میں ہی مر جاؤ اللہ تعالیٰ دلوں کا راز بخوبی جانتا ہے۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آج کے دور میں صرف مسلمانوں ہی کی غیرت اتنی گہری نیند سوئی ہوئی ہے کہ اپنے مذہبی رہنماؤں کے خلاف ہرزہ سرائی پر جاگتی نہیں۔ ورنہ کسی عیسائی، ہندو، سکھ یا یہودی رہنماؤں کے خلاف کوئی بات کر کے تو دیکھے۔ان مذاہب کے عوام تو عوام حکمران تک آسمان سر پر اٹھالیں گے اور اس کے انجام سے ہمکنار کر کے دم لیں گے۔

علمائے کرام امتِ اسلامیہ کے ماتھے کے جھومر ہیں۔اگر انہیں اسلامی حکومتوں میں منصب عطا کیا گیا تو وہیں اعلائے کلمتہ اللہ کی پاداش میں ان کے پیٹھوں کو کوڑوں سے لہولہان بھی کیا گیا، استعمار کے ایجنٹوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کو درختوں سے الٹا لٹکا کر ان کے سروں کے نشانے باندھے، تو کہیں ان کو درختوں سے باندھ کر ذبح کیا گیا، کہیں ان کی املاک قرق کی گئیں، کہیں نذر آتش اور کہیں کالے پانی کی سزا سنا کر اپنے جذبات کو تسکین پہنچائی۔

عالم اسلام میں علما کی یہ حالت قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدالت نے علما کے استحصال کرنے والوں کے لیے یہ سزا سنائی ہے۔

(**ان الذین یکفرون بآیات اللّٰہ ویقتلون النبیین بغیر حق و یقتلون الذین یأمرون بالقسط من الناس فبشر ھم بعذاب الیم اولئک الذین حبطت اعمالھم فی الدنیا والآخرۃ وما لھم من نا صرین**. (سورہ آل عمران آیت:۲۱،۲۲ پ۳)

بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیا کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل وانصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں عذاب کی یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لیے کوئی مددگار۔

☆.....☆.....☆

# موجودہ دور کے فکری چیلنجز اور فضلا کی ذمہ داری

چراغ مصطفوی سے ستیزہ کاری روزِ ازل سے تاامروز جاری ہے۔حق و باطل کی کشمکش قدیم تاریخ رکھتی ہے۔

مختلف میدانوں میں اسلام اور کفر کی جنگ صدیوں سے جاری وساری ہے۔نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی اسلام کی فصیلوں میں دراڑیں ڈالنے کا ابلیسی عمل شروع ہوا، جو بلا تعطل کے آج تک جاری ہے۔حق و باطل کی اس طویل کشمکش میں جہاں اہل باطل اور اہل کفر کی ریشہ دوانیوں ،سازشوں ،نت نئے طریقوں سے حق کو ختم کرنے کی کوششیں اپنے تمام تر وسائل اور ساز وسامان کے ساتھ حق کو ملیامیٹ کرنے کی تگ ودو اور عسکری ،فکری ،علمی ،سیاسی ،تہذیبی اور دیگر میدانوں میں حق پر حملہ آور ہونے کی داستانوں کی ایک طویل تاریخ ہے، وہاں باطل کے خلاف اہل حق کی کاوشیں حق پر ڈٹنے اور مرمٹنے کے مبارک جذبوں ،غلبۂ حق کے لیے جان و مال کی قربانیوں، باطل کے ایوانوں میں گرجدار للکار اور ہر میدان میں باطل کو منہ توڑ جواب دینے کے داستانوں کی بھی ایک حسین اور قابل رشک تاریخ ہے۔دعوت وعزیمت کی یہ صبر آزما تاریخ ہمارے لیے مشعل راہ اور مایوس کن حالات میں شمع امید ہے اور دین اسلام کی حفاظت کے خداوندی وعدے کا مظہر اتم ہے۔خلیفہ بلافصل، جانشین پیغمبر اور یار غار ومزار کا الہامی جملہ"اینقص الدین وانا حي "رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے سرفروشوں اور دین کے غمخواروں کے لیے دستور، لائحہ عمل اور ماٹو کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر دور میں اسلام کے محافظوں نے سنت صدیقی پر عمل کرتے ہوئے دین میں رخنہ ڈالنے والوں کا تعاقب کیا ہے۔

عصر حاضر میں سنت صدیقی دہرانے کی پھر اشد ضرورت ہے۔آج کی دنیا علوم وفنون کی دنیا ہے، سائنس وٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کا دور ہے،فلسفہ وعقلی موشگافیوں کا زمانہ ہے،آزاد خیالی اور نفس پرستی کا دور دورہ ہے، مادیت اور سرمایہ ہی اس دور کے انسان کا معبود اعظم ہے۔انٹرنیٹ اور میڈیا نے دور اور قریب کے فرق کو مٹادیا ہے۔آج ماضی کے برعکس زیادہ تنوع ،وسعت اور جامع منصوبہ بندی کے ساتھ باطل اسلام پر حملہ آور ہے مزید برآں مسلمان ماضی کی طرح قوت وطاقت میں نہیں ہیں۔خلافت کا سائبان مسلمانوں کے سر پر سایہ فگن نہیں ہے۔آج کی دنیا کے اختیارات کی باگ وڈور مغرب کے ہاتھ میں ہے اور سیاست معیشت ،سائنس ،ٹیکنالوجی فلسفہ فکر اور تہذیب غرض ہر میدان میں مغرب حاکم ،امام اور کلی اختیارات کا مالک ہے۔

مغرب نے اپنی حاکمیت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام پر چوطرفہ حملہ کررکھا ہے۔آج مسلمان خصوصاً ایک عالم دین اور فاضل کی ذمہ داری ماضی کے برخلاف کئی گنا بڑھ گئی ہے۔امت کی بقا،تحفظ اور دینی و ایمانی حفاظت وارثین انبیا کے کندھوں پر ہے۔موجودہ دور کے بڑے چیلنجز سے ہر عالم وفاضل کو باخبر رہنا چاہئے اور ان کے سدباب اور توڑ کے لیے ہمہ جہت تیاری کرنی چاہیئے۔امت مسلمہ کو علمی وفکری حوالے سے درجہ ذیل بڑے چیلنجز کا سامنا ہے:

### ۱/سیکولرزم:

سیکولرزم عصر حاضر کے بڑے اور خطرناک فتنوں میں سرفہرست ہے۔سیکولرزم کا مطلب دین کی دنیاوی معاملات،معاشرتی اموراور ریاستی مسائل سے علیحدگی ہے۔دوسروں لفظوں میں سیکولرزم دین کو محض فرد کا ذاتی پرسنل اور پرائیویٹ معاملہ سمجھتا ہے اور اجتماعی،معاشرتی وریاستی معاملات میں دین و مذہب کی مداخلت کا سختی سے مخالف ہے۔جب کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور کامل دستور زندگی ہے،انسانی زندگی کا کوئی گوشہ خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسلامی شریعت سے باہر نہیں ہے۔سیکولرزم اسلام کی کاملیت،جامعیت اور ابدیت کے لیے عصر حاضر کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔آج امت مسلمہ مجموعی طور پر دانستہ یا نادانستہ سیکولرزم سے متاثر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ستاون اسلامی ممالک میں سے کسی میں بھی اسلام مکمل طور پر ریاستی سطح پر نافذ نہیں ہے۔آج کا اسلام صرف چند عبادات تک محدود ہے۔آج اسلامی معاشروں میں اسلام کے ریاستی ومعاشرتی نفاذ کی بات ایک اجنبی اور ناقابل عمل نعرہ بن گیا ہے۔ان حالات میں امت کے فکری وعلمی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے بنتی ہے کہ عصر حاضر کے سب سے بڑے فتنے کے خلاف عملی ہتھیار اٹھائیں اور اسلام کی جامعیت،کاملیت اور ابدیت کو عصر حاضر کے اسلوب،زبان اور اصطلاحات میں پیش کریں۔

### ۲/الحاد:

انسانی معاشروں میں ایسے لوگوں کا وجود ہمیشہ سے رہا ہے،جو مذہب اور خدا کے منکر تھے۔لیکن عصر حاضر کی حیرت انگیز مادی ترقی اور سائنسی ایجادات کے بطن سے الحاد کی ایک عالمگیر تحریک نے جنم لیا ہے۔الحاد روئے زمین پر تمام مذاہب کے انکار کا نام ہے۔مذہب،دین،خدا،اور ایک برتر ہستی کے مطلق انکار کا نام ہے الحاد۔ملحدین کے نزدیک مابعد الطبیعات نام کی دنیا ایک وہم ہے،کائنات صرف موجود اور محسوس کا نام ہے،غیر

محسوس، غیر مرئی، مابعد الطبعی اور روحانی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے، یہ سب انسانی توہمات اور خیالات ہیں، ایک محتاط اندازے کے مطابق الحاد معاصر دنیا کا مقبول ترین نظریہ ہے اور روزانہ ہزاروں لوگ الحاد کی بھینٹ چڑھ کر خدا اور مذہب کے مطلق انکار کا نظریہ اپنا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی ایجاد سے تو الحاد کا فتنہ ایک منظّم اور مربوط تحریک میں تبدیل ہو چکا ہے۔ نیٹ پر ملحدین کی بے شمار ویب سائٹس ہیں، فورمز اور سوشل میڈیا پر متعدد پیجز اور گروپس موجود ہیں، جن میں لاکھوں لوگ شامل ہیں۔ آج کے ملحدین کا سب سے بڑا ٹارگیٹ دین اسلام ہے، کیوں کہ باقی مذاہب اپنی عبادت گاہوں تک محدود ہیں اور خود ان کے ماننے والوں کے نزدیک وہ معاصر دنیا کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہیں۔ صرف دین اسلام ہی دنیا کا وہ واحد نظریہ اور یکتا دین ہے جو آج بھی انسانیت کے مسائل کا سب سے جامع اور کامل حل پیش کرتا ہے۔ الحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہونے کے ناطے ملحدین کی توپوں کا رخ مکمل طور پر اسلام کی طرف ہے اور نت نئے شبہات، اعتراضات اور تاریخ وسیرت سے ضعیف وموضوع روایات وعبادات کی بنیاد پر دین اسلام کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ جدید الحاد کا ایک منظّم مربوط رد پیش کیا جائے، ملحدین کی دسیسہ کاریوں کے مسکت جوابات دیے جائیں اور ان اعتراضات واشکالات کی بنیادوں پر علمی وتحقیقی کام کیا جائے۔ ملحدین کے کام کا اگر ایک جائزہ لینا ہے تو نیٹ پر جرأت تحقیق کے نام سے ویب سائٹ فورم اور فیس بک پیج پر اس فتنے کی خطرناکی، ہولناکی اور عالمگیریت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

### ۳/ جدیدیت:

مغرب صدیوں سے پادریوں اور کلیسا کی غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس جکڑ بندی کے خلاف سولہویں صدی میں "مارٹن لوتھر" نے ایک مضبوط تحریک شروع کی، جس نے آگے چل کر پروٹسٹنٹ کے نام سے ایک مستقل مکتب کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد کلیسا و پاپائیت کے خلاف متنوع تحاریک اٹھیں اور تحاریک کے کوکھ سے ماڈرن ازم کی ایک ہمہ گیر تحریک نے جنم لیا، مغرب کے نامی گرامی فلاسفہ نے عقلی وفلسفیانہ بنیادوں پر ماڈرن ازم کی راہ ہموار کی اور زندگی گزارنے کے متعدد فلسفے خالص عقلی بنیادوں پر مغربی دنیا میں وجود میں آئے۔ ان تمام فلسفوں کا جامع عنوان ماڈرن ازم ہے جس میں قدر مشترک موجودہ دور کے انسان کو زیادہ سے زیادہ آزادی اور خود مختاری کا علمبردار بنانا تھا، یوں جدید مغربی دنیا نے آزادی، مساوات اور ترقی کے تین بنیادی

اصولوں پر نظام زندگی کی تشکیل کی، جس کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام، لبرل، مغربی جمہوریت انسانی حقوق کا عالمی چارٹر، سوشل سائنسز اور دیگر جدید نظام ہائے زندگی کے وسائل پر ہر قیمت پر قبضہ کرنے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت اکٹھا کرنے کی عالمگیر سوچ پیدا ہوئی اور حرص و ہوس کی ایک ہمہ گیر فکر نے جنم لیا۔ جدیدیت کے اس فکری طوفان نے مغرب سے آگے نکل کر مشرقی و اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں جدیدیت اپنے تمام مظاہر و آثار کے ساتھ قائم ہے، اسلامی دنیا کے سب سے کامل و جامع علم برداروں نے اسے نظام زندگی کے طور پر مکمل قبول کر لیا ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جدید مغربی فلسفے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے اور اس جدید فلسفے کی کوکھ سے پیدا شدہ نظام ہائے زندگی کا ایک بھرپور جائزہ لیا جائے۔

## ۴/ مابعد جدیدیت:

مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت کے ردعمل میں وجود میں آیا۔ جدیدیت کے علم برداروں نے آزادی، ترقی اور مساوات کی بنیاد پر ایک عالمگیر نظام تشکیل دیا اور جبر، قوت، طاقت، لالچ اور مکر و فریب کے ذریعے پوری دنیا پر جدیدیت کا نظام مسلط کرنے کی کوشش کی، جدیدیت کے ماننے والوں کے نزدیک اس وقت جدیدیت کے اصول ایک آفاقی سچائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دنیا کے ہر خطے، ہر قوم، ہر مذہب اور ہر رنگ و نسل کے لوگوں کو جدیدیت کا نظام اپنانا ہوگا، اس ظلم و استبداد کے ردعمل میں مابعد جدیدیت کا نظریہ وجود میں آیا، مابعد جدیدیت کی تعریف ایک فلسفی لیوٹارڈ کے الفاظ میں "مابعد جدیدیت عظیم بیانوں پر عدم یقین ہے" مابعد جدیدیت کے علم برداروں کے نزدیک اس دنیا میں اصول، نظریات، روایات، اقدار اور سچائی و حقیقت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں آفاق میں سچائی اور حقیقت مطلقہ کا کوئی وجود ہے۔ یہ سب چیزیں اضافی ہیں، اضافی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سچائی، حقیقت، حق اور خیر کا تعلق محض انفرادی پسند و ناپسند کے ساتھ ہے، ہر شخص، ہر شخص کا خیر اور ہر شخص کا حق الگ الگ ہے، اس لیے سچائی کا تصور محض ایک دعویٰ اور دیومالائی داستان ہے۔

مابعد جدیدیت کے فلسفے کا اثر یہ ہے کہ آج کے انسان کی دلچسپی محض اپنے احساسات، جذبات اور عملی مسائل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کے انسان کے نزدیک زندگی کی تمام بحثیں مسئلہ اور حل کا نام ہیں، افکار، نظریات اور آئیڈیالوجی کے مباحث محض نظری ہیں۔ جن کا عملی زندگی کی تشکیل اور مسائل کے حل میں کوئی

کردار نہیں، آج کے انسان کے نزدیک اصول ،نظریات ،اقدار ،قواعد ضوابط ماضی کی باتیں ہیں ،اس لیے بعض مفکرین نے موجودہ دور کو "عدم نظریہ کا عہد" کہا ہے۔مابعد جدیدیت کا فلسفہ جدیدیت سے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے۔جدیدیت میں تو اصول کا مقابلہ اصول سے تھا، دلائل کے مقابلہ میں دلائل تھے،جب کہ فلسفہ مابعد جدیدیت سرے سے اصول و دلائل کا ہی منکر ہے۔جو انسان دلیل ونظریے کے وجود کا ہی منکر ہو، اسے کسی نظریے پر آمادہ کرنا اور کسی مذہب وعقائد پر لانا ایک کٹھن کام ہے۔جدیدیت زدہ انسان کا مقابلہ تو اسلام کی آفاقیت، افادیت اور اسلامی نظام کو عقلی وفلسفیانہ بنیادوں پر ثابت کرنے پر موقوف ہے، جب کہ مابعد جدیدیت سے متاثر انسان کو قائل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے نظری پہلو کی بجائے اس کے عملی پہلو پر بھر پور توجہ دی جائے، انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اسلامی احکام کے مضبوط اور لاینفک تعلق کو ثابت کیا جائے اور اسلامی احکام پر عمل پیرا نہ ہونے کی صورت میں انسان کی عملی زندگی کے نقصانات اور اس کے درہم برہم ہونے کی بھر پور وضاحت کی جائے۔الغرض زعمائے امت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اسلام کو محض ایک نظریہ اور آئیڈیالوجی کے طور پر پیش کرنے کے بجائے اسے ایک عملی اور پریکٹیکل نظام کے طور پر پیش کریں۔

### ۵/تجدد پسندی:

سیکولرزم، الحاد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے افکار کی اٹھان مغرب سے ہوئی اور مغرب سے بقیہ دنیا میں پھیل گئے۔ان فلسفوں نے دنیا کے ہر مذہب اور ہر نظام کو متاثر کیا۔اسلامی دنیا میں ایک بڑا طبقۂ زندگی ان جدید فلسفوں سے متاثر ہوا، خصوصاً وہ طبقہ جس نے مغربی تعلیمی اداروں یا اس طرز پر بنی ہوئی مسلم ممالک کی تعلیم گاہوں سے تعلیم حاصل کی۔ان فلسفوں خصوصاً جدیدیت کا تاثر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی دنیا کے ایک بڑے طبقہ نے دین اسلام کو ان جدید نظریات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس میں قطع و برید اور کاٹ چھانٹ کا سلسلہ شروع کر دیا، دین اسلام میں موجودہ حالات کے مطابق تبدیلی ،تغیر اور قطع و برید کلی و جزوی دونوں سطح پر ہوئی۔دین اسلام میں جزوی یا کلی ترمیم اور اصلاح کے علم برداروں کو تجدد پسند اور متجددین کہتے ہیں، ان متجددین میں سے کسی معجزات وکرامات کے اسلامی تصور کو عہد جدید کے متضاد سمجھا تو اس کا انکار کیا، احادیث کو مطابقت میں رکاوٹ سمجھا تو اس پر ہاتھ صاف کیا، کسی نے اسلامی اصطلاحات پر ہاتھ ڈالا، کسی نے اسلام کے سیاسی نظام میں عہد حاضر کے لبرل سیاسی نظاموں کے مطابق تبدیلی کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے

فقہ المعاملات میں تغیر کا بیڑا اٹھایا اور سود جیسے قطعی و اجماعی حرمت رکھنے والے حکم کی حلت کا نظریہ پیش کیا، کسی مفکر نے اسلام کے نظام عفت وعصمت پر تیشہ چلایا، تو کسی نے اسلام کے عائلی نظام کو نشانہ بنایا، کسی نے فقہ الجہاد میں تغیر کی ضرورت محسوس کی، تو کسی نے اسلام کے نظام تزکیہ واحسان کو اپنا ہدف بنایا۔

چوں کہ ان ترمیمات وتغیرات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلاف سے مضبوط رشتہ تھا، اس لیے اسلاف کے تذکرے اور علما پر روایت پسندی کی پھبتی کسی گئی اور ہر ممکن طریقے سے راسخ العلم قدیم علما کی اہانت، مخالفت اور تمسخر ومذاق اڑانے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ ان متجددین نے موجودہ دور میں دنیاوی سطح پر مسلمانوں کے زوال میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے دین اور اسلام کی اس تشریح اور اس فہم کو سمجھا جو نسل در نسل، سینہ بسینہ اور طبقہ بہ طبقہ صحابہ کرام کے دور سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ ان متجددین کی مجالس، اقوال اور تصانیف میں مشترک طور پر مغرب کی مدح سرائی، مغربی نظام کی اصلحیت، نافعیت، مسلم دنیا کے مستقبل کے بارے میں مایوسی، دین اسلام کے متفقہ اجماعی احکام پر اشکالات، اعتراضات اور اسلامی تاریخ اور اسلاف امت کی تحقیر نظر آئے گی۔ متجددین کی تحریر وتقریروں میں تجدید، جدت، احیائے اصلاحات زمانے کے ساتھ ہم آہنگی، اجتہاد اور اس جیسے الفاظ کی کثرت ہے۔ ان کی نظر میں زوال کا سبب دین کی اصلی شکل وصورت پر اصرار ہے اور جس دن دین میں زمانے کے ساتھ تبدیلی وترمیم کا راستہ کھل گیا، اس دن سے مسلمان ترقی کی دور میں شامل ہو کر ترقی کی معراج پر پہنچ جائیں گے، **یا للعجب!**

متجددین دنیائے اسلاف کے ہر خطے اور ہر ملک میں پیدا ہوئے، لیکن برصغیر، ترکی اور مصر کو متجددین کے مراکز کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ برصغیر میں مرزا ابوطالب خان سے لے کر سرسید احمد خان، قیام پاکستان کے بعد تمنا عمادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے لے کر جاوید احمد غامدی تک متجددین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ترکی میں سلیم ثالث، محمود ثانی، مصطفیٰ کمال اتاترک سے لے کر شیخ احمد آفندی تک متجددین کی ایک لمبی کڑی ہے۔ مصر میں جمال الدین افغانی (موصوف اگر چہ اصلاً مصری نہیں تھے، لیکن چوں کہ ان کی فکر کو سب سے زیادہ فروغ مصر میں ملا اس لیے مصری متجددین میں ان کا تذکرہ کیا) مفتی محمد عبدہ، رشید رضا مصری سے لے کر مصر کے نامور ادبا تک ایک وسیع سلسلہ ہے۔ عالم اسلام کے مختلف خطوط کے متجددین کے افکار اور کام سے واقفیت کے لیے جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وتالیف کے سربراہ، جدیدیت وتجدد کی تردید میں قابل رشک مقالات لکھنے والے اور مغربی فکر وفلسفہ کے نبض شناس محترم خالد جامعی صاحب کا ایک طویل مقالہ عالم اسلام، معرکہ ایمان

ومادیت،جدیدت وروایت قرن اول سے عصر حاضر تک''مفید رہے گا جو جامعہ کراچی سے نکلنے والے تحقیقی رسالے''جریدہ'' کے پینتیسویں شمارے میں مکمل شائع ہو چکا ہے۔

## فضلا کی ذمہ داری:

عصر حاضر کے ان بڑے فکری چیلنجز کا مقابلہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔علمائے امت چوں کہ حدیث کے مطابق انبیا کے وارث ہیں،اس لیے ان کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ہمارے فضلا کو پانچ میدانوں میں ان تھک محنت کی ضرورت ہے۔

## ا۔اسلامی علوم میں کامل رسوخ ومہارت:

آج کے فضلا کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی علوم میں مکمل مہارت اور کامل استعداد سے تہی دامن ہوتے ہیں،جس کی بنا پر عصر حاضر کے فکری مسائل کا کما حقہ ردنہیں کرسکتے۔آج اس بات کی ضرورت ہے کہ تفسیر ،حدیث،فقہ،اصول حدیث،اصول فقہ اور دیگر علوم آلیہ میں اپنی صلاحیتوں کے مطابق استعداد پیدا کی جائے۔اسلامی علوم پر مکمل گرفت ہی عہد حاضر کے پیدا کردہ اشکالات واعتراضات کے قابل اطمینان حل کا ذریعہ ہے۔اس کے لیے جہاں نصاب میں قابل ذکر تبدیلیوں کی ضرورت ہے (جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں) وہاں مدارس میں ایسی فضا بنانی چاہیے جس میں طلبا کو نصابی کتب سے ہٹ کر دیگر مراجع تک رسائی ہو اور خارجی مطالعے کا ایک حوصلہ افزا ماحول میسر ہو۔

## ۲۔فرق وافکار کی تاریخی کا مطالعہ:

اسلامی تاریخ میں پیدا ہونے والے مختلف فرقے اور متنوع افکار کے حاملین افراد وگروہوں کی تاریخ کا مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔خصوصاً فرقوں کے رد کے لیے اسلاف امت کے مختلف مناہج،طریقہ کار اور طرز تردید کا ایک مبسوط مطالعہ کرنا چاہیے۔فتنوں کے تعاقب میں اسلاف امت کے مختلف طبقات نے اپنے اپنے فہم واجتہاد کی بنا پر مختلف طرز اپنائے۔محدثین کا منہج الگ تھا،متکلمین کا طرز اور تھا،صوفیا کا طریقہ الگ تھا۔پھر ان کے اندر قابل قدر شخصیات کے اسالیب مختلف تھے۔ان سب سے باخبر رہنا بھی ضروری ہے تاکہ موجود فتن میں مفید حل کی طرف رہنمائی مل جائے۔

## ۳۔ مغربی فکر وفلسفہ سے واقفیت:

عصر حاضر کی جملہ فکری گمراہیوں کا شجرہ نسب کسی نہ کسی صورت میں مغربی فکر فلسفہ سے ملتا ہے۔ اس لیے مغرب کا تحقیقی مطالعہ بھی بے حد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں مغربی افکار کی تاریخ، ارتقا اور ان میں حالات اسباب کی بنا پر متنوع تبدیلیوں سے واقفیت ہونی چاہیے۔ خصوصاً مارٹن لوتھر کی تحریک کے بعد کردار ادا کرے گا بسا اوقات فکری مسائل کو حل کرنے کی بجائے مزید الجھا دیتی ہے۔

## ۴۔ عالم اسلام کی احیائی وفکری تحریکات کا مطالعہ:

تقریبا پچھلے پانچ سو سال سے عالم اسلام روبہ زوال اور مغرب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں عالم اسلام سے مختلف خطوں میں متعدد فکری واحیائی تحریکیں اٹھیں، جن کا مقصد امت مسلمہ کو ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ دلانا تھا۔ ان تحریکوں کا ایک مبسوط مطالعہ ضروری ہے۔ ان کے بانیوں کے حالات، تحریکوں کے مدو جزر، نشیب وفراز اور ناکامی یا کامیابی پر منتج ہونے کی وجوہات سے واقفیت ہونی چاہیئے تاکہ موجودہ فکری چیلنجز سے نمٹنے میں ان غلطیوں سے بچنا آسان ہو جائے اور وہی غلطیاں دوبارہ نہ دہرائی جائیں جن کی وجہ سے کئی سو سال سے ہماری فکر یا اور علمی تحریکیں ناکام ہوتی آرہی ہیں۔

## ۵۔ عصر حاضر کے اسالیب تحریر اور جدید علوم سے بقدر ضرورت واقفیت:

آج عمومی طور پر ہمارے فضلا کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ تقریر وتحریر کے جدید اسالیب سے نابلد ہیں۔ آج کے محاورے، زبان، اصطلاحات اور جدید نسل کی علمی وذہنی سطح کے مطابق دین اسلام کے ابلاغ وتفہیم دینے سے قاصر ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کمپیوٹر وٹیکنالوجی سے مانوس نسل جب خطبا کے سامنے بیٹھتی ہے تو ان کی زبان سمجھ آتی ہے نہ ان کے طرز واسلوب سے مانوس ہوتے ہیں، جس سے دوری میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ جدید علم سیاست، معیشت اور سوشل سائنسز کا بقدر ضرورت مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ان جدید علوم سے بے خبری بسا اوقات جدید نسل کے مسائل اور معاصر فکری آرا کو سمجھنے میں غلطی کا باعث بنتی ہے، اس کے لیے اصحاب مدارس اور دین اسلام کا درد رکھنے والے مخلص جدید تعلیم یافتہ حضرات کو مل کر ایک عام فہم نصاب بنانا چاہیے جن سے ان علوم وافکار کے مبادیات بقدر ضرورت واقفیت میں مدد ملے اور وہ مزید مطالعہ وتحقیق کے بل بوتے پر ان علوم میں مہارت اور گہرائی پیدا کرنے پر قادر ہوں۔

بقلم: محمد سمیع اللہ سعدی (استاذ جامعہ فریدیہ، اسلام آباد)

ماہنامہ الشریعہ (نومبر ۲۰۱۵ء)

# نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندی مسلمانو!

عمیر انجم مالیگانوی

ہر چند کہ معاشرے اور سماج میں بے پناہ صلاحیتوں کے حاملین اور دانشوری کے سلاطین موجود ہیں؛ لیکن طبیعت کے اضمحلال اور قلب کی بے چینی نے چند سطر کی رقم طرازی پر مجبور کر دیا۔

ازل سے ہی اللہ رب العزت کا یہ دستور اور قانون رہا ہے کہ اس نے دنیا میں اصلاح اور سدھار کے طریقہ کو رواج دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام دنیا کے پہلے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے نبی بھی تھے، نبیوں اور رسولوں کا کام معاشرے اور سماج میں بڑھنے اور پنپنے والے جراثیموں کا خاتمہ اور ان کا سد باب ہوا کرتا تھا ۔نبیوں اور رسولوں کا یہ زریں سلسلہ فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ پر ختم ہو گیا۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس سنہری زنجیر کی آخری اور تابناک کڑی تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے نہ کہ آخری انسان، انسانوں کے توالد و تناسل کے اس سلسلے کو ابھی سیکڑوں، ہزاروں سال اور چلنا تھا اس کے لیے اللہ رب العزت نے کار نبوت کو امت محمدیہ کے بردوش کیا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین دیگر صحابۂ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، امرا، ملوک وسلاطین، علمائے کرام اور متبحرین قوم نے زمانے کے پیچ وخم اور اتار چڑھاؤ کے اعتبار سے اس کام کو آگے بڑھایا، جن کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ایک نام حضرت مولانا **غلام محمد** وستانوی صاحب کا بھی ہے، جو کسی بھی تعارف اور پہچان کا محتاج ومتلاشی نہیں ہے۔

حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی کی ذات اپنے اندر خلوص کا سمندر رکھتی ہے اور اس خلوص کا اثر اور عکس یہ ہے کہ اس شخص نے نہ عصبیت دیکھی نہ علاقائیت، نہ رنگ نہ روپ، نہ شرق نہ غرب، نہ کنبہ، نہ برادری۔ ہاں! اگر دیکھا تو قوم کی ناخواندگی، اس کی پسماندگی، اس کا رنج، اس کا ملال، اس کی بے راہ روی، اس کی گم گشتگی ۔اور ان تمام چیزوں کے تدارک اور سد باب کے لیے نہ دن دیکھا نہ رات، نہ نہار کی سختیاں، نہ لیل کی صعوبتیں، نہ حضرت نے آرام دیکھا نہ سفر کی تھکان، نہ موسمی تغیرات دیکھے نہ ان کے انقلابات۔

قوم کی خدمت کے لیے اس شخصیت نے طوفانوں کے رخ کو موڑ دیا، صعوبتوں اور تکالیف کے سمندر کو خشک کر دیا، بحر و بر کی وسعتوں کو سمیٹ کر رکھ دیا، لوگوں کے الزامات سہے، قانون کی دہلیز دیکھی؛ لیکن ان سب کے باوجود اس استقلال کے پہاڑ اور خلوص کے پیکر کے پیروں میں لرزش و جنبش تک نہ ہوئی اور وقت کا یہ مردِ مجاہد کوہ ہمالہ کی طرح تمام حالات کے سامنے بلا خوف لومۃ لائم ڈٹا رہا اور خاموشی کے ساتھ بہ زبان حال یہ اعلان کرتا رہا کہ

ہم کو ہلا سکے یہ زمانہ میں دم نہیں ہم سے زمانہ خود ہے، زمانہ سے ہم نہیں

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے دل میں خلوص کی طغیانی ہو، آن واحد میں بستیوں کی بستیوں کو خاکستر کر دینے والے جوالا مکھی کی سی حدّت اور گرمی ہو۔ حضرت مولانا غلام محمد صاحب کی ذات ان تمام اوصاف کا مخزن و معدن ہے۔

حضرت مولانا نے جہاں قوم و ملت کی دینی پیاس بجھائی وہیں قوم کی عصری تشنگی بجھانے کا سامان بھی مہیا کیا۔ آج جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا اور جامعہ کی شاخوں سے جتنے بھی اسکول اور کالجز مربوط ہیں یہ اس کا درخشندہ اور چمکتا ہوا ثبوت ہیں۔ اب یہ قوم کی حاضر باشی پر منحصر ہے کہ وہ ان دینی و عصری تعلیم کے امتزاج اور سنگم سے مزین اداروں سے کس قدر استفادہ کرتی ہے؟

ملک کے سیاسی حالات کے پیش نظر ان مخلوط اداروں سے الحاق و تعلق پیدا کرنا وقت کا تقاضا ہی نہیں ،بل کہ ہماری دانش مندی کا ثبوت بھی ہوگا۔ آج پورے ملک کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جارہی ہے اور مسلمانوں کو جمہوری حقوق تو درکنار شرعی حقوق تک سے بے دخل کرنے کی ناپاک کوششیں ہورہی ہیں، بات طول پکڑ جائے گی اس لیے ایک خاص طبقہ؛ جس کا تعلق اسکول اور کالجز سے ہے اس پر کچھ تبصرے کرتے ہیں۔

آج ہر بیدار مغز اور حالات کا شناور شخص اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ کس غیر محسوس طریقے سے طلبہ و طالبات کو دین سے دور کرنے کے لیے مختلف قسم کے حربے، ہتھکنڈے اور طریقے استعمال کیے جارہے ہیں۔

کبھی بات کی جاتی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں ''وندے ماترم'' کو لازم کیا جائے، کبھی ''سوریہ نمسکار'' کو ذہنی ورزش کے نام پر ہمارے طلبہ و طالبات پر تھوپنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی ''یوگا'' کے مختلف آسنوں کو جسمانی چستی و پھرتی کے نام سے ان طلبہ و طالبات پر مسلط کیا جاتا ہے، جو دراصل ہندو عقائد کی رو سے ایک طرح کی عبادت ہے، یہ سلسلہ یہیں پر رک جائے گا، اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ اب آگے دیکھئے کہ شطرنج کی اس بساط پر کون سا چہرہ سرکایا جاتا ہے اور ہمارے طلبہ کے سامنے نہ جانے اب تاش کے کس پتے کی رونمائی ہوتی ہے تاکہ اس طلبہ و طالبات کے ذہن کو منتشر کیا جاسکے اور انہیں صراط مستقیم سے ہٹایا جاسکے۔

ایسے پرفتن دوراوراشک آور دور میں ہمیں اپنے بچوں کے لیے بہت مضبوط قلعوں کی ضرورت ہے، یہ قلعے ایسے ہوں کہ جن کی دیواروں سے باطل قوتیں ٹکرا کر پاش پاش تو ہو جائیں، لیکن اس میں کوئی شگاف بھی نہ ڈال سکیں، اس کی فصیل اتنی بلند ہوں کہ کمند پھینکتے پھینکتے باطل کے ہاتھ شل ہو جائیں۔

دورحاضر میں جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کو تائید غیبی سمجھنا چاہیے کہ اس ادارے میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کا بھی نظم ہے، یہاں عصری تعلیم سے وابستہ بچوں کو اسکول اور کالج کے نصاب کے ساتھ ساتھ اسلامی عقائد اور نظریات سے بھی روشناس اور واقف کرایا جاتا ہے ان عبادات کو درست کرنے اور اس پر کاربند رہنے کی فکر کی جاتی ہے، ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہم نے یہاں پر عصری تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو ناظرہ درست کراتے ہوئے پایا، ان بچوں کے اندر دینی رجحان دیکھا اور بعض بچے تو اپنی عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ تکمیل حفظ قرآن کرتے ہوئے بھی پائے گئے۔

دسویں اور بارہویں کے بچوں کے امتحانات ختم ہو چکے ہیں اب یہ بچے اپنے تعلیمی سفر کو آگے جاری رکھنے کے لیے مختلف اسکولوں اور کالجوں کا رخ کریں گے اپنی تشنگی کو بجھانے کے لیے مختلف قسم کے پمفلٹ اور کتابچوں کی ورق گردانی کر سکیں۔ انٹرنیٹ پر اسکولوں اور کالجوں کی ویب سائٹس کھنگالیں، مختلف......... سے مشورہ طلب کریں اور اِس دوران یقین و بے یقینی کی صورت حال سے دوچار رہیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ اس ساری دماغ سوزی میں نہ پڑتے ہوئے دسویں اور بارہویں سے فارغ طلبہ وطالبات بلاتاخیر جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا رخ کریں۔ جہاں بی، یو، ایم، ایس کالج، انجینئرنگ کالج، بی فارمیسی وڈی فارمیسی کالج، پالی ٹیکنک کالج، آئی، ٹی، آئی کالج، جونیر کالج اور گیارہویں بارہویں، یہ مختلف کورسیس، تجربہ کار اور محنتی اساتذہ کی نگرانی میں چلائے جاتے ہیں۔ اور موقع بہ موقع حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی کے بیانات، ان کے ملفوظات اوران کی نصیحتوں سے مستفیض ہونے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔ اور حالات حاضرہ پر گہری نظر رکھنے والے جامعہ کے ناظم تعلیمات مولانا حذیفہ صاحب وستانوی بھی حالات کی بدلتی ہوئی کروٹ سے طلبہ کو باخبر کرتے رہتے ہیں۔

اگر خدانہ خواستہ ہم نے اس ادارے یا اس جیسے دیگر اداروں میں اپنے بچوں اور جگر گوشوں کو تعلیم نہیں دلایا تو پھر ہم انہیں مستقبل قریب میں صراط مستقیم سے ہٹتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہیں۔ اللہ ہماری اور ہمارے بچوں کی حفاظت فرمائے آمین!

☆......☆......☆

# رمضان المبارک کو قیمتی بنانے کے چند نسخے

مولانا محمد منصور احمد

رمضان المبارک اپنی تمام تر رحمتوں اور برکتوں کے ساتھ ہم پر سایہ فگن ہونے والا ہے، نیکیوں کے اس موسمِ بہار سے خوب فائدہ اٹھانے کے لیے یہ چند باتیں پیشِ خدمت ہیں:

☆ اس ماہِ مبارک میں قرآن مجید کی تلاوت پر خصوصی توجہ دیں، رمضان درحقیقت ماہِ قرآن ہے اور اس مہینے کو کلام الٰہی سے خصوصی مناسبت ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ماہِ مبارک میں قرآن مجید کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرلیں، اگر ساتھ ساتھ علمائے حق کی مستند تفاسیر میں سے کسی کا مطالعہ اور ان کے حلقۂ درسِ قرآن میں شمولیت کی سعادت بھی مل جائے تو کیا کہنے!

☆ دعا، استغفار، ذکر الٰہی اور درود شریف کی خوب کثرت کریں، چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے اپنی زبان کو ان مبارک کلمات کا عادی بنائیں، فضول باتوں اور بیہودہ گوئی سے مکمل پرہیز اور احتراز کریں۔

☆ اپنی استطاعت کے مطابق مسلمانوں کو روزہ افطار کروانے کا اہتمام کریں کہ یہ بہت بڑی نیکی ہے، اس کے علاوہ بھی اللہ کے راستے میں نیز فقرا اور مساکین پر خوب خرچ کریں؛ کیوں کہ رمضان المبارک میں صدقات وخیرات کا اجر بھی کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔

☆ تراویح اور نمازِ تہجد کو مکمل توجہ اور اہتمام سے ادا کرنے کی عادت بنالیں۔ سستی اور غفلت کی بجائے چستی اور تندہی سے تمام عبادات ادا کریں۔

☆ رمضان المبارک کا ایک منٹ کتنا قیمتی ہے؟ اندازہ لگائیں کہ ماہِ مبارک کے صرف ایک منٹ میں ہم کیا کچھ کرسکتے ہیں؟

## رمضان المبارک کا ایک منٹ:

(۱) ایک منٹ میں آپ سورۂ فاتحہ جتنی سورت بآسانی تلاوت کرسکتے ہیں اور قرآن کریم کے ہر حرف پر کم از کم دس نیکیاں تو یقینی ہیں، اس طرح ایک منٹ میں سیکڑوں نہیں ہزاروں نیکیاں جمع کی جاسکتی ہیں۔

(۲) آپ کوشش کرکے ایک چھوٹی آیتِ کریمہ ایک منٹ میں زبانی بھی یاد کر سکتے ہیں۔

(۳) آپ ایک منٹ میں کئی مرتبہ بہ سہولت یہ کلمہ پڑھ سکتے ہیں: ﴿**لا إلـه إلا الـلـه وحـده لا شريک له، له الملک وله الحمد وهو على كل شيء قدير**﴾۔

(۴) ایک منٹ میں آپ بہ آسانی درجنوں مرتبہ یہ کلمہ پڑھ سکتے ہیں: ﴿**سبحان الله وبحمده**﴾۔

(۵) ایک منٹ میں آپ بہ آسانی بیس سے پچیس مرتبہ ان الفاظ کے ساتھ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ ﴿**صلى الله عليه وسلم**﴾

(۶) ایک منٹ میں آپ سو مرتبہ ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش اور معافی مانگ سکتے ہیں۔ ﴿**استغفر الله العظيم**﴾

(۷) ایک منٹ میں آپ کسی کو کوئی اچھی بات بتا سکتے ہیں یا کسی کو برے کام سے روک سکتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ فریضہ ادا کرنے اور اس کا اجر وثواب حاصل کرنے کے لیے فون یا موبائل بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۸) ایک منٹ میں آپ کسی مسلمان کے ساتھ غم خواری کر سکتے ہیں۔ کسی بیمار مسلمان کی عیادت کر سکتے ہیں، کسی فوت شدہ مسلمان کی تعزیت اور کسی رشتے دار کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتے ہیں۔

(۹) ایک منٹ میں آپ دین کی کوئی بات، عبادات معاملات وغیرہ کے بارے میں کوئی دینی مسئلہ یا فتویٰ معلوم کر سکتے ہیں اور اس طرح آپ علمِ دین حاصل کرنے کا ثواب حاصل کر لیں گے۔

(۱۰) ایک منٹ میں آپ کئی اچھی نیتیں اور ارادے کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر نیکی پر بھی ایک اجر ہے۔

**برکاتِ رمضان کا حساب:**

☆ ایک اللہ والے نے رمضان المبارک کی برکات کا یوں بھی حساب لگایا ہے:

☆ رمضان المبارک کا ایک روزہ سال بھر کے تین سو چوّن مسلسل روزوں سے زیادہ ثواب رکھتا ہے۔

☆ بلا عذر اگر اس کا ایک روزہ بھی نہ رکھا گیا تو عمر بھر کے روزے بھی اس کی جگہ کافی نہیں ہوں گے۔

☆ رمضان میں ہر فرض کا ثواب ستر گنا، ہر نفل، اعتکاف و ذکر اور ہر نیک کام کا ثواب ستر گنا ہو کر فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔

☆ نماز کا ثواب گھر پر ایک کا، مسجد میں پچیس کا، جامع مسجد میں پچاس کا تھا، لیکن رمضان میں ستر گنا اور زائد ہوگیا۔ اس لیے رمضان میں گھر پر ستر، مسجد میں سترہ سو پچاس، جامع مسجد میں تین ہزار پانچ سو ہو جاتا ہے اور پانچوں نماز کا گھر پر (۲۵۰) کا، مسجد میں آٹھ ہزار سات سو پچاس کا، اور جامع مسجد میں سترہ ہزار پانچ سو کا روزانہ ثواب ہوگا۔

☆ جماعت کا ستائیس گنا، پنج وقتہ ایک سو پینتیس اور رمضان کا ستر گنا' نو ہزار چار سو پچاس ثواب ہوگا۔

☆ قرآن مجید کے ہر حرف پر دس نیکیاں؛ تو رمضان میں سات سو ہوں گی۔ قرآن کے کل حروف تین لاکھ تیس ہزار چھ سو اکہتر، اس طرح پورے قرآنِ مجید کا ثواب رمضان میں بائیس کروڑ پینسٹھ لاکھ انہتر ہزار سات سو بنتا ہے، سننے والے کو بھی اتنا ہی ثواب اور جو سمجھ کر پڑھے یا سنے اسے اتنا ہی مزید ثواب اور جو پڑھے بھی، خود سنے بھی اور سمجھے بھی اسے اس ثواب کا تین گنا یعنی سڑسٹھ کروڑ چھیانوے لاکھ نو ہزار ایک سو ثواب ملے گا۔ اس کے علاوہ قرآن کو مس کرنا یعنی چھونا اور دیکھنا یہ بھی دس دس گنا زیادہ عبادات ہیں، اسی طرح پورا قرآن مجید پڑھنے پر تیرہ ارب انسٹھ کروڑ اکیس لاکھ بیاسی ہزار ثواب ہوگا۔

☆ قرآن مجید پڑھنے کا یہ عظیم الشان ثواب شبینہ کی رات میں حاصل ہوسکتا ہے، بشرطیکہ کسی مکروہ یا خلاف شرع یا ریا و نمود سے اس شبینہ کو ملوث نہ کیا جائے۔

☆ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جو سب کو یاد ہے اس کے انیس حروف ہیں اور رمضان مین تیرہ ہزار تین سو نیکیاں صرف ''بسم اللہ'' کے پڑھنے پر ملیں گی، اور جو جو سورتیں حفظ ہوں، وضو یا بے وضو چلتے پھرتے ہر حرف پر اتنی ہی نیکیاں مفت ملیں گی۔

☆ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ نیک کام کا ثواب ستر گنا ہے، خواہ راستہ سے کانٹا ہٹانا ہی ہو۔

☆ ایک بار درود شریف پر دس نیکیاں اور دس رحمتیں جو رمضان میں سات سو ہوتی ہیں، سب سے مختصر درود ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ہے، جو ایک منٹ میں سو بار ہوسکتا ہے اور جس کا ثواب رمضان میں ستر ہزار فی منٹ ہوا تو ڈیڑھ منٹ میں ایک لاکھ پانچ ہزار نیکیوں سے لکھ پتی ہو گئے۔

☆ شبِ قدر ہزار ماہ یعنی تیس ہزار دن اور تیس ہزار رات کے برابر یعنی ساٹھ ہزار گنا ثواب ہے۔ غروبِ شمس سے صبح صادق تک ہر منٹ کا ثواب ساٹھ ہزار منٹ کے برابر ہے، ایک منٹ کا ضائع کرنا بھی کس قدر خسارہ کی بات ہے۔

☆ نیکی کی ترغیب پر اتنا ہی ثواب ہے جتنا کرنے والے کو ہے۔ اس لیے ہر وقت ہر نیک کام کی ترغیب دی جائے؛ تا کہ اس کے برابر ثواب ملتا رہے اور ہر برے کام سے روکنے کی تدبیر بھی تا کہ اس سے بچنے کے برابر بھی ثواب حاصل ہو۔

☆ اعتکاف پر انسان اور دوزخ کے درمیان تین خندق کا فاصلہ ہو جاتا ہے، مسجد میں قدم رکھتے ہی واپسی تک کے نفلی اعتکاف کی نیت سے مفت کا یہ ثواب حاصل ہوگا۔

☆ زکوٰۃ وعشر میں اور صدقہ وخیرات میں رمضان کی وجہ سے ستر گنا ثواب زائد ہوگا۔

☆ ان سب کاموں میں ایصال ثواب کی بھی نیت کی جاسکتی ہے۔ خواہ مردہ کو خواہ زندہ کو؛ خواہ ان لوگوں کو جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ ایصالِ ثواب میں سب مسلمانوں کی نیت کرنی چاہیے، کیوں کہ ثواب تقسیم نہیں ہوسکتا، بل کہ پورے کا پورا ہر ایک کو ملتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

## ماہِ رمضان میں اجتنابِ گناہ کا التزام:

سب سے اہم بات جس کا ماہِ مبارک میں خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی سے بچانے کی پوری پوری کوشش کی جائے یہ وہ پہلی شرط اور بنیادی بات ہے جس کو پورا کیے بغیر انسان ماہِ مبارک سے ہرگز کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا؛ کیوں کہ روزہ تو ہے ہی ہم سے نافرمانی اور گناہ چھڑانے کے لیے اور نیکی اور فرماں برداری کے راستے پر چلانے کے لیے جس کا دوسرا نام تقویٰ ہے۔

کھانا پینا اور حلال ازدواجی تعلقات عام دنوں میں مسلمانوں کے لیے حلال تو ہیں، لیکن رمضان المبارک میں کچھ وقت کے لیے ان سے روک دیا جاتا ہے، اس کے بجائے جھوٹ، غیبت، سود، رشوت، غیر محرم کو دیکھنا، گانا سنانا، تصویر بنوانا، داڑھی مونڈنا، پردہ نہ کرنا، گالی دینا، دھوکہ دینا اور ان جیسے دوسرے گناہ تو وہ ہیں جو سرے سے ہیں ہی حرام۔ اب اگر کوئی بندۂ خدا ان روزوں میں حلال سے تو رُک گیا، لیکن حرام سے نہ رُکا تو اس کا کیا روزہ ہوا؟ کہ حلال سے بچا رہا اور حرام سے نہیں بچا، جب کہ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں کہ روزہ کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمہارے اندر پرہیزگاری یعنی گناہ سے بچنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ آج اس تناظر میں تمام مسلمان روزہ داروں کو اپنا محاسبہ کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ آیا وہ ناجائز امور؛ جن کو شریعتِ مطہرہ نے منع فرمایا ہے، ہم نے رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کے بعد چھوڑ دیے یا نہیں۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو فوراً ہی اسے چھوڑنے کی کوشش شروع کردی جائے، یہ روزے کا سب سے اولین تقاضا ہے۔

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس روئے زمین پر اللہ جل شانہ کے نزدیک سب سے پیاری جگہ ''مسجدیں'' ہیں اور سب سے بری جگہ ''بازار'' ہیں۔ مسلمان مردوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت مسجد میں آکر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہیں، جس کی ایک شکل اعتکاف ہے، لیکن مسلمان عورتوں کے لیے تو اس کائنات کی سب سے اچھی اور پسندیدہ جگہ یعنی مسجد میں جانے کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، بل کہ ان کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ گھر کے اندر عبادت کریں، تو زیادہ فضیلت اور ثواب کا باعث ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب مسلمان عورتوں کے لیے مساجد میں جانا جو سب سے اچھی جگہیں ہیں، اتنا اچھا نہیں تو بازار جو سب سے بری جگہیں ہیں وہاں بلاضرورت اور بغیر شدید مجبوری کے بے پردہ گھومتے رہنا، وہ بھی ماہِ مبارک کی نورانی راتوں میں کس قدر خطرناک اور آخرت کے اعتبار سے نقصان دہ ہوگا۔

## انسانی شیطان سے بچیں!

نیکیوں کے اس موسم میں سرکش شیاطین تو قید کردیے جاتے ہیں، لیکن گذشتہ کئی سالوں سے میڈیا پر بہت سے انسان نما شیاطین مسلمانوں کے روزے خراب کرنے کے لیے نمودار ہوجاتے ہیں۔ پورے سال تو یہ لوگ ناچنے گانے میں گزارتے ہیں، لیکن اس ماہِ مبارک میں نیک لوگوں کے لبادے میں لوگوں کا رمضان برباد کرنے کے لیے خوب محنت کرتے ہیں، ایسے فنکاروں اور عیاروں سے اپنے ایمان کو بچانے کی سخت ضرورت ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ نے روزہ کو خراب کرنے والے گناہوں (غیبت وغیرہ) سے بچنے کی تدبیر بتلائی ہے، جو صرف تین باتوں پر مشتمل ہے اور ان پر عمل کرنا بہت ہی آسان ہے۔ ''مخلوق سے بلاضرورت تنہا اور یکسو رہنا۔ کسی اچھے شغل مثلاً: تلاوت وغیرہ میں لگے رہنا اور نفس کو سمجھانا۔ یعنی وقتاً فوقتاً یہ دھیان کرتے رہنا کہ ذرا سی لذت کے لیے صبح سے شام تک کی مشقت کو کیوں ضائع کیا جائے اور تجربہ ہے کہ نفس بہلانے سے بہت کام کرتا ہے، سو نفس کو یوں بہلائے کہ ایک مہینے کے لیے تو ان باتوں کی پابندی کرلے پھر دیکھا جائے گا۔ پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ جس طرز پر آدمی ایک مدت رہ چکا ہو، وہ آسان ہوجاتا ہے، بالخصوص اہل باطن کو رمضان میں یہ حالت زیادہ نصیب ہوتی ہے کہ اس مہینے میں جو اعمالِ صالحہ کیے ہوتے ہیں سال بھر ان کی توفیق رہتی ہیں۔''

اللہ تعالیٰ اس ماہِ مبارک کو پوری امتِ مسلمہ کے لیے خیرات وبرکات اور فتوحات کا مہینہ بنائیں۔ (آمین ثم آمین)

# مسلمان کی عید

مولانا محمد منصور احمد

رمضان المبارک کی محنتوں، قربانیوں اور نیکیوں کے صلے میں اہلِ ایمان کو عید الفطر کا انعام ملتا ہے، عید کا لفظ ہی ایسا ہے کہ زبان پر آتے ہی منہ میں مٹھاس اور طبیعت میں بشاشت پیدا ہو جاتی ہے۔

ویسے تو دنیا میں سب لوگ ہی اپنے تہوار مناتے ہیں اور ہر سال کسی خاص دن میں اپنی خوشیوں اور مسرتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اہلِ اسلام کی عید میں اور غیروں کی عید میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ دوسری قوموں کے ہاں عید کا مطلب صرف موج مستی اور عیاشی ہے۔ ان کے تہوار صرف اسی سوچ پر مبنی ہوتے ہیں کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ نفس پرستی کر لی جائے اور خوب مزے اڑا لیے جائیں، اسی لیے وہ اپنے خوشی کے تہواروں پر کسی روک ٹوک یا کسی پابندی کے قائل نہیں۔

ان کے قومی تہواروں پر بے راہ روی کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگائیں کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر کا من گھڑت یوم پیدائش ۲۵ دسمبر مقرر کر لیا گیا۔ اور پھر اس کی نسبت سے ہر سال ''کرسمس ڈے'' منایا جانے لگا۔ عیسائی دنیا میں جتنی شراب اس موقع پر پی جاتی ہے، پورے سال نہیں پی جاتی، اور جتنی اخلاقی پستی کے مظاہرے، ایک پاک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزعومہ یومِ پیدائش پر ''نظر آتے ہیں'' سال بھر دکھائی نہیں دیتے۔

اس کے برخلاف مسلمانوں کی جو دو سالانہ عیدیں ہیں۔ ''عید الفطر'' اور ''عید الاضحیٰ'' دونوں ہی کو خاص اعمال کے بعد مقرر فرما کر اُن میں ایک خوب صورت اور ایمان افروز نظریہ سمو دیا گیا ہے، ''عید الفطر'' کا انعام تب نصیب ہوتا ہے، جب مسلمان پورے ایک مہینہ تک اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بھوک پیاس برداشت کر کے روزے جیسی عبادت سرانجام دیتے اور اپنے عمل سے اپنے آپ کو انعام کا مستحق بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح ''عید الاضحیٰ'' تب منائی جاتی ہے، جب دنیا بھر سے آئے مسلمان حج بیت اللہ شریف کی سعادت حاصل کرتے اور مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری وجود میں آتی ہے، جس میں امیر و غریب، حاکم و محکوم، بادشاہ و رعایا، عرب و عجم اور مشرق و مغرب کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ پھر ساتھ ہی اس عید میں ساری دنیا کے صاحبِ حیثیت مسلمان قربانی کا عمل ادا کرتے ہیں، جو خود سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یادگار ہونے کی حیثیت سے ایک بہت عظیم ایمانی اور روحانی پیغام ہے۔

آگے مزید دیکھیے کہ مسلمانوں کی دونوں عیدیں جب شروع ہوتی ہیں تو اُس دن کا آغاز دو رکعت نمازِ

عید واجب سے ہوتا ہے۔اور مسلمان یہ نماز ادا کر کے اس بات کا عملی اظہار کرتے ہیں کہ ہماری عید صرف وہی ہے، جس میں ہمارے رب تعالیٰ جل شانہٗ کی خوش نودی اور رضامندی ہو، جس بندے سے اس کا خالق و مالک ناخوش ہو، اس کے لیے بھلا خوشی کا کیا مطلب اور مسرت کا کیا موقع ہے؟

اسلام نے خوشی اور مسرت کے اظہار سے منع نہیں کیا۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ دینی زندگی اختیار کرنے کا مطلب صرف خشک مزاجی اور روکھا پن ہے تو ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرے۔ جہاں اسے زندگی اپنی تمام تر حقیقی رعنائیوں اور خوب صورت رنگینیوں کے ساتھ نظر آئے گی۔ خوش مزاجی، دائمی تبسم، خندہ پیشانی، بامعنی اور برمحل تبصرے اور پُر لطف جاندار جملے، یہ سب کچھ اُس نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر ورق پر ہمیں مل جائے گا، جنہیں قیامت تک کے انسانوں کے لیے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا گیا ہے۔

البتہ اسلام نے ایسی تفریحات سے ضرور روکا ہے جو معاشرے میں خرابیوں کے جنم لینے کا باعث بنیں یا اُن سے کسی قسم کی اخلاقی بے راہ روی پیدا ہو۔ اسلام نے جن کاموں پر پابندی عائد کی جیسے شراب نوشی، جُوا، مرد و زن کا اختلاط اور دیگر ایسے تمام فواحش و منکرات، تو اس پابندی میں ہی انسانی معاشرے کی بقا اور صلاح پوشیدہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی انسانوں نے ان پابندیوں کو توڑ کر مادر پدر آزادی کا مظاہرہ کیا تو نتیجے میں ایسے اخلاقی بگاڑ اور انسانی بحران پیدا ہوئے کہ انسانیت کا سر شرم سے جھک گیا۔

تعجب تو اُن لوگوں پر ہے جو اپنے جیسے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے احترام کو تو ضروری گردانتے ہیں۔ اور یہ پابندیاں اُنہیں ایک انسانی معاشرے کی اصلاح کے لیے ضروری معلوم ہوتی ہیں، اُن کے نزدیک ان پابندیوں سے انسانی حقوق متاثر ہوتے ہیں، اور نہ ہی وہ آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہیں۔ لیکن جوں ہی ایسے لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کسی پابندی کا تذکرہ کیا جائے، جو کسی انسان کی طرف سے نہیں، بل کہ ہم سب کے خالق و مالک اور نفع و نقصان کو جاننے والے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی گئی ہوں، تو اُنہیں قسما قسم کے اعتراضات سوجھنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہیں:

﴿ولا تكونوا كالذين نسوا الله فأنسهم أنفسهم، أولئك هم الفاسقون﴾ (سورۂ حشر)

ترجمہ: (اور تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بُھلا دیا، تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اپنے آپ بُھلا دیا، ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔)

اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ آج وہ معاشرے جو خدائی پابندیوں سے آزاد اور وحیٔ الٰہی کی راہنمائی سے محروم ہوئے۔ وہاں اخلاقی قدروں اور انسانی اعلیٰ روایات تک کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ایسی ایسی اخلاقی اور

معاشرتی برائیاں اور خرابیاں جنم لے رہی ہیں کہ قلم میں اُن کو تحریراً لانے کی سکت نہیں ہے۔ اہلِ وطن کو یورپ اور امریکہ کے عشق میں مبتلا کرنے کے لیے وہاں کے صرف ظاہری خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے، لیکن جو لوگ ایمان کی نگاہوں سے خود وہاں کی سوسائٹی کو دیکھ کر آئے ہیں، وہ جب اُن کا کھوکھلا پن اور حد سے بڑھی ہوئی بے راہ روی اور مادر پدر آزادی، رشتوں کی بے اعتباری اور انسانیت کی توہین وتذلیل کے واقعات سناتے ہیں تو انسان کانوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسلام سے قبل دورِ جاہلیت میں اہلِ مدینہ دو تہوار مناتے تھے۔ جو جاہلی مزاج وتصورات اور جاہلی روایات کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان قدیمی تہواروں کو ختم کر کے ان کی جگہ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ دو تہوار اس امت کے لیے مقرر فرما دیے، جو اس کے دینی مزاج اور اصولِ حیات کے عین مطابق اور اس کی تاریخ وروایات اور عقائد وتصورات کی پوری آئینہ دار ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اہل مدینہ (جن کی کافی تعداد پہلے سے اسلام قبول کر چکی تھی) دو تہوار منایا کرتے تھے اور ان میں کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ: یہ دو دن جو تم مناتے ہو ان کی کیا حقیقت اور حیثیت ہے؟ (یعنی تمہارے ان تہواروں کی کیا اصلیت اور تاریخ ہے؟) انہوں نے عرض کیا: ہم جاہلیت میں (یعنی) اسلام سے پہلے یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، (بس وہی رواج ہے جو اب تک چل رہا ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان دو تہواروں کے بدلہ میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ (اب یہی تمہارے قومی اور مذہبی تہوار ہیں) یوم عیدالاضحیٰ اور یوم عیدالفطر۔ (سنن ابی داؤد)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدالفطر کے دن دو رکعت نماز پڑھی اور اس سے پہلے یا بعد (یعنی نمازِ عید کے اول وآخر) آپ نے کوئی نفل نماز نہیں پڑھی۔ (بخاری ومسلم)

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ معمول یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کی نماز کے لیے کچھ کھا کر تشریف لے جاتے اور عیدالاضحیٰ کے دن نماز پڑھنے تک کچھ نہیں کھاتے تھے۔ (جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی)

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ بھی مروی ہے کہ عیدالفطر کے دن نماز کو تشریف لے جانے سے پہلے آپ چند کھجوریں تناول فرماتے تھے اور طاق عدد تناول فرماتے تھے۔

عیدالاضحیٰ کے دن نماز کے بعد کھانے کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اس دن سب سے پہلے قربانی ہی کا گوشت منہ میں جائے۔ جو ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی ضیافت ہے، اور عیدالفطر میں علی الصبح نماز سے پہلے ہی کچھ کھا لینا غالباً اس لیے

ہوتا تھا کہ جس اللہ کے حکم سے رمضان کے پورے مہینہ دن میں کھانا پینا بالکل بند رہا۔ آج جب اس کی طرف سے دن میں کھانے پینے کی اجازت ملی اور اسی میں اس کی رضا اور خوش نودی معلوم ہوئی تو طالب محتاج بندہ کی طرح صبح ہی اس کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے لگے کہ بندگی کا مقام یہی ہے۔ (معارف الحدیث ج ۳، کتاب الصلوٰۃ)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن راستہ بدل دیتے تھے۔ (صحیح بخاری)

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے جس راستہ سے عیدگاہ تشریف لے جاتے تھے، واپسی میں اس کو چھوڑ کر دوسرے راستہ سے تشریف لاتے تھے۔ علما نے اس کی مختلف حکمتیں بیان کی ہیں، ان میں سے زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ آپ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ اس طرح شعائرِ اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعیت وشوکت کا زیادہ سے زیادہ اظہار واعلان ہو۔ نیز عید میں جشن اور تفریح کا جو پہلو ہے اس کے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ مختلف راستوں اور بستی کے مختلف حصوں سے گزرا جائے۔

اہلِ علم نے ان احادیث اور دیگر روایات کی روشنی میں لکھا ہے کہ عیدالفطر کے دن تیرہ کام مسنون ہیں:

(۱) شرعی حدود میں رہتے ہوئے اپنی آرائش کرنا۔ (۲) غسل کرنا۔ (۳) مسواک کرنا۔ (۴) اپنے کپڑوں میں سب سے عمدہ لباس پہننا۔ (۵) خوش بو لگانا۔ (۶) صبح کو بہت جلدی اٹھنا۔ (۷) عیدگاہ جلد از جلد پہنچنا۔ (۸) عیدگاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز مثلاً کھجور کھانا۔ (۹) عیدگاہ جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کر دینا۔ (۱۰) نمازِ عید، عیدگاہ میں ادا کرنا (یعنی بلا عذر مسجد میں نہ پڑھنا)۔ (۱۱) عیدگاہ جانے اور آنے کے لیے راستہ تبدیل کرنا۔ (۱۲) اگر زیادہ دور نہ ہو تو پیدل جانا۔ (۱۳) عیدگاہ جاتے ہوئے راستے میں "**اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد**" آہستہ آواز سے پڑھنا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عید کا دن مبارک اور خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی خوشی کافروں کی طرح نہیں منانی چاہیے۔ ناچ گانا، فحاشی عریانی، عورتوں مردوں کا مخلوط اجتماع اور ٹی وی فلم وغیرہ دیکھنا سب اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کام ہیں، یہ خوشی جس رب نے عطا کی ہے، ہر لمحہ اس کو خوش رکھنے والے کام کرنے چاہئیں۔

اسی طرح عید کے موقع پر ہمیں امتِ مسلمہ کے مظلوم مردوں عورتوں اور بچوں کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان سب سے ہمارا کلمۂ طیبہ "**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**" کا مضبوط رشتہ ہے۔

بے شک سچ ہے کہ:

اخوت اس کو کہتے ہیں، چبھے کانٹا جو کابل میں تو ہندوستان کا ہر پیر و جوان بے تاب ہو جائے

اللہ تعالیٰ اس عید کو پوری امتِ مسلمہ کے لیے خوشیوں، مسرتوں، رحمتوں، برکتوں اور آزادیوں کا پیغام بنائے۔ (آمین)

# تحفۂ رمضان

ماخوذ از: تحفۂ رمضان (افادات حکیم الامتؒ) مرتب: ابوحذیفہ محمد اسحاق عفی عنہ

## رمضان کو رمضان کہنے کی وجہ؟

وجہ تسمیہ حدیث میں یہ آتی ہے "فانھاتر مض الذ نوب"، یہ رمض سے مشتق ہے اور رمض کے معنی لغتِ عربیہ میں جلا دینے کے ہیں، چوں کہ اس مہینے کی خصوصیت ہے کہ مسلمانوں کو گناہوں سے پاک صاف کر دیتا ہے بشرطیکہ مسلمان رمضان المبارک کا پورا احترام اور اس کے اعمال کا اہتمام کرے۔

## رمضان شریف میں امت پر پانچ خصوصی انعام:

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ: "آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ رمضان شریف کے متعلق میری امت کو خاص طور پر پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو پہلی امتوں کو نہیں ملیں۔

(۱) روزہ دار کے منہ کی بدبو (جو بھوک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے) اللہ تعالی کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے)

(۲) ان کے لیے دریا کی مچھلیاں تک دعائے مغفرت کرتی ہیں اور افطار کے وقت تک کرتی رہتی ہیں۔

(۳) جنت ہر روز ان کے لیے سجائی جاتی ہے، پھر حق تعالی شانہ فرماتے ہیں: کہ قریب ہے کہ میرے بندے (دنیا کی) مشقتیں اپنے اوپر سے پھینک کر تیری طرف آئیں۔

(۴) اس ماہِ مبارک میں سرکش شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں کہ وہ رمضان میں ان برائیوں کی طرف نہیں پہنچ سکتے، جن کی طرف غیرِ رمضان میں پہنچ سکتے ہیں۔ (یعنی رمضان میں شیاطین قید ہونے کی بنا پر روزہ داروں کو گناہوں پر نہیں ابھار سکتے، لیکن انسان کا نفس گناہ کرانے میں شیاطین سے کم نہیں ہے اور گناہوں کا چسکا بھی گناہوں کی پٹڑی پر چلاتا رہتا ہے؛ تاہم پھر بھی گناہوں کی کمی اور عبارت کی کثرت کا ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے)۔

(۵) رمضان کی آخری رات میں روزہ داروں کے لیے مغفرت کی جاتی ہے صحابہ نے عرض کیا کہ کیا یہ شبِ مغفرت شبِ قدر ہے؟ فرمایا: نہیں۔ بل کہ دستور یہ ہے کہ مزدور کو کام ختم ہونے کے وقت مزدوری دے جاتی ہے۔ (الترغیب والترہیب)

## اے نیکی کے طالب! آگے بڑھ:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ رمضان کی جب پہلی رات ہوتی ہے، تو شیاطین کو بند کر دیا جاتا ہے، مضبوط باندھ دیا جاتا ہے، سرکش جنوں کو بھی بند کر دیا جاتا ہے، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اس کا کوئی دروازہ بھی کھولا نہیں جاتا، بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اس کا کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ اور ایک آواز دینے والا آواز دیتا ہے کہ اے نیکی کے طالب آگے بڑھ کہ نیکی کا وقت ہے اور اے بدی کے چاہنے

والے بدی سے رک جا۔اور اپنے نفس کو گناہوں سے باز رکھ۔کیوں کہ یہ وقت گناہوں سے توبہ کرنے اور ان کو چھوڑنے کا ہے اور خدا تعالی کے لیے ہے دوزخ کی آگ سے آزاد کیے ہوئے۔یعنی اللہ تعالی آزاد کرتا ہے بہت بندوں کو دوزخ کی آگ سے بحرمت اس ماہ مبارک کے اور یہ آزاد کرنا رمضان شریف کی ہر رات میں ہے شبِ قدر کے ساتھ مخصوص نہیں۔(ترمذی شریف)

## فائدہ: شیاطین اور جنوں کے قید کرنے کی حکمت:

اس ماہ مبارک کے اندر شیاطین اور سرکش جنوں کے قید کر دینے میں حکمت یہ ہے کہ وہ روزہ داروں کے دلوں میں وسوسہ گناہوں کا نہ ڈال سکیں اور معصیت کی طرف ان کو نہ بلائیں؛ اسی کا یہ اثر ہے کہ اکثر گرفتارانِ معاصی اس ماہِ مبارک میں گناہوں سے پرہیز کرنے لگتے ہیں اور اللہ تعالی کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔

## شیاطین کے قید ہو جانے کے باوجود بعض لوگوں سے گناہ کیوں ہو جاتے ہیں؟

بعض لوگوں سے اس ماہ کے اندر بھی جو معاصی (گناہوں) کا صدور ہو جاتا ہے، اس میں شیاطین کی پہلی وسوسہ اندازی اور سابقہ عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کی وجہ سے اس مبارک زمانہ میں بھی ان سے گناہ ہو جاتے ہیں یا یہ اثر ہے نفس کی قوت (برائی کر طرف لے جانے والی قوت) داعیہ الی الشر کا کہ نفس گناہوں کی طرف رغبت دلاتا ہے اس لیے گناہ ہو جاتے ہیں، شیاطین کے اثر سے گناہ نہیں ہوتے۔تو جو گناہ اس مبارک ماہ میں ہوتے ہیں وہ نفس کے تقاضا اور اس کی قوۃ داعیہ الی الشر کے سبب ہوتے ہیں اور شیاطین کے وساوس کی وجہ سے جو گناہ رمضان سے قبل ہوا کرتے تھے ان سے اس زمانہ میں لوگوں کو محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

## شاہ محمد اسحٰقؒ کا جواب:

اس اشکال کا ایک جواب استاذ الکل حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلویؒ نے دیا ہے، جس کو صاحبِ مظاہر حق نے پسند فرمایا ہے۔اس کا حاصل یہ ہے کہ فاسقوں کے بہکانے سے صرف سرکش شیطان روک دیے جاتے ہیں اور کم درجہ کے شیطان ان کو بہکاتے رہتے ہیں۔جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بہ نسبت اور دنوں کے ایامِ رمضان میں گناہ کم کرتے ہیں، لیکن کچھ گناہ ان سے ہوتے رہتے ہیں۔

## مسلمانوں کی ذمہ داری:

ماہِ مبارک کی ان تمام فضیلتوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کو اس مہینہ میں عبادت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔اور کوئی لمحہ ضائع اور بے کار جانے نہیں دینا چاہیے۔شب و روز کے ساعات کو اعمالِ صالحہ کے ساتھ مزین و معمور رکھنے کی سعی اور کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔

# رمضان اور روزہ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ، لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ۔ (بیان القرآن)

حدیث: عن ابی هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من افطر يوما من رمضان من غير رخصة ولا مرض لم يقضه صوم الدهر كله و ان صامه. (رواه احمد و ترمذی و ابوداؤد)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص (قصداً) بلا کسی شرعی عذر کے ایک دن بھی رمضان کے روزہ کو افطار کردے، غیرِ رمضان کا روزہ چاہے تمام عمر کے روزے رکھے اس کا بدل نہیں ہوسکتا۔

## روزہ کی خصوصیت اور حدیث قدسی کی حکیمانہ تشریح:

روزہ خدا تعالیٰ کا وہ بابرکت فریضہ ہے، جس کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اور قیامت کے دن حق تعالیٰ اس کا بدلہ اور اجر بغیر کسی واسطہ کے بذاتِ خود روزہ دار کو عنایت فرمائیں گے؛ چناں چہ حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے "الصوم لی وانا اجزی به" روزہ میرا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نماز روزہ سب عبادات اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، اسی کو راضی اور خوش کرنے کے لیے سب عبادات کی جاتی ہیں۔ مگر روزہ ایک عجیب خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ ریا اور دکھلاوے سے بالکل دور، چشمِ اغیار (غیروں کی نظر سے) پوشیدہ، سراپا اخلاص اور بندہ و معبود کے درمیان ایک راز ہے؛ حتیٰ کہ اس کا علم بھی صحیح طور پر بجز روزہ دار کے اور اس ذاتِ اقدس کے، جس کے لیے یہ روزہ رکھا گیا ہے دوسرے شخص کو نہیں ہوتا۔ کیوں کہ روزہ کی کوئی ظاہری صورت، محسوس ہیئت نہیں ہوتی؛ جس کی وجہ دیکھنے والوں کو اس کا ادارک اور علم ہو سکے۔ بخلاف دوسری عبادت کے کہ ان کی ایک ظاہری صورت بھی ہوتی ہے، جس کے دیکھنے والے پر عبادت کا اظہار ہوتا ہے۔

جب روزہ ایک راز ہوتا ہے روزہ دار اور اس کے درمیان میں، تو پھر اس کے بدلہ اور ثواب دینے میں میں بھی یہی مناسب تھا کہ خصوصی اور راز دارانہ طریقہ اختیار کیا جاتا، جس کی اطلاع فرشتوں کو بھی نہ دی جاتی؛ چناں چہ اللہ تعالیٰ براہِ راست بغیر کسی واسطہ کے روزہ دار کو اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

ترجمہ: عاشق اور معشوق کے درمیان ایسے راز ہیں کہ لکھنے والے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے۔

اسی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے روزہ اور اس کے اجر وثواب کو "**الصوم لی و انا اجزی به**" میں اپنی طرف سے منسوب فرما کر اس کی شرافت وعظمت کو بڑھا دیا ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف احادیث میں بکثرت مخصوص فضائل ومناقب بیان فرمائے ہیں۔

## ماہِ رمضان کی عبادت کا اثر تمام سال رہتا ہے:

حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ تجربہ سے ثابت ہوا کہ عبادت کا اثر اس کے بعد گیارہ مہینے تک رہتا ہے، جو کوئی اس میں کوئی نیکی بہ تکلف کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس پر بہ آسانی قادر ہو جاتا ہے اور جو کوئی کسی گناہ سے اس میں اجتناب کر لے تو تمام سال بہ آسانی احتیاط ہو سکتی ہے اور اس مہینہ میں معصیت وگناہ سے اجتناب کرنا کچھ مشکل نہیں؛ کیوں کہ یہ بات ثابت ہے کہ شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں، پس جب شیاطین قید ہو گئے معاصی آپ ہی کم ہو جائیں گے؛ محرک کے قید ہو جانے کی وجہ سے۔ اور یہ لازم نہیں آتا کہ معاصی بالکل ختم ہو جائیں؛ کیوں کہ دوسرا محرک یعنی نفس تو باقی ہے، اس مہینہ میں وہ معصیت کرائے گا۔ ہاں! کم اثر ہوگا؛ کیوں کہ ایک محرک رہ گیا، اس میں ایک مہینہ کی مشقت گوارا کر لی جائے کوئی بات نہیں۔ غرض اس میں عضو کو گناہ سے بچایا جاوے۔

## انسان کے لیے روزہ مقرر ہونے کے وجوہ:

فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی عقل کو اس کے نفس پر غلبہ اور تسلطِ دائمی حاصل رہے، مگر بباعثِ بشریت (انسان ہونے کی وجہ سے) بسا اوقات اس کا نفس اس کی عقل پر غالب آتا ہے؛ لہٰذا تہذیب وتزکیۂ نفس کے لیے اسلام نے روزہ کو اصول میں سے ٹھہرایا ہے۔

۱...... روزہ سے انسان کی عقل کو نفس پر پورا تسلط وغلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

۲...... روزہ سے خشیت اور تقویٰ کی صفت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے؛ چناں چہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے "**لعکم تتقون**"، یعنی روزہ تم پر اس لیے مقرر ہوا کہ تم متقی بن جاؤ۔

۳...... روزہ رکھنے سے انسان کو اپنی عاجزی ومسکنت اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے۔

۴...... روزہ سے چشمِ بصیرت کھلتی ہے۔

۵...... دور اندیشی کا خیال ترقی کرتا ہے۔

۶...... کشفِ حقائق الاشیا ہوتا ہے۔ (یعنی چیزوں کی حقیقتیں کھلتی ہیں)

۷..... درندگی و بہیمیت سے دوری ہوتی ہے۔

۸..... ملائکہ الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

۹..... خدا تعالیٰ کی شکر گذاری کا موقع ملتا ہے۔

۱۰..... انسانی ہمدردی کا دل میں ابھار پیدا ہوتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جس نے بھوک اور پیاس محسوس ہی نہ کی ہو، وہ بھوکوں اور پیاسوں کے حال سے کیوں کر واقف ہوسکتا ہے اور وہ رزاقِ مطلق کی نعمتوں کا شکر یہ علی وجہ الحقیقت کب ادا کرسکتا ہے؛ اگر چہ زبان سے شکر یہ ادا کرے مگر جب تک اس کے معدہ میں بھوک اور پیاس کا اثر اور اس کی رگوں اور پٹھوں میں ضعف و ناتوانی کا احساس نہ ہو، وہ نعمت ہائے الٰہی کا کما حقہ شکر گزار نہیں بن سکتا؛ کیوں کہ جب کسی کی کوئی محبوب و مرغوب و مالوف چیز کچھ زمانہ گم ہوجاوے، تو اس کے فراق سے اس کے دل کو اس چیز کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

۱۱..... روزہ موجبِ صحتِ جسم و روح ہے؛ چناں چہ اکل و شرب (کم کھانے اور پینے کو) اطبا نے جسم کے لیے اور صوفیائے کرام نے صفائی کے لیے مفید لکھا ہے۔

۱۲..... روزہ انسان کے لیے ایک روحانی غذا ہے۔ جو آئندہ جہان میں انسان کو ایک غذا کا کام دے گا، جنہوں نے اس غذا کو ساتھ نہیں لیا وہ اس جہاں میں بھوکے پیاسے ہوں گے اور ان پر اس جہاں میں روحانی افلاس ظاہر ہوگا؛ کیوں کہ انہوں نے اپنی غذا کو ساتھ نہیں لیا اور یہ بات ماننے کے لائق ہے۔ جب کہ کھانے پینے کی تمام اشیا خداوند تعالیٰ کے خزانۂ رحمت سے انسان کو ملتی ہیں، تو جن اشیا کو وہ یہاں چھوڑتا ہے ان کا عوض وہاں ضرور دے گا، جو یہاں سے بہتر و افضل ہوگا۔

۱۳..... روزہ محبتِ الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہوکر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور بیوی کے تعلقات بھی اس کو بھول جاتے ہیں، ایسے ہی روزہ دار خدا کی محبت میں سرشار ہوکر اسی حالت کا اظہار کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ روزہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

## ماہ رمضان میں روزہ فرض ہونے کی وجہ:

ماہِ رمضان میں روزہ رکھنے کی وجہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرمائی ہے "شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن" یعنی ماہِ رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے، جس میں قرآنِ کریم نازل ہوا؛ لہٰذا یہ مہینہ برکاتِ الٰہیہ کے نزول کا موجب (سبب) ہے، اس لیے اس میں روزہ رکھنے سے اصل غرض جو لعلکم تتقون میں مذکور ہے، بوجہ اکمل (کامل طریقے سے) حاصل ہوجاتی ہے۔

### رات کو روزہ مقرر نہ ہونے کی وجہ:

چوں کہ رات کا وقت بالطبع ترکِ شہوات ولذات (طبعی طور پر سہولتوں اور لذتوں کو چھوڑنے) کا ہے؛ لہذا اگر رات کا وقت روزہ کے لیے قرار دیا جاتا، تو عبادت سے اور حکمِ شرح کو مقتضائے طبع سے امتیاز نہ ہوتا؛ اسی واسطے نمازِ تہجد اور وقتِ تلاوت اور مناجات شب کو قرار دیا گیا۔

### سال میں ایک دفعہ روزوں کے فرض ہونے کی وجہ:

چوں کہ روزہ کی روزانہ پابندی ہمیشہ کے لیے تمام لوگوں سے باوجود تدابیرِ ضرور یہ اور اشتغال باہل واموال (اپنے اہل وعیال اور مال میں مشغول ہونے کی وجہ سے) ممکن نہ تھی۔ لہذا یہ ضروری ہوا کہ کچھ زمانہ کے بعد ہر مرتبہ ایک مقدارِ معین کا اہتمام والتزام کیا جاوے، جس سے قوتِ ملکی کا ظہور ہو جائے اور اس سے پیشتر جو اس میں کمی ہوئی ہے اس سے اس کا تدارک ہو جائے۔ اور اس کا حال اس گھوڑے کا سا ہو جاوے، جس کی پچھاڑی اگاڑی میخ سے بندھی ہوتی ہے اور وہ دو چار بار اِدھر اُدھر لاتیں چلا کر اپنے اصلی تھان پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

### ہر روز کا وقت مقرر کرنے کی وجہ:

یہ بات ضروری ہے کہ روزہ کی ایک مقدار مقرر کی جاوے۔ تا کہ کوئی شخص اس میں افراط تفریط نہ کر سکے؛ لہٰذا امورِ مذکورہ کے لحاظ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ ایک مہینہ تک ہر دن برابر کھانے پینے اور جماع کرنے سے نفس کو باز رکھنے کے ساتھ روزہ کا انضباط کیا جاوے؛ کیوں کہ ایک دن سے کم مقدار کا مقرر کرنا تو ایسا ہے؛ جیسا کہ دوپہر کے کھانے کو کچھ دیر کر کے کھانا اور اگر رات کو ان امور کے ترک کرنے کا حکم دیا جاتا، تو لوگ اس کے عادی نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ سے ان کو کچھ پرواہ نہ ہوتی اور ہفتہ دو ہفتہ ایسی قلیل مقدار ہے کہ جس کا نفس پر چنداں بار نہیں ہوتا۔ اور دو مہینے کی ایسی مقدار ہے کہ اس میں آنکھیں گڑ جاتیں اور نفس تھک کر رہ جاتا ہے۔

### یکم شوال کو روزہ حرام ہونے کی وجہ:

سوال ہوتا ہے کہ یکم شوال کا رروزہ رکھنا حرام اور رمضان کا اخیری روزہ فرض ہونے کا کیا راز ہے باوجود کے دونوں یکساں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ دونوں یوم مرتبہ ودرجہ میں برابر نہیں ہیں۔ اگر چہ طلوع وغروبِ آفتاب میں یکساں ہیں، مگر حکم الٰہی میں یکساں نہیں ہیں؛ کیوں کہ ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس کے روزے خداتعالی نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں اور یکم شوال لوگوں کی عید وسرور کا دن ہے، جس میں خداتعالی نے لوگوں پر کھانا پینا بطورِ شکر گزاریٔ بندگانِ خدا مباح کیا ہے۔ اس لیے اس دن سب لوگ خداتعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں؛ لہٰذا خداتعالی کے مہمان کو واجب ہے کہ اس کی دعوت وضیافت کو قبول کرے یہ عمل خداتعالیٰ کو سخت ناپسند ہے کہ اس دن کوئی شخص روزہ رکھ کر خداتعالیٰ کی دعوت وضیافت کو رد کرے مہمانی کے لوازم وآداب میں سے یہ امر بھی ہے کہ روزہ رکھے تو صاحبِ خانہ یعنی میزبان کے اِذن سے رکھے۔ پس جب کہ یکم شوال کو اہلِ اسلام خداتعالی کے خاص مہمان ہوتے ہیں، تو پھر اس دن کسی کو روزہ رکھنا کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ یہ امر شریعتِ اسلامیہ کی خوبیوں میں سے ہے کہ خدا نے رمضان کا آخری روزہ رکھنا فرض کیا، کیوں کہ یہ روزہ خداتعالی کے اتمامِ نعمت وخاتمۂ عمل کے لیے ہے اور شوال کی یکم کو روزہ رکھنا حرام ہوا؛ کیوں کہ وہ ایسا دن ہے کہ اس میں تمام مسلمان اپنے پروردگار کے مہمان ہوتے ہیں۔ یوں تو تمام مخلوق خداتعالیٰ کی دائمی مہمان ہے، مگر یہ دن ان کی ایک مخصوص مہمانی وضیافت کا ہے، جس کو رد کرنا گناہِ عظیم ہے۔

## سال میں چھتیس روزے رکھنے سے صائم الدہر بننے کی حکمت:

نبی علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں: "من صام صیام رمضان، فاتبعه ستا من شوال کان کصیام الدھر" جو شخص رمضان کے روزے رکھ کر اس کے بعد شوال کے چھ روزے اور رکھ لیا کرے، تو ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ہے۔

اور ان روزوں کی مشروعیت میں یہ بھید ہے کہ یہ روزے ایسے ہیں، جیسے نمازِ پنجگانہ کے ساتھ سنتیں مقرر کی گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان لوگوں کے فائدے کی تکمیل ہوجاتی ہے۔ جو اصل نماز سے پورا فائدہ حاصل نہیں کرتے اور ان روزوں کی فضیلت میں یہ بات ہے کہ ان کی وجہ سے آدمی کو ہمیشہ روزہ رکھنے کے برابر ثواب ملتا ہے، اس لیے کہ یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس نیکی کے برابر ملتا ہے اور ان چھ روزوں سے یہ حساب پورا ہوسکتا ہے یعنی ۳۰+۶=۳۶۔ اور ۳۶ کو دس کے ساتھ ضرب دینے سے تین سوساٹھ حاصل ضرب ہوتے ہیں، جو ایک سال کے دن ہوتے ہیں۔

# روزہ افطار کرانے کا ثواب

**حدیث**: حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو سید الاولین جناب رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ایک خطبہ دیا (اور اس میں آگے چل کر یہ بھی) فرمایا:

**من فطر فیه صائما کان له مغفرة، لذنوبه وعتق رقبته من النار، وکان له مثل اجره من غیر ان ینتقص من اجره شئی. قلنا یا رسول الله لیس کلُّنا یجدما یفطربه الصائم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: یعطی الله هذا الثواب من فطر صائما علٰی مذاقة لبن اوشربة من ماء، ومن اشبع صائما سقاه الله من حوضی شربة لا یظمأ حتٰی یدخل الجنه الٰی اٰخره** (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

**ترجمہ**: ''جس شخص نے رمضان المبارک کے مہینہ میں کسی روزہ دار کو (اللہ تعالیٰ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لیے روزہ) افطار کرایا، تو اس کے لیے گناہوں کی مغفرت اور آتشِ دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا۔ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غربا اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی لسی پر یا صرف پانی ہی کے ایک گھونٹ پر کسی کا روزہ افطار کرادے (اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا، جس کے بعد اس کو پیاس ہی نہ لگے گی؛ تا آں کہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا''۔

**تشریح**: اس حدیث سے روزہ افطار کرانے کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوئی۔ روزہ افطار کرانے پر اللہ پاک تین انعام عطا فرماتے ہیں اور یہ انعام پیٹ بھر کھانا کھلانے پر بھی موقوف نہیں؛ بل کہ ایک چھوارہ یا کھجور یا دودھ کی تھوڑی سی لسی یا پانی کے ایک گھونٹ سے افطار کرانے پر بھی عطا فرما دیتے ہیں وہ تین انعام یہ ہیں:

(۱) گناہوں سے مغفرت (۲) آتشِ دوزخ سے نجات (۳) جس شخص نے کسی روزہ دار کا افطار کرایا تو کرانے والے کو اس روزہ دار کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اس طرح سے کہ افطار کرانے والے کے ثواب میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی، اللہ پاک افطار کرانے والے کو یہ ثواب الگ سے عطا فرماتے ہیں۔

غور فرمائیے! ایک چھوارہ یا ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ کی کیا قیمت ہے؟ کچھ بھی نہیں اگر کسی روزہ دار کو افطار کے وقت ان میں سے کوئی چیز یا ان کے علاوہ اور کوئی چیز پیش کردی جائے تو پیش کرنے والے کا کیا خرچ ہوگا؟ غریب سے غریب شخص کے پاس بھی کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے؛ بالفرض کچھ بھی نہ ہو تو پانی ہی سے افطار کراسکتا ہے.....خدائے پاک جل شانہ کی رحمت وکرم کا اندازہ کیجیے کہ انہوں نے اپنی رحمت کتنی عام فرمادی ہے؛ تاکہ مبارک لیل ونہار میں کوئی غریب سے غریب شخص بھی ان کی رحمت ومغفرت سے محروم نہ رہے۔ اور انعام وکرم بھی اتنا عظیم الشان فرمایا کہ جس کا شکر ادا ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کا ہر مسلمان خواہ مرد ہو یا عورت، شہری ہو یا دیہاتی، امیر ہو یا غریب، سب اس کے سخت محتاج ہیں اور فکرِ آخرت رکھنے والے بندے ہمیشہ انہی کے حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

## ماہِ رمضان میں تلاوت کا ثواب

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ مُبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيْضَة وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوعا مَن تَقَرَبَ فِيْهِ بِخَصلَة مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ اَدَى فَرِيْضَة فِيمَا سِوَاهُ وَمَنْ اَدَى فَرِيْضَة فِيْهِ كَانَ كَمَنْ اَدَى سَبعِيْنَ فَرِيْضَة فِيْمَا سِوَاه وهو شهر الصبر. (شعب الایمان)

**ترجمہ :** اے لوگو! تمہارے پاس ایک بڑا بابرکت مہینہ (رمضان المبارک) آ پہنچا، اس مہینہ میں ایک رات ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے روزہ کو فرض اور اس کی راتوں کو قیام (یعنی تراویح) کو سنت کیا ہے۔ جو شخص اس میں نیک کام کے ذریعہ (خدا تعالیٰ) تقرب حاصل کرے وہ کام ایسا ہے جیسے اس نے رمضان کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں ایک فرض ادا کیا ہے اور جو کوئی رمضان میں ایک فرض ادا کرے اس کا ثواب ایسا ہے جیسے اس نے رمضان کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں ستر فرض ادا کئے ہوں۔

### رمضان اور قرآن کا تعلق:

رمضان المبارک کے ساتھ جس طرح روزہ اور قرآن کریم دونوں کو خصوصی تعلق ہے اسی طرح آپس میں بھی ان دونوں عبادتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور مناسبت ہے۔ یہ دونوں عبادتیں یعنی روزہ اور قرآن کریم کئی خاصیتوں میں مشترک ہیں۔

# رمضان اور قرآن کریم کی مشترک خاصیتیں

## پہلی مشترکہ خاصیت۔شفاعت

حدیث میں ہے کہ روزہ اور قرآن کریم دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔روزہ کہے گا اے رب! میں نے اس کو دن میں کھانے پینے سے باز رکھا تھا۔میری شفاعت اس کے حق میں قبول کیجئے اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو جگایا تھا اس لیے میری شفاعت قبول فرمایئے۔پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

## دوسری مشترکہ خاصیت۔قرب خاص:

ایک اور خاصیت ان دونوں میں پائی جاتی ہے۔یعنی تلاوت قرآن اور روزہ میں،اور وہ خاصیت قرب خاص حق تعالیٰ کا ہے۔تلاوت میں بھی خاص قرب ہوتا ہے ایسے ہی روزہ دار کو بھی خاص قرب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا؛ یہ دوسری بات ہے کہ تلاوت میں وجہ قرب اور ہو اور روزہ میں وجہ قرب اور۔مگر نفس قرب خاص میں دونوں شریک ہیں۔تلاوت سے تو اس لیے قرب خاص ہوتا ہے کہ کلام کو خاص مناسبت ہوتی ہے متکلم سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا اس کو خاص تعلق ہوگا صاحب کلام سے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے دیوان وغیرہ تصنیف کیا ہو اور ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اس کے دیوان کو پڑھ رہا ہے مصنف کو اس کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہو جائے گا خواہ وہ پڑھنے والا کلام سمجھتا بھی نہ ہو جب بھی اس کے ساتھ خاص محبت ہوگی اور اس کی طرف خاص عنایت مبذول ہوگی۔

## قرآن کریم کے ثواب کے بارے میں ایک جامع حدیث:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من استمع حرفا من کتاب اللہ طاھرا کتبت له عشر حسنة ومحبت عنه عشر سبنات ورفعت له عشر درجات ومن قرا حرفا من کتاب الله فی صلاة کتبت له خمسون حسنة ورفعت له خمسون درجة ومن قرا حرفا من کتاب الله قائما کتبت له ما ئة حسنة ومحبت عنه مائة سیئت ورفعت له مائة درجة ومن قرا فختمه کتب الله عنده دعوة مستجابة اومؤ خرة.**

**ترجمہ:** جس نے ایک حرف خدا کی کتاب سے قرآن میں بن دیکھے صرف یاد سے سنا۔اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور دس گناہ مٹائے جاتے ہیں اور دس درجات بلند کئے جاتے ہیں۔اور جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف نماز میں بیٹھ کر تلاوت کیا اس کے لیے پچاس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور پچاس گناہ مٹائے جاتے ہیں اور پچاس درجات بلند کئے جاتے ہیں۔اور جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف نماز میں کھڑے ہوکر تلاوت کیا اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اس کے سو گناہ مٹادیئے جاتے ہیں اور سو درجے بلند کردیئے جاتے ہیں اور جس نے قرآن پاک پڑھا پھر اس کو ختم کیا (یعنی مکمل قرآن پڑھا) اللہ تعالی ختم قرآن کے وقت ایک دعا فی الحال قبول ہونے والی یا بعد میں قبول ہونے والی لکھ دیتے ہیں۔

## ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ان لقاری القران دعوة مستجابة فان شاء صا حبها عجلها فی الدنیا وان شاء اخرها الی الاخرة.**

**ترجمہ**: بے شک قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کے لیے ایک ایسی دعا کی جاتی ہے پس اگر دعا مانگنے والا چاہے تو جلدی کر کے دنیا میں مانگ لے اور اگر چاہے تو اس کو آخرت تک مؤخر رکھے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ **مع کل ختمة دعوة مستجابة** ہر ختم قرآن کے وقت دعا قبول ہوتی ہے۔

## ختم قرآن کا سنت طریقہ

حضرت ابن عباسؓ ابی کعبؓ سے نقل کرتے ہیں کہ: **ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا قرء قل اعوذ برب الناس افتتح من الحمد ثم قرامن البقرة الی واولئک هم المفلحون ثم دعا بدعاء الختمة ثم قام**

**ترجمہ:** بے شک نبی ﷺ جب (ختم قرآن کے وقت آخری سورت) **قل اعوذ برالناس** تلاوت کرتے تو الحمد سے افتتاح کرتے۔پھر سورہ بقرہ سے **او لئک هم المفلحون** تک تلاوت کرتے۔ پھر ختم القرآن والی دعا پڑھتے پھر کھڑے ہوتے۔

**فائدہ** :اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک ختم کرنے کے بعد دوبارہ شروع سے **اولٓئک هم المفلحون** تک تلاوت کرنا سنت ہے لہٰذا اسی طرح ختم قرآن کرنا چاہیے۔

☆......☆......☆

# رمضان اور تراویح

## حرمین شریفین میں بیس رکعات تراویح:

خلفائے راشدین سے آج تک بیس رکعت تراویح سے کم نہیں پڑھی گئیں۔

حضرت عمر بن خطابؓ: (۱) یحی بن سعیدؒ سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو (مسجد نبوی میں) بیس رکعات تراویح پڑھائے۔

(رواہ ابوبکر بن شیبہ فی مصنفہ واسنادہ مرسل قوی)

(۲) حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں صحابہ وتابعین رمضان میں بیس رکعت (بلاوتر) تراویح پڑھا کرتے تھے۔ (رواہ بیہقی واسنادہ صحیح)

(۳) یزید بن رومان کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ماہِ رمضان میں سب لوگ (معہ وتر) تئیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔ (رواہ ابن مالک واسنادہ مرسل)

حضرت عثمانؓ: اس دور میں عہدِ عمر کی طرح مسجد نبوی میں بیس رکعات باجماعت تراویح ہوتی رہی ہیں۔ چناں چہ سنن بیہقی میں حضرت حسن سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ کے دور میں حضرت علی نے (ایک رمضان میں) ہمیں بیس راتیں تراویح پڑھائیں پھر آپ کسی ذاتی وجہ سے امامت نہ کرا سکے تو باقی راتوں میں ابوحلیمہ معاذ القاری نے امامت کرائی۔

حضرت علیؓ: ابوالحسنات تابعیؒ کہتے ہیں کہ حضرت علی نے بیس رکعات تراویح پڑھانے پر ایک آدمی کو مقرر کیا۔

جمہور صحابہ وتابعین کا اتفاق: امام ابوعیسی الترمذی فرماتے ہیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمہور صحابہ حضرت علی وحضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بیس رکعت تراویح پر عمل کرتے تھے۔ یہی قول سفیان ثوریؒ، عبداللہ بن مبارک اور امام شافعی کا بھی ہے نیز امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ معظّمہ میں سب کو بیس رکعت تراویح پڑھتے پایا۔ (ترمذی ج ص ۹۹)

ائمہ اربعہ: امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بیس رکعت تراویح مختار۔ اسی کے سفیان ثوری، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ بھی قائل ہیں اور امام مالک چھتیس رکعت کے قائل ہیں۔ (المغنی لابن قدامہ ص ۱۶۷)

الحمدللہ! تا حال حرمین شریفین کا اسی سنت پرعمل ہورہا ہے۔خلفائے راشدین سے آج تک کوئی دور ایسانہیں گزرا جس میں حرمین میں بیس سے کم تراویح پڑھی گئی ہوں۔

## تراویح رمضان ہی میں کیوں مقرر ہوئیں:

اس مہینہ میں قرآن کریم کا ختم کرنا اس وجہ سے مسنون ہے کہ قرآن کریم کا نزول اسی مہینہ میں ہوا ہے۔پس جوشخص اس مہینہ میں قرآن شریف ختم کرتا ہے وہ تمام برکات کا وارث ہوتا ہے،کیوں کہ رمضان کا مہینہ تمام اسلامی خیر وبرکات کا جامع ہے۔ہرقسم کی دینی برکت اور خیر جوتمام سال میں کسی کونہیں ملتی ہے وہ اس عظیم الشان مہینہ کی برکت سے آتی ہے۔اس مہینہ کی جمعیت (دل جمعی ویکسوئی) پورے سال کی جمعیت کا ذریعہ ہوتی ہے اوراس مہینہ کی پراگندگی (وبدحالی) پورے سال کی پراگندگی کا سبب ہوتی ہے کیوں کہ تمام قسم کے خیرات اور بھلائیوں کا سرچشمہ یعنی قرآن مجید کا نزول اسی مہینہ میں ہوا ہے۔**شھر رمضان الذی انزل فیه القرآن** یعنی رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا۔(المصالح العقلیہ ص۱۴۶)

## تراویح کے رات میں مقرر ہونے کی وجہ:

۱- چوں کہ رمضان کا مہینہ برکات وانوار کے نزول کا مہینہ ہے لہٰذا اس مہینہ کی راتوں میں بھی ایک خاص عبادت مقرر ہوئی ہے (جس کو تراویح کہتے ہیں) کیوں کہ اکثر برکات وانوار الٰہی کا نزول رات ہی کو ہوتا ہے۔

۲- رمضان کی راتوں میں تراویح اس لیے مقرر ہوئی تا کہ طبعی خواہشوں کی مخالفت پوری طور پر ثابت ہو،کیوں کہ دن بھر کے روزہ اور محنت ومشقت کے بعد طبیعت آرام چاہتی ہے،لہٰذا اس میں ایسی عبادت مقرر ہوئی جس سے عادت وعبادت میں امتیاز ہو(اورمحنت ومجاہدہ اورنفس کے خلاف کام کرنے کی عادت ہو)۔ (المصالح العقلیہ)

## تراویح میں مجاہدہ:

مجاہدہ کے چار ارکان ہیں: (۱) تقلیل طعام (یعنی کم کھانا) (۲) تقلیل منام (المنام بصورۃ القیام) (یعنی کم سونا) (۳) تقلیل کلام (یعنی کم بولنا) (۴) تقلیل اختلاط مع الانام (یعنی کم لوگوں سے ملنا) شریعت نے

تقلیل طعام (یعنی کم کھانے کے مجاہدہ) کو روزے کی صورت میں مقرر فرمایا ہے۔اس کے علاوہ اہل مجاہدہ (اور جوگیوں وغیرہ) نے تقلیل طعام کی صورتیں جو اختیار کر رکھی ہیں شریعت میں اس کی اصل نہیں۔

مجاہدہ کا دوسرا رکن تقلیل منام (یعنی کم سونا) ہے۔رمضان اس کا بھی جامع ہے اس میں ایک ایسی عبادت مشروع ہے جو تقلیل منام (یعنی کم سونے) کو مستلزم ہے اور وہ تراویح ہے جس کا نام ہے قیام رمضان۔

حدیث شریف میں ہے:"**ان اللّٰه فرض لکم صیامه وسننت لکم قیامه**"

اللہ نے تم پر اس کے ماہ کے روزے کو فرض کیا ہے اور اس کی قیام کو میں نے مسنون کیا ہے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حدیث میں "قیامہ" سے مراد تراویح ہے۔(تقلیل المنام)

## تراویح ہمیشہ کیوں نہیں:

اب ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ جب تراویح مجاہدہ ہے تو جیسے رمضان میں مشروع فرمایا اور دنوں میں بھی مقرر فرما دیتے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر رمضان کے علاوہ اور دنوں میں نماز نہیں ہوتی تو بے شک اس کو فرض ہونا چاہیئے تھا،لیکن اور دنوں میں بھی فرض نمازیں مقرر ہیں جو مجاہدہ کے لیے کافی ہیں۔اسی لیے رمضان ہی میں اس کو رکھا اور سنت مؤکدہ بتایا گیا۔

الغرض ترک لذّات کے لیے روزہ اور تکبر کے علاج کے لیے شریعت نے نماز مجاہدہ مقرر فرمائی۔
(التہذیب)

## دوسروں کے مجاہدوں اور شریعت کی تجویز کردہ مجاہدوں کا فرق:

تقلیل منام یعنی کم سونے کے لیے دوسرے لوگوں نے مجاہدے کے جو طریقے اختیار کیے تھے،ان میں وہ چھت میں رسیاں باندھتے کہ جب نیند آجاتی اس میں لٹک جاتے جس سے نیند اڑ جاتی۔اپنی آنکھیں پھوڑتے تھے۔اہل ریاضت مجاہدے کی جو صورتیں اختیار کرتے ہیں ان کو دیکھ کر پھر شرعی مجاہدہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شاہانہ علاج کیا ہے کہ نہ آنکھیں پھوڑنے کی ضرورت ہے نہ رسیاں باندھنے کی ضرورت،نہ کالی مرچ چبانے کی ضرورت،بل کہ بیس رکعت تراویح عشا کے بعد پڑھ کر سو رہو تقلیل منام (یعنی کم سونے کا مجاہدہ) ہو گیا۔پھر مزید آسانی یہ کہ تراویح جماعت سے ہوتی ہے الگ الگ جاگنا مشکل تھا جماعت کے ساتھ جاگنا اور بھی سہل ہو گیا۔پھر بیچ میں نیند آنے لگے تو ہر چار رکعت پر تھوڑی دیر ٹھہرنا مستحب کیا گیا ہے

جس میں اگر کسی کو نیند آنے لگی ہو تو وہ ٹہل سکتا ہے۔ منہ پر پانی ڈال سکتا ہے، باتیں کر کے نیند ختم کر سکتا ہے اس طرح سے بیس رکعت کی مقدار جاگنا کچھ بھی دشوار نہیں۔ شریعت نے امراض باطنہ کے سارے علاج شاہانہ اور بہت آسان کیے ہیں اور دعوے سے فرماتے ہیں کہ" الدین یسر "یعنی دین آسان ہے۔ (تقلیل المنام)

**ضروری تنبیہ:** اور اگر تم کو تراویح میں (یہ مجاہدے اور اس کے مصالح) سمجھ میں نہ آسکیں تو تم کو تحقیق کی کیا ضرورت ہے؟ بس خدا اور رسول کا حکم سمجھ کر عمل شروع کر دو۔

بعض لوگوں کو اسرار جانے بغیر عمل کرنا زیادہ مفیدہ ہوتا ہے اور اسرار جاننے سے فائدہ کم ہوتا ہے۔

## ہمت سے کام لیجیے:

**حضرت امام ابوحنیفہ کا حال:** کچھ آپ بھی ہمت کیجیے، ہم سے پہلے ہمت والوں نے تو یہاں تک کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ ہر رمضان میں اکسٹھ قرآن شریف ختم کرتے تھے۔ ایک ختم تو روزانہ دن کو کرتے اور ایک رات کو اور ایک وہ جو ہمیشہ تراویح میں پڑھنے کا معمول تھا۔ غرض ایک مہینہ میں اکسٹھ قرآن شریف پڑھتے تھے۔

تو دیکھو ایک اللہ کے بندے وہ بھی تو تھے (اور ایک ہم ہیں کہ عبادت کے لیے کچھ محنت مشقت برداشت کرنا جانتے ہی نہیں)۔ (رمضان فی رمضان)

## تراویح یا شب قدر میں نیند نہ آنے کا علاج:

بعض لوگوں کو تراویح میں نیند بہت آتی ہے سو اس کا علاج کرنا چاہئے اور اس کا آسان علاج ایک تو یہ ہے کہ کالی مرچ کھالو اس سے نیند جاتی رہے گی، کالی مرچ نفع مند بھی ہے، مقوی دماغ بھی ہے البتہ لال مرچ نقصان دہ ہے۔

باقی نیند کا اصل علاج یہ ہے کہ کم پانی پیو۔ مشائخ میں ستر اہل مجاہدہ کا قول یہ ہے کہ نیند کا مادہ پانی سے ہے اس کو امام غزالیؒ نے بھی لکھا ہے پھر بھی اگر زیادہ نیند آئے تو کالی مرچ (نماز سے پہلے یا دوران نماز سلام پھیرنے کے بعد) چبالو۔ آخر خدا تعالی سے کچھ لینا بھی ہے یا نہیں۔ حق تعالیٰ سبحانہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ایطمع کل امری منهم ان یدخل جنة نعیم﴾

یعنی کیا ہر شخص اس کی طمع رکھتا ہے کہ نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے؟ ایسا ہرگز نہیں، یعنی کچھ کئے بغیر کچھ نہ ملے گا، پہلے اعمال کے ذریعہ جنت کے قابل تو بنو، اعمال و مجاہدہ کے بغیر جنت لینے کا کیسا منہ ہے؟ پس رمضان میں ہمت کر کے ایک قرآن تو سن ہی لو۔ (مثلث رمضان)

## تراویح میں حضورِ قلب اور توجہ سے قرآن پڑھنے کا طریقہ:

رمضان میں خصوصاً تراویح میں قرآن کی طرف توجہ کرنے کی حقیقت بھی بتلاتا ہوں۔ دیکھو اگر کسی حافظ کو کوئی رکوع کچا یاد ہو تو اسے کیسے پڑھے گا خوب دھیان سے پڑھے گا۔ یہی حاصل ہے قرآن کی طرف توجہ کرنے کا؛ پس جس طرح ایک رکوع پڑھتے ہو، بیسوں رکعت اسی طرح پڑھ لیا کرو۔ نماز میں حضورِ قلب کے یہی معنی ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے نماز میں اور قرآن میں حضورِ قلب کی یہی حقیقت لکھی ہے۔ اب بتلاؤ کہ حضورِ قلب سے نماز پڑھنا کیا مشکل ہے، بس اتنا ہی تو کرنا پڑے گا کہ جو خیال نیت کے وقت دل میں تھا اسے پوری نماز میں رکھو۔

اور حضورِ قلب سے قرآن پڑھنا کیا مشکل ہے؟ بس اتنا ہی تو ہے کہ جو کیفیت تمہاری کچے رکوع کے پڑھنے کے وقت ہوتی ہے، اسے بیسوں رکوعوں میں رکھو۔ اب اگر کسی سے حضورِ قلب نہ ہو تو یہ اس کی کوتاہی ہے۔

(روح القیام)

## تراویح کا مسنون طریقہ اور حضرت تھانویؒ کا معمول:

بندہ محمد یوسف بجنوری عرض کرتا ہے کہ مجھ کو ایک عرصہ سے تمنا تھی کہ تراویح کا جو طریقہ سلف میں تھا، اس کا ذکر کتبِ فقہ میں تو ہے اس سال کو عمل میں کہیں دیکھوں۔ مگر کہیں اتفاق نہیں ہوا تھا، جہاں کہیں بھی دیکھا حد سے متجاوز پایا۔ اس سال بندہ کا قیام تھانہ بھون میں رہا اور رمضان شریف میں شروع سے اخیر تک یہ شریک رہا۔ حضرت والا نے قرآن شریف سنایا۔

چوں کہ حضرت والا ہر امر میں اتباعِ سنت کو بدرجہ اعلیٰ محفوظ رکھتے ہیں، اس کو بھی مسنون طریقہ کے مطابق ادا فرمایا۔ ایک بات بھی ایسی نہ ہوئی جو شرع کے خلاف ہو۔ اس لیے بندہ کو مناسب معلوم ہوا کہ جس طریقہ سے حضرت نے تراویح ادا فرمائیں اس کو قلم بند کر دوں۔ کیا اچھا ہو کہ جن حضرات کی نظر سے یہ مضمون گذرے وہ بھی اسی طرح عمل فرمائیں، واللہ اتباعِ سنت ہی میں دین کی راحت ہے اور دنیا کی بھی بڑی راحت ہے، تجربہ سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جائے گی۔ اب میں اس کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

۱۔ رمضان شریف میں حضرت کے یہاں عشا کی اذان کا وقت آٹھ بجے یعنی غروب سے ایک گھنٹہ چالیس منٹ بعد تھا اور پونے نو بجے جماعت کھڑی ہوتی تھی۔

۲۔ حضرت والا فرض خود ہی پڑھاتے تھے۔ رمضان شریف میں سورۃ فاتحہ کے بعد چھوٹی سورتیں پڑھتے تھے، جیسے: والتین اور الم تر کیف وغیرہ۔ اور اکثر تو یہی عادت تھی اور کبھی والشمس وغیرہ پڑھتے۔ غرض فرضوں میں قرأت طویل نہ ہوتی تھی اس میں مقتدیوں کی رعایت مدنظر تھی۔

۳۔ تراویح میں قرأت نہ تو اس قدر جلدی ہوتی تھی جیسے اس زمانہ میں حفاظ کا طرز ہے کہ الفاظ بھی ٹھیک ٹھیک ادا نہیں ہوتے اور نہ اس قدر آہستہ ہوتی تھی جیسے فرضوں میں قرأت ہوتی ہے۔ بل کہ فرضوں کی بہ نسبت ذرا سے کچھ رواں قرأت فرماتے اور ہر حرف اچھی طرح سمجھ میں آتا تھا، اظہار واخفا کی بھی رعایت تھی۔

۴۔ تراویح میں شروع شروع میں سوا پارہ پڑھا پھر کم کر دیا تھا۔ ۲۷ رویں شب کو ختم ہوا۔

۵۔ کل وقت فرض اور سنت اور تراویح اور وتر میں ڈیڑھ گھنٹہ یا کبھی اس سے بھی کم خرچ ہوتا تھا۔

۶۔ ہر چار رکعت کے بعد بیٹھتے تھے جس کو ترویحہ کہتے ہیں۔ اس میں ۲۵ بار درود شریف پڑھتے، جس میں خفیف سا جہر ہوتا تھا (یعنی ہلکی آواز سے پڑھتے تھے)۔

۷۔ جب بیس رکعت تراویح ہو جاتیں تو ترویحہ کر کے دعا مانگتے اس کے بعد وتر پڑھتے۔

۸ جس موقع پر کلام اللہ کی آیت میں سجدہ کی آیت ہے وہاں کبھی سجدہ فرماتے ہیں کبھی (جب مجمع زیادہ ہوتا ہے تو) رکوع ہی سے سجدہ ادا فرماتے (کیوں کہ مسئلہ ہے کہ سجدہ کی آیت پڑھ کر جلدی اگر رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں سجدہ کی نیت کر لے تو سجدہ تلاوت ادا ہو جاتا ہے)

۹۔ عام معمول یہ ہے کہ سورہ اخلاص سے پہلے ہی کسی سورۃ میں بسم اللہ جہر سے پڑھتے ہیں۔ حضرت والا نے سورۃ اقراء سے پہلے بسم اللہ میں جہر فرمایا (کیوں کہ) مسئلہ یہ ہے کہ پورے کلام اللہ میں ایک دفعہ جہر سے بسم اللہ پڑھنا چاہئے خواہ کسی سورۃ میں ہو۔

۱۰۔ عام دستور یہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو تین بار پڑھتے ہیں، حضرت والا نے اس کو ایک بار ہی پڑھا۔

۱۱۔ جس روز ختم ہوا، دوسرے دنوں کی بہ نسبت نہ روشنی میں اضافہ تھا، نہ مٹھائی منگائی گئی: جیسے اور روز پڑھ کر چلے جاتے تھے اس دن بھی چلے گئے۔

۱۲۔ ایک دستور یہ کہ جس روز ختم ہوتا ہے تو حافظ کے سامنے پنساری کی دکان لا کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی اجوائن وغیرہ سامان اور پڑیاں، پانی دم کرنے کے لیے رکھ دیتے ہیں اور حافظ صاحب اس میں چھو کر دیتے ہیں، یہاں یہ سب کچھ نہیں تھا۔ بس مسنون طریقہ کے مطابق عمل تھا، شریعت مطہرہ نے سب کاموں میں آسانی رکھی ہے، ہم لوگ خود ہی دقتیں بڑھا لیتے ہیں۔ اگر اس طریقہ سے تراویح کریں تو کتنی آسانی ہو۔

۱۳۔ ختم ہونے کے بعد میں تین روز اور تراویح پڑھیں۔ پہلے دن سورۂ والضحی سے آخر تک تراویح میں قرآن پڑھا، دوسرے دن الم ترکیف سے آخیر تک پھر اسی کو لوٹا کر اخیر تک پڑھا۔

تیسرے دن عم یتساء لو ن کا تقریباً نصف پارہ پڑھا۔ (حسن العزیز)

## رمضان اور نوافل:

دن رات میں پانچ نمازیں تو فرض کی گئی ہیں اور وہ گویا اسلام کا رکن رکین اور لازم ایمان ہیں۔ ان کے علاوہ ان ہی کے آگے پیچھے اور دوسرے اوقات میں بھی کچھ رکعتیں پڑھنے کی ترغیب وتعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، پھر ان میں سے جن کے لیے آپ نے تاکیدی الفاظ فرمائے یا دوسروں کی ترغیب دینے کے ساتھ جن کا آپ نے عملاً بہت زیادہ اہتمام فرمایا ان کو عرف عام میں ''سنت'' کہا جاتا ہے۔ اور ان کے ماسوا کو ''نوافل''، بعض نوافل ایسے ہیں کہ جن کی مستقل حیثیت ہے۔ ان نوافل کا ادا کرنا تقرب الی اللہ کا باعث ہے۔

ایک حدیث قدسی میں ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قرب میں ترقی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔ اور جب میں محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے دیکھے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلے، جو وہ مجھ سے مانگتا ہے وہ میں اسے دے دیتا ہوں۔

آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ہر کام اللہ کی رضا اور محبت کے ذیل میں ہوتا ہے، اس کا کوئی عمل بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔

دوسرے ان نوافل کے ذریعہ سے فرائض میں رہ جانے والی کمی پوری ہوتی ہے۔

ذیل میں جن نفل نمازوں کے فضائل اور ان کے پڑھنے کا طریقہ ذکر کیا جارہا ہے اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کم از کم رمضان المبارک میں ان نوافل کی ضرور ادائیگی کرنی چاہیے۔

**تحیۃ الوضو**: یہ ہے کہ جب کبھی وضو کریں تو دو رکعت نفل پڑھ لیا کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرماتے ہیں۔ ''جو مسلمان بھی اچھی طرح سے وضو کرے اور وضو کے بعد حضور قلب کے ساتھ دو رکعت نفل پڑھے تو اس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے۔''

**مسئلہ** : تحیۃ الوضوا عضائے وضو کے خشک ہونے سے پہلے پہلے پڑھنی چاہئے یہی اس کا وقت ہے۔

**تحیۃ المسجد** : تحیۃ المسجد یہ ہے کہ جب کوئی مسجد میں جائے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھے۔

حضرت ابوقتادہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم سے کوئی مسجد میں داخل ہوتو اس کو چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔

**مسئلہ** : اگر مسجد میں کئی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوتو صرف ایک مرتبہ تحیۃ المسجد کافی ہے۔

**مسئلہ** : اگر وضو مسجد میں جا کر کریں اور تحیۃ الوضو پڑھیں تو پھر تحیۃ المسجد کے نفل پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

**مسئلہ** : اگر کوئی شخص مسجد جاتے ہی سنتیں پرھنے لگا یا جماعت میں شریک ہوگیا تو اسکی تحیۃ المسجد اسی کے ضمن میں ادا ہوگئی۔علیحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

**اشراق**: اشراق کی نماز یہ ہوتی ہے کہ آدمی فجر کی نماز پڑھ کر اسی جگہ بیٹھا رہے اور ذکر وغیرہ میں مصروف رہے، دنیا کا کوئی کام نہ کرے پھر سورج نکلنے کے بیس یا پچیس منٹ بعد دو رکعتیں پڑھے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جس شخص نے فجر کی نماز جماعت میں شریک ہوکر پڑھی، پھر سورج نکلنے تک وہیں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہا، پھر دو رکعتیں پڑھیں تو اس کے لیے ایک حج وعمرہ کی مانند ثواب ہوگا۔"

اس میں اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ جس جگہ فرض پڑھے، وہیں بیٹھا رہے۔اوسط درجہ یہ ہے کہ اس مسجد میں کسی بھی جگہ بیٹھ جائے اور ادنی درجہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر چلا جائے۔لیکن ذکر الٰہی برابر ادا کرتا رہے تقریباً آفتاب نکلنے کے پندرہ بیس منٹ بعد دو رکعت نفل پڑھے تو مذکورہ ثواب حاصل ہوگا۔

**چاشت** : چاشت کی نماز یہ ہوتی ہے کہ جب سورج اچھی طرح نکل جائے اور اس پر نگاہ نہ جم سکے تو اس وقت نوافل پڑھے جائیں، جن کی کم از کم مقدار دو اور زیادہ سے زیادہ بارہ ہے۔چاشت کے نوافل زوال کا وقت ہونے تک پڑھے جاسکتے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" تم میں سے ہر شخص کے

جوڑ جوڑ پر صبح کو صدقہ ہے۔ پس ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا بھی صدقہ ہے اور لا الہ الا اللہ کہنا بھی صدقہ ہے اور اللہ اکبر کہنا بھی صدقہ ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی صدقہ ہے اور اس کی شکر کی ادائیگی کے لیے دو رکعتیں کافی ہیں جو آدمی چاشت کے وقت پڑھے۔''

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔''جس نے چاشت کی دو رکعتوں کا اہتمام کیا اس کے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگر چہ وہ سمندر کے جھاگوں کے برابر ہوں۔

**اوابین** : مغرب کی فرض اور سنتوں کے بعد جو نوافل پڑھے جاتے ہیں انہیں اوابین کہتے ہیں۔ ان کی کم از کم تعداد ۶ اور زیادہ سے زیادہ بیس ہے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کے صاحب زادے محمد عمارؒ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد ماجد عمار بن یاسر کو دیکھا کہ وہ مغرب کے بعد ۲ رکعت پڑھتے تھے اور بیان فرماتے تھے کہ میں نے اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو بندہ مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگر چہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

**مسئلہ** : مغرب کے فرضوں کے بعد ۲ رکعت نفل پڑھ کر صرف ۶ رکعت سنت ۲ رکعت نفل اور پڑھ لے تو اوابین کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔

**تہجد** : نصف شب کے بعد سو کے اٹھ کر جو نماز پڑھی جاتی ہے اسے تہجد کہتے ہیں۔ اس کی کم از کم ۶ رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۲ رکعتیں ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم عموماً آٹھ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''اللہ تعالیٰ بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری درمیانی حصہ میں ہوتے ہیں پس اگر تم سے ہو سکے کہ تم ان بندوں میں ہو جاؤ جو اس (مبارک) وقت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو تم ان میں سے ہو جاؤ۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''فرض نماز کے بعد سب سے افضل درمیان رات کی نماز (یعنی تہجد) ہے۔

حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''تم ضرور پڑھا کرو تہجد۔ کیوں کہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ اور شعار رہا ہے اور قرب الٰہی کا خاص وسیلہ ہے۔ اور وہ گناہوں کے برے اثرات کو مٹانے والی، معاصی سے روکنے والی چیز ہے۔''

**مسئلہ** : تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے سونا شرط نہیں ہے اگر کوئی شخص ساری رات جاگتا رہے تو وہ بھی تہجد پڑھ سکتا ہے۔

**نماز توبہ** : اگر کسی سے کوئی گناہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز نفل پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے کئے کی معافی مانگے اور آئندہ کے لیے اس کام سے سچے دل سے توبہ کرے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابو بکرؓ نے بیان فرمایا (جو بلا شبہ صادق وصدیق ہیں ) کہ )''میں نے حضورؐ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے جس شخص سے کوئی گناہ ہو جائے۔ پھر وہ اٹھ کر وضو کرے، پھر نماز پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور معافی طلب کے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما ہی دیتے ہیں'' الحدیث (فضیلت کی راتیں)

**صلوۃ التّسبیح** : حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے فرمایا اے عباس! اے میرے محترم چچا! کیا میں آپ کی خدمت میں ایک گراں قدر عطیہ اور ایک قیمتی تحفہ پیش کروں؟ کیا میں آپ کو خاص بات بتاؤں؟ کیا آپ کے دس کام اور آپ کی دس خدمتیں کروں (یعنی آپ کو ایک ایسا عمل بتاؤں جس سے آپ کو دس عظیم الشان منفعتیں حاصل ہوں ، وہ ایسا عمل ہے کہ ) جب آپ اس کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے سارے گناہ معاف فرما دے گا، اگلے اور پچھلے بھی ، پرانے بھی اور نئے بھی ، بھول چوک سے ہونے والے بھی اور دانستہ ہونے والے بھی ، صغیرہ بھی اور کبیرہ بھی ، ڈھکے چھپے بھی اور علانیہ ہونے والے بھی۔ (وہ عمل صلوۃ التسبیح ہے )(میرے چچا) اگر آپ یہ بھی نہ کر سکیں تو سال میں ایک دفعہ پڑھ لیا کریں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم زندگی میں ایک بار ہی پڑھ لیں۔

(ابوداؤد،ابن ماجہ)

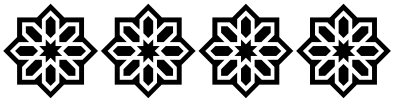

# عشرۂ اعتکاف اور شب قدر

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانویؒ

اللہ تعالیٰ نے شریعت مقدسہ میں ایک خاص خلوت مقدر فرمائی ہے اور ایک بڑے زمانہ میں چھوٹا سا زمانہ اس خلوت کے لیے مشروع فرمایا ہے یعنی رمضان المبارک کا آخری عشرہ۔ اور اس خلوت کا نام اعتکاف رکھا ہے، خلوت نہیں اس لیے کہ یہ فلاسفہ اور حکما کا دیا ہوا نام ہے۔

اعتکاف کی روح کیا ہے؟ اعتکاف کی روح مجاہدہ کا ایک جزو ہے۔ مجاہدہ کی حقیقت تھی: قلة الطعام (کم کھانا) قلة المنام (کم سونا) قلة الکلام (کم بولنا) قلة الاختلاط مع الانام (لوگوں سے کم میل جول رکھنا)۔ مجاہدہ کا ایک جز و یعنی لوگوں سے کم ملنا تھا۔ نہ ملنا نہیں، بل کہ کم ملنا۔ یہ غلطی کی جوگیوں اور حکمائے اشراقین نے کی کہ وہ ترک اختلاط (ملنے کے چھوڑنے) ہی کو مجاہدہ سمجھے اور اس کی مضرت انہیں یہ ہوئی کہ تعلیم و تعلم سے محروم ہو گئے۔

اس امت کی خلوت در انجمن (محفل میں تنہائی) ہے۔

گربا ہمہ چو بامنی بے ہمہ
گر بے ہمہ چو بے منی باہمہ

(اگر تم مخلوق میں مشغول ہو؛ مگر دل ہماری طرف متوجہ ہے تو تم خلوت نشین ہی ہو۔ اور اگر خلوت نشین ہو کر تمہارا دل مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو خلوت نشین نہیں ہو)

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل
بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی

(جب تمہارا دل ہر گھڑی ایک جگہ بناتا ہے تو تم تنہائی میں صفائی نہیں حاصل کر سکتے)

درت مال و جاہ است وزرع وتجارت
چو دل باخدا ایست خلوت نشینی

(اور اگر تمہارے پاس مال و دولت ہے اور تجارت و زراعت کرتے ہو، جب دل خدا سے لگاؤ رکھتا ہے تو خلوت نشین ہی ہو)

یعنی اگر تم سب کے پاس بیٹھتے ہو مگر قلب متوجہ ہے تو میرے ساتھ ہو۔ یہ ہے اس امت کی خلوت؛ کہ جلوت میں بھی خلوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مساجد میں شروع فرمایا ہے۔ مخاطبین میں بعض ایسے تھے کہ یہ سن کر دس روز تک مسجد میں رہیں گے، نفس کو مزہ آیا کہ آہا خوب باتیں گھڑیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اس طرح انسداد فرمایا کہ مسجد میں ایک چٹائی کا حجرہ بنایا اور اس میں رہے۔ فرمایا کہ مسجد میں اس طرح رہنا چاہیے اور یہی ماخذ ہے اس عادت کا کہ پردہ وغیرہ اعتکاف میں باندھ لیتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شاید کوئی غلو کرتا۔ اس لیے کہ یہ ایک امتیاز کی شان ہے کہ حجرہ میں خود بیٹھے رہیں اور باہر مریدین ومعتقدین جمع ہیں۔ شاہ صاحب نکلیں گے تو زیارت کریں گے اور باتیں کریں گے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ نماز کے وقت کہ وہی وقت اجتماع کا ہے خود بخود باہر رونق افروز ہو گئے۔ اسی بنا پر اہل اعتکاف کا طریقہ ہے کہ نماز کے وقت پردہ وغیرہ سب اٹھا دیتے ہیں تا کہ کوئی امتیازی شان پیدا ہو کر عجب نہ ہو۔ واللہ اگر تمام جہاں کے عقلا چاہتے ہیں کہ ان مصالح کی رعایت کریں تو ہرگز نہ کر سکتے۔ یہ نورِ وحی ہے کہ جو ایسے دقیق دقیق مصالح کی رعایت فرمائی۔

علاوہ اس کے ایک اور دقیق رعایت یہ کہ اس پر نظر فرمائی کہ رات کو کام زیادہ کرنا چاہیے، لیکن رات آرام کا وقت ہے۔ اگر دس کی دس راتیں کام کریں تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے ان راتوں کی حق تعالیٰ نے عجیب طریقہ سے تقسیم فرمائی کہ طاق راتوں کو شب قدر بنا کر بتلا دیا کہ ایک رات سوؤ اور ایک رات جاگو اور ان راتوں میں ایسی برکات رکھ دیں کہ ہزار مہینوں کی خلوت سے وہ رات نصیب نہیں جو ان راتوں سے ہوتی ہے۔ اگر حکما اپنی عقل سے ہزار تدبیریں کرتے اور تدبیریں کرتے کرتے مر جاتے تو یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ اس لیے کہ اس کا ادراک کیسے ہوتا؟ کہ کون سے زمانہ میں کتنی برکت رکھی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح کسی زمانہ کے اندر کوئی برکت پیدا کرنے کی بھی قدرت نہ تھی۔ یہ تو خالق الزماں کے تصرف سے برکت پیدا ہو گئی اور انہیں کے بتلانے سے معلوم ہوا۔ صاحبو! یہ برکات تم کو مفت ملتی ہیں۔ دس دن نہ سہی، کم از کم تین ہی دن دنیا کے بکھیڑے چھوڑ کر مسجد میں بیٹھ جاؤ، تین دن نہ سہی ایک ہی دن سہی۔ علما نے لکھا ہے کہ ایک گھنٹہ کا اعتکاف بھی مشروع ہے۔ اللہ اللہ اگر اب بھی کوئی محروم رہے تو بہت ہی خسران کی بات ہے۔ ان کی طرف سے تو کچھ کمی نہیں ہے، لیکن آپ بھی تو کچھ حرکت کیجیے، ہماری اور حق تعالیٰ کی ایسی مثال ہے جیسے بچہ اور آپ کہ بچہ چل نہیں سکتا، لیکن تم منتظر

اس کے ہو کہ یہ کچھ حرکت کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرتے تو میں اس کو گود میں اٹھالوں گا، سنبھال لوں گا۔ اسی طرح حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ بندہ کچھ تو کرے۔ جب یہ کچھ حرکت کرتا ہے تو ادھر سے رحمت ہوتی ہے، جذب ہوتا ہے، ورنہ اگر ادھر سے جذب نہ ہوتا تو یہ مسافت آپ کے قطع کرنے سے قطع نہ ہوتی۔

جو چیزیں فرض وواجب ہیں ان کے آداب قرآن میں مذکور نہیں، بل کہ وہاں صرف صیغہ وجوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً **أتموا الصيام إلى الليل** (روزوں کو رات تک پورا کرو) اور یہاں خود **ولا تباشروهن وانتم عاكفون في المساجد** (اپنی بیویوں سے مباشرت مت کرو جس وقت کہ تم مسجدوں میں معتکف ہو) فرمایا اس میں اعتکاف کے آداب تو بتلائے مگر اس کے فرض وواجب ہونے سے سکوت فرمایا، ایک قسم کا اعتدال ہے کہ نہ فرض وواجب نہ مباح بل کہ سنت ہے۔ اگر اسے فرض کر دیتے تو اعتدال نہ رہتا۔ اس میں یہ خاص اعتدال رکھا ہے کہ کوئی کرے اور کوئی نہ کرے اور چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہمیشہ کیا ہے اور نہ کرنے والوں پر ملامت بھی نہیں فرمائی، اس لیے محققین کا مذہب اس سے متعلق سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہونے کا ہے کہ ایک کرلے سب پر بوجھ اتر گیا۔ ایک کرلے اس کی برکت اوروں کو بھی پہنچ جائے وہ بھی محروم نہ رہیں۔ یہ معنی ہیں سنت علی الکفایہ ہونے کے۔ غرض اعتکاف میں ہر طرح کا اعتدال ہے۔ اور بھی بہت سی حکمتیں۔

فی المساجد کی تخصیص سے ایک حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ کہ مساجد کو اعتکاف کے واسطے اس واسطے مقرر کیا کہ فضیلت جماعت بھی منجملہ فضیلتوں کے ہے، تاکہ دونوں فضیلتیں جمع ہو جائیں، اعتکاف کی بھی اور جماعت کی بھی۔ اگر کوئی کوہ یا صحرا یا مکان کی کوئی کوٹھڑی اس کے واسطے تجویز کرتے تو یہ جماعت کی فضیلت سے محروم رہ جاتا۔ نیز اس میں ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تم خود اس جماعت کی برکت کے محتاج ہو۔ اگر نمازی نہ ہوتے تو تم کو یہ برکت کہاں سے حاصل ہوتی؟ تم جماعت کی برکت سے محروم رہتے۔ پس اطاعت کے ساتھ ساتھ عجب کا بھی علاج ہو گیا، سبحان اللہ کیا اعتدال ہے۔ حکما کی تجویز کردہ خلوت میں یہ باتیں کہاں۔ اور جب اپنے کو برکات میں ان کا محتاج سمجھے گا تو اس کو کبر نہ ہوگا، خلوت اختیار کرتے ہیں کہ لوگوں کے ضرر سے بچیں۔ غرض اوروں کو حقیر سمجھنے کا جو مرض خلوت سے پیدا ہو سکتا تھا اس کا بھی علاج ہوگا کہ جن کو یہ حقیر سمجھ کر الگ ہوا تھا وہی اہل برکت ہیں۔ انہیں کی بدولت اسے برکت جماعت حاصل ہوئی، نیز اسے اس پر بھی اب ناز نہ ہوگا کہ میرے اعتکاف کی وجہ سے اور لوگوں کو برکت پہنچی، کیوں کہ یہ خیال کرلے گا کہ اصل میں ان لوگوں کے آنے کی وجہ سے مجھے جماعت؛ بل کہ اعتکاف کی بھی برکت حاصل ہوئی اور اس کا جماعت کا موقع ہونے سے مجھ کو

اعتکاف کی اجازت ہوئی۔ تو اصل میں، میں بھی ان کا محتاج ہوا یہ پورا علاج ہے کبر وعجب کا۔ سبحان اللہ کیسی دوا ہے کہ پرہیز بھی ہے اور دوا بھی ہے۔

اسی طرح عاکفون بھی ایک حکمت پر دلالت کر رہا ہے کہ عاکفون کے معنی حبس کے ہیں۔ عاکفون یہ بتلا رہا ہے کہ اس میں حبس نفس مقصود ہے۔ اس کا صلہ کبھی عن کے ساتھ آتا ہے اور کبھی فی یا علی کے ساتھ۔ یہاں صلہ لائے فی کے ساتھ، مطلب یہ کہ نفس کو مقید کر دو مساجد میں، جو بیت اللہ ہیں۔ اب معنی **عاکفون فی المساجد** کے یہ ہوئے کہ **عاکفون فی بیوت اللہ** محبوس ہوتے ہیں وہ اللہ کے گھروں میں اور بیوت اللہ میں محبوس ہونا کس کے واسطے ہے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے لیے ہے۔ پس حقیقت وہ ہوئی جس کو امیر خسرو نے بیان کر دیا ہے۔

خسرو غریب است وگدا افتادہ در کوئے شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

(خسرو غریب وگدا آپ کے کوچہ میں پڑا ہوا ہے، خدا کے لیے غریبوں کی طرف بھی نظر فرمایئے) اور جب اعتکاف کی یہ حقیقت ہے اور حقیقت اس عنایت کے لوازم ہے تو عاکفون میں بھی یہ بتا دیا کہ جب تم ہمارے دروازے پر آ پڑو گے تو کیا ہم تم کو محروم کر دیں گے، تو ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ ایک حکمت عاکفون میں اور بتلا دی جو گویا روح الروح ہے۔ روح تو خلوت ہے خلوت کی روح ذکر اللہ ہے، کیوں کہ حقیقت مذکورہ دال ہے ذکر اللہ پر بوجہ اس کے؛ کہ جس کوچہ میں سب کو چھوڑ کر جا پڑیں گے کیا اس کو دل سے بھلا سکتے ہیں، پس اس کی یاد ضروری ہوئی اور اس کے ساتھ اوروں کا چھوڑنا اور یہی حاصل ہے لا الٰہ الا اللہ کا۔ تو گویا اعتکاف میں نظر اسی پر مقصود رہے کہ لا الٰہ الا اللہ۔ تو حقیقت میں اعتکاف فنائے محض ہے۔ تو جس نے اس نیت سے اعتکاف کیا وہ واقعی معتکف ہے، ورنہ جو شخص بلا اس کے رہا اس کا اعتکاف بلا روح ہے۔

پھر یہ رحمت دیکھیے کہ اعتکاف میں حاجتوں کو خدا نے منع نہیں کیا۔ ان کے قضا کرنے کے لیے مساجد سے باہر نکلنے کی اجازت بھی دے دی، پھر بھی اگر کسی سے نہ ہو سکے تو اس کا قصور ہے۔ مباشرت میں چوں کہ حاجت خفیف ہے، اس لیے کہ **لا تباشروھن** سے مباشرت کی ممانعت کر دی اور کھانے پینے کی حاجت شدید ہے اس کے کرنے کی بھی اجازت دی، مثلاً مسجد کے اندر کھانے کی اجازت ہے اور لانے کی بھی اجازت دی۔ اور حاجت کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر کوئی مثلاً بساطی ہے اور بساط اس کی اتنی ہے کہ اس پر گزرے تو

اس جائز ہے کہ وہ تجارت بھی مسجد میں کرلے۔ مگر اسباب مسجد میں نہ لاوے، کیا ٹھکانا ہے وسعت کا، خدا کے معاملات کو دیکھو کس قدر سہل ہیں۔ پھر بھی اگر ان سے کوئی تجاوز کرے تو پھر ایسے اعتکاف سے فائدہ کیا؟

ایک حکمت اعتکاف میں یہ ہے کہ اس میں شب قدر کی تلاش (ثواب ڈھونڈنا) بھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے: شب قدر کو طاق راتوں میں تلاش کرو۔

اور اس حکمت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معتکف کو اپنا ضروری سامان مسجد میں رکھنا جائز ہے؛ مگر زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔ کیوں کہ اس سے تو وہ بھی گھر بن جائے گا، پھر جس طرح گھر میں عبادت و بیداری میں دشواری تھی وہی بات مسجد میں ہوگئی۔ سب کا حاصل یہ ہوا کہ مسجد میں تو گھر کے فتنہ سے چھڑا کے لائے تھے، وہاں تم نے اتنا بکھیڑا اکٹھا کیا کہ وہ بھی گھر کی طرح ہوگئی۔ مسجد میں معتکف کو اتنا بکھیڑا نہ لے جانا چاہیے، بعضے آدمی ہوتے بھی ہیں بکھیڑیے، گو گناہ تو نہیں مگر خلاف ادب ہے۔ مسجد میں آئے ہو گھر چھوڑ کے، اگر تم نے اسے بھی گھر بنالیا تو مسجد میں آنے کا کیا فائدہ ہوا؟ غرض نہایت مختصر سامان کے ساتھ مسجد میں آنا چاہیے، بل کہ اپنے گھر میں بھی نہایت مختصر سامان سے رہنا چاہیے تو مسجد میں پھر خانۂ خدا ہے، اس میں زیادہ بکھیڑا لانا مناسب نہیں۔

یہ پانچ راتیں ہیں جن میں احتمال ہے شب قدر کا، سبحان اللہ! **اعاکفون فی المساجد** نے اس کی تلاش کے لیے مسجد میں پہنچا دیا۔ بھلا گھر میں اس کی کہاں فرصت؟ مسجد میں معتکف کو اس لیے لایا گیا کہ شب قدر کی تلاش سہل ہو، کیوں کہ بہت سے آدمی ہوں گے جب سب ایک ہی کام میں مشغول ہوں گے تو دل بھی لگے گا۔

اور اس میں بھی عجیب حکمت ہے کہ شب قدر کی تاریخ معین نہیں کی، کیوں کہ مقصود پانچ راتوں میں جگانا تھا، پھر سبحان اللہ! اس میں یہ کیسا اعتدال ہے کہ متواتر پانچ راتوں میں نہیں جگایا، ایک رات جگایا اور ایک رات سلایا۔ اور پھر اس سونے میں بھی ثواب جگانے کا دیا۔ یہ بات میں اپنی طرف سے گھڑ کے نہیں کہتا، حدیث سے ثابت ہے، سونا جب ذریعہ ہے جاگنے کا اور وہ ذریعہ ہے عبادت کا اور وہ بھی ہے اسی عبادت کے قصد سے تو اس میں کیوں ثواب نہ ملے گا؟

شب قدر نہایت قابل قدر چیز ہے، اس میں جاگنا اور خدا کی عبادت کرنا چاہیے اور کوئی ساری رات جاگنا ضروری نہیں۔ جتنا جس سے ہوسکے جاگے، ہاں یہ ضرور ہے کہ عادت سے کسی قدر زیادہ جاگے اس عبادت شب قدر کی روح مشاہدہ ہے۔ اس میں حق جل وعلیٰ شانہ کی تجلی ہوتی ہے اور گو ہمیں ان تجلیات کا دکھائی دینا

ضروری نہیں مگر اس کی پہچان اس سے ہوتی ہے کہ اس میں اور، اور راتوں میں یہ فرق ہے کہ اس رات میں بہ نسبت اور راتوں کے عبادت میں زیادہ جی لگتا ہے، قلب کو غفلت نہیں ہوتی اور کیوں ہو، وصل کے ساتھ ہجر جمع نہیں ہوتا۔

شب قدر است طے شد نامہ ہجر
سلام فیہ حتی مطلع الفجر

شب قدر میں نامہ ہجر لپیٹ دیا گیا ہے، اس میں سراپا سلامتی و برکت ہے طلوع فجر تک۔

اس رات کی یہ فضیلت ہے کہ تنزل الملائکۃ والروح فیہا من الملائکۃ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور اس میں دو احتمال ہیں یا تو اس میں فضیلت اس وجہ سے آئی ہے کہ اس میں ملائکہ نازل ہوتے ہیں یا ملائکہ اس وجہ سے نازل ہوتے ہیں کہ اس میں پہلے سے فضیلت ہے، بہر حال جو بھی ہو۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
در بکشد زہے طرب و ربکشم زہے شرف

اس کا دامن ہاتھ آجائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل۔ ہم کھینچ لیں تب بھی، اس طرح اس میں بھی بہر حال فضیلت ہے اس واسطے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو اس رات سے محروم رہ گیا وہ بڑی دولت سے محروم رہ گیا، یہ دن سال بھر کے بعد آتے ہیں، ان کی قدر کرنا چاہیے، کیوں کہ زندگی کا کیا بھروسہ؟ یوں تو ہر رات میں من وجہ فضیلت ہے، یہ اس لیے کہتا ہوں کہ اگر کسی سے فوت ہو جائے تو اور ہی کسی رات میں کچھ کر لے، گو وہ ویسی تو نہ ہوگی مگر کام بن جائے گا۔

ای خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی
ہر شب شب قدر ست اگرقدر بدانی

(شب قدر کی نشانی کو تم کیا دریافت کرتے ہو، اگر قدر کرو تو ہر رات شب قدر ہے)۔

لیکن اس میں پھر بھی خصوصیت ہی ہے۔

اوپر جو ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں تجلی حق ہوتی ہے۔ اس میں بھی دو احتمال ہیں یا تو اس شب کی فضیلت کے سبب اس میں تجلی ہوتی ہو اور یا خود تجلی کے سبب اس کی فضیلت ہوتی ہو۔ حافظ شیرازی کے قول سے احتمال ثانی اقرب معلوم ہوتا ہے، چناں چہ فرماتے ہیں۔

آن شب قدر ے کہ گویند اہل خلوت امشب است
یارب ایں تاثیر دولت ازکدا میں کوکب است

(وہ شب قدر کی اہل خلوت کہتے ہیں آج کی رات ہے یارب! اس میں یہ فضیلت کس کوکب کی وجہ سے آئی؟)۔

یعنی یہ فضیلت شب قدر میں کس کوکب کی وجہ سے آئی، کوکب سے مراد تجلی حضرت حق جل وعلیٰ شانہ ہے مع ظہور۔ بہر حال یہ وقت عزیز ہے، بڑے فیوض وانوار وبرکات کا ہے۔ اس میں جہاں تک ہو سکے اعتکاف کرو، اگر نہ ہو سکے تو ان پانچ راتوں میں جاگ ہی لو۔ اگر تمام راتوں میں نہ ہو سکے تو بعض میں جاگ لو، بعض کے بھی بعض حصہ جاگ لو تو تب بھی کافی ہے۔ (اخذ وتلخیص: مسلم سجاد)

## وظائف اور دعائیں:

"**الدعاء مخ العبادة**" (رواہ الترمذی)

ہر کام کو طریقہ سے کرنا چاہئے پھر کامیابی قریب ہو جاتی ہے کسی نے خوب کہا ہے ۔

جو مانگنے کا طریقہ ہے اس طرح مانگو درِ کریم سے بندے کو کیا نہیں ملتا؟

**حدیث نمبر ۱**: ترمذی میں ہے کہ جس شخص کے لیے دعا کے دروازے کھول دیئے گئے اس کے لیے گویا رحمت کے (بہت سے) دروازے کھولے گئے۔

**حدیث نمبر ۲**: جمع الفوائد میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آؤ میں تمہیں ایسی چیز بتادوں جو تمہیں تمہارے دشمنوں سے بھی نجات دلائے اور تمہاری روزی بھی بڑھائے۔ وہ یہ ہے کہ تم رات دن میں (جس وقت یا جتنی بار مانگ سکو) اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں مانگا کرو۔

(ادب نمبر ۱) کھانے پینے کے بعد اور کمانے میں حرام سے بچنا۔

(ادب نمبر ۲) اخلاص کے ساتھ دعا کرنا یعنی دل سے یہ سمجھنا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی ہمارا مقصد پورا نہیں کر سکتا۔ (الحاکم)

(ادب نمبر ۳) دعا سے پہلے کوئی نیک کام کرنا اور بوقت دعا اس کا اس طرح ذکر کرنا کہ یا اللہ میں نے آپ کی رضا کے لیے فلاں عمل کیا ہے آپ اس کی برکت سے میرا فلاں کام کر دیجیے۔ (مسلم وغیرہ)

(ادب نمبر۴) پاک وصاف ہوکر دعا کرنا۔

(ادب نمبر۵) وضوکر کے دعا کرنا۔

(ادب نمبر۶) دعا کے وقت قبلہ رخ ہونا۔(صحاحِ ستہ)

(ادب نمبر۷) دوزانو ہوکر بیٹھنا۔

(ادب نمبر۸) دعا کے اول وآخر میں حق تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔

(ادب نمبر۹) اسی طرح اول وآخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا۔

(ادب نمبر۱۰) دعا کے لیے دونوں ہاتھ پھیلانا۔

(ادب نمبر۱۱) دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے برابر اٹھانا۔

(ادب نمبر۱۲) ادب وتواضع کے ساتھ بیٹھنا۔

(ادب نمبر۱۳) اپنی محتاجی اور عاجزی کو ذکر کرنا۔

(ادب نمبر۱۴) دعا کے وقت آسمان کی طرف نظر نہ اٹھانا۔

(ادب نمبر۱۵) اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ ذکر کر کے دعا کرنا۔

(ادب نمبر۱۶) دعا کے وقت انبیا اور دوسرے مقبول وصالح بندوں کے ساتھ توسل کرنا۔یعنی یہ کہنا کہ یااللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما!(بخاری)

(ادب نمبر۱۷) دعا میں آواز پست کرنا۔

(ادب نمبر۱۸) ان دعاؤں کے ساتھ دعا کرنا جو آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ کیوں کہ آپ نے دین ودنیا کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی، جس کی دعا تعلیم نہ فرمائی ہو۔

(ادب نمبر۱۹) ایسی دعا کرنا جو اکثر حاجات دینی ودنیوی کو حاوی اور شامل ہو۔

(ادب نمبر۲۰) دعا میں اول اپنے لیے دعا کرنا اور پھر اپنے والدین اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو شریک کرنا۔

(ادب نمبر۲۱) اگر امام ہو تو تنہا اپنے لیے دعا نہ کرے، بل کہ سب شرکائے جماعت کو دعا میں شریک کرے۔

(ادب نمبر۲۲) عزم کے ساتھ دعا کرے (یعنی یوں نہ کہے کہ یا اللہ اگر تو چاہے تو میرا کام پورا کردے)۔

(ادب نمبر۲۳) رغبت وشوق کے ساتھ دعا کرے۔

(ادب نمبر۲۴) جس قدر ممکن ہو حضور قلب کی کوشش کرے اور قبولیت کی امید قوی رکھے۔

(ادب نمبر۲۵) دعا میں تکرار کرنا، اور کم سے کم مرتبہ تکرار تین مرتبہ ہے۔

(ف) ایک ہی مجلس میں تین مرتبہ دعا کو مکرر کرے یا تین مجلسوں میں کہے دونوں طرح تکرار دعا صادق ہے۔

(ادب نمبر۲۶) دعا میں الحاح واصرار کرے۔

(ادب نمبر۲۷) کسی گناہ کی دعا نہ کرے جو طے ہو چکی ہے۔ مثلاً عورت یہ دعا نہ کرے کہ میں مرد ہو جاؤں یا طویل آدمی یہ دعا نہ کرے کہ پست قد ہو جاؤں۔

(ادب نمبر۲۸) کسی محال چیز کی دعا نہ کرے۔

(ادب نمبر۲۹) اللہ تعالیٰ کی رحمت کو صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کی دعا نہ کرے۔

(ادب نمبر۳۰) اپنی سب حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے طلب کرے مخلوق پر بھروسہ نہ کرے۔

(ادب نمبر۳۱) دعا کرنے والا بھی آخر میں آمین کہے اور سننے والا بھی۔

(ادب نمبر۳۲) دعا کے بعد دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر پھیرے۔ (ابوداؤد وغیرہ)

(ادب نمبر۳۳) قبولیت دعا میں جلدی نہ کرے۔ یعنی یہ نہ کہے کہ میں نے دعا کی تھی اب تک قبول کیوں نہیں ہوئی۔ (بخاری وغیرہ)

## وہ لوگ جن کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں:

مضطر، یعنی مصیبت زدہ کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ (بخاری) مظلوم، اگرچہ فاسق وفاجر ہو اس کی بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ (مسند احمد) بل کہ اگر مظلوم کافر بھی ہو تو اس کی بھی دعا رد نہیں ہوتی (مسند احمد، ابن حبان) والد کی دعا اولاد کے لیے بھی قبول ہوتی ہے۔ (مسلم) مسافر کی دعا بھی مقبول ہے۔ (ابوداؤد) روزہ دار کی دعا روزہ افطار کے وقت۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان) غائبانہ دعا کسی مسلمان کی دوسرے کے لیے مقبول ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، ابن ابی شیبہ) حجاج کی دعا (جب تک وہ وطن واپس نہ آئیں) (جمع الفوائد ۹)

☆.....☆.....☆

# ہم زکوٰۃ کیسے ادا کریں؟

اکثر مسلمان رمضان المبارک میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اس لیے:

اللہ کی توفیق سے یہ تحریر پڑھنے کے بعد آپ اِس قابل ہوجائیں گے کہ آپ جان سکیں کہ زمین کی پیداوار، مال تجارت، جانور، پلاٹ، کرایہ پر دیے گئے مکان، گاڑیوں اور دکان وغیرہ کی زکوٰۃ کیسے ادا کی جاتی ہے؟

## منکرِ زکوٰۃ کا حکم:

زکوٰۃ کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ (حم السجدہ: آیت نمبر ۶۔۷)

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو قیامت کے دن سخت عذاب دیا جائے گا۔ (التوبہ: ۳۴۔۳۵)

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والی قوم قحط سالی کا شکار ہوجاتی ہے۔ (طبرانی)

## زکوٰۃ ادا کرنے کی فضیلت:

زکوٰۃ ادا کرنے والے قیامت کے دن ہر قسم کے غم اور خوف سے محفوظ ہوں گے۔ (البقرہ: ۲۷۷)

زکوٰۃ کی ادائیگی گناہوں کا کفارہ اور درجات کی بلندی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ (التوبہ: ۱۰۳)

## زکوٰۃ کا حکم:

زکوٰۃ ہر ایسے مسلمان مال دار مرد اور عورت پر واجب ہے، جو آزاد، سمجھ دار، بالغ اور صاحب نصاب ہو۔

**نـــــوٹ**: سود، رشوت، چوری، ڈکیتی اور دیگر حرام سے کمایا ہوا مال سے زکوٰۃ دینے کا بالکل فائدہ نہیں ہوگا۔ صرف حلال کمائی سے دی گئی زکوٰۃ قابل قبول ہے۔

## زکوٰۃ کتنی چیزوں پر ہے؟

زکوٰۃ چار چیزوں پر ہے۔ (۱) سونا چاندی (۲) زمین کی پیداوار (۳) مال تجارت (۴) جانور۔

## سونے کی زکوٰۃ:

ساڑھے سات تولہ سونا یعنی موجودہ مقدار ستاسی گرام چار سو انا سی ملی گرام (۸۷،۴۷۹) سونا پر زکوٰۃ واجب ہے۔ (المسائل المہمۃ: ۱/۹۶)

**نوٹ**: سونا محفوظ جگہ ہو یا استعمال میں، ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(سنن ابوداؤد کتاب الزکاۃ اور دیکھیے حاکم ج ۱/ص ۳۹۰، فتح الباری ج ۴/ص ۱۳)

## چاندی کی زکوٰۃ:

ساڑھے باون تولے چاندی یعنی موجودہ مقدار چھ سو بارہ گرام پینتیس ملی گرام (۶۱۲،۳۵) پر زکوٰۃ واجب ہے۔اس سے کم وزن پر نہیں۔(ابن ماجہ)

## زکوٰۃ کی شرح:

زکوٰۃ کی شرح بہ لحاظ قیمت یا بہ لحاظ وزن ڈھائی فی صد ہے۔(بخاری کتاب الزکاۃ)

## زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ:

مصنوعی ذرائع سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار اگر پانچ وسق یعنی ۹۴۴ کلو ۸۴۷ گرام ہے تو زکوٰۃ نصف عشر (بیسواں حصہ) دینا ہوگا ورنہ نہیں۔

قدرتی ذرائع سے سیراب ہونے والی پیداوار پر شرح زکوٰۃ دسواں حصہ ہے۔(دیکھیے صحیح بخاری کتاب الزکاۃ)

**نوٹ**: آسمانی پانی سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار مثلاً گندم، مکی، چاول، باجرہ، آلو، سورج مکھی، کپاس، گنا اور دیگر قسم کی پیداوار سے زکوٰۃ (عشر) دسواں حصہ نکالنا ہوگا۔(صحیح بخاری کتاب الزکاۃ)

جو جانور سال کا اکثر حصہ جنگل بیابان میں چر کر گزارہ کرتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب ہے، جو جانور آدھا سال یا اس سے کم حصہ چر کر گزارہ کرتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔اسی طرح جن جانوروں کو گھر میں چارا کھلایا جاتا ہے ان میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔(کتاب المسائل:۲/۲۳۴)

جو جانور گوشت کھانے کھلانے، سواری یا کھیت جوتنے وغیرہ کے لیے پالے جائیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔جو جانور تجارت کی نیت سے خریدے جائیں، ان میں جانوروں کی قیمت کے اعتبار سے ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی، جو جانور دودھ حاصل کرنے یا نسل چلانے کی نیت سے پالے جائیں، ان میں نیچے دی گئی تعداد کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوں گی۔(کتاب المسائل:۲/۲۳۵)

## اونٹوں کی زکوٰۃ:

پانچ سے نو تک اونٹوں کی زکوٰۃ ایک سالہ بکری یا بکرا اور دس سے چودہ تک اونٹوں کی زکوٰۃ دو بکریاں یا دو بکرے ہیں۔پانچ سے کم اونٹوں پر زکوٰۃ واجب نہیں۔(صحیح بخاری کتاب الزکاۃ)

## بھینسوں اور گایوں کی زکوٰۃ:

۳۰ر سے انتالیس تک گایوں پر ایک سالہ گائے یا بیل: بھینس/ بھینسا زکوٰۃ ہے۔۴۰ر سے انسٹھ تک گایوں پر دوسال سے بڑا بچھڑا زکوٰۃ دیں۔(ترمذی:ج۱/۵۰۹)

بھینسوں کی زکوٰۃ کی شرح بھی گایوں کی طرح ہے۔

## بھیڑ بکریوں کی زکوٰۃ:

۴۰ر سے ۱۲۰ر تک بھیڑ بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ ہے۔۱۲۰ر سے لے کر ۲۰۰ر تک دو بکریاں زکوٰۃ ہیں۔(صحیح بخاری کتاب الزکاۃ)

۴۰ر بکریوں سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

## کرایہ پر دیے گئے مکان پر زکوٰۃ:

کرایہ پر دیے گئے مکان پر زکوٰۃ نہیں، اگر اُس کا کرایہ سال بھر جمع ہوتا رہتا ہے جو نصاب تک پہنچ جائے اور اس پر سال بھی گزر جائے تو پھر اس کرایے پر زکوٰۃ واجب ہے۔اگر کرایہ سال پورا ہونے سے پہلے خرچ ہو جائے تو پھر زکوٰۃ نہیں، شرح زکوٰۃ ڈھائی فی صد ہوگی۔

## گاڑیوں پر زکوٰۃ:

کرایہ پر چلنے والی گاڑیوں کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں، بل کہ حاصل ہونے والے کرایہ پر ہے۔وہ بھی اِس شرط کے ساتھ کہ کرایہ سال سال بھر جمع ہوتا رہے جو نصاب تک پہنچ جائے۔

**نوٹ**: گھریلو استعمال والی گاڑیوں پر زکوٰۃ نہیں۔(صحیح البخاری)

## سامانِ تجارت پر زکوٰۃ:

دکان کسی بھی قسم کی ہو، اس کے سامانِ تجارت پر زکوٰۃ دینا واجب ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ وہ مال نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے۔

**نوٹ**: دکان کے تمام مال کا حساب کر کے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دیں۔یعنی دکان کی اس آمدنی پر زکوٰۃ نہیں، جو ساتھ ساتھ خرچ ہوتی رہے، صرف اس آمدنی پر زکوٰۃ دینا ہوگا جو بینک وغیرہ میں پورے سال پڑی رہے اور وہ اتنی ہو کہ ان سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکے۔

## پلاٹ یا زمین پر زکوٰۃ:

جو پلاٹ منافع حاصل کرنے کے لیے خریدا ہو اس پر زکوٰۃ ہوگی اور ذاتی استعمال کے لیے خریدے گئے پلاٹ پر زکوٰۃ نہیں۔ (سنن ابی داؤد: کتاب الزکاۃ حدیث نمبر ۱۵۶۲)

## کس کس کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

ماں باپ، اولاد اور بیوی کے سوا سب زکوٰۃ کے مستحق مسلمانوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ والدین، اولاد اور بیوی پر اصل مال خرچ کریں زکوٰۃ نہیں۔

**نوٹ**: (ماں باپ میں دادا دادی، نانا نانی اور اولاد میں پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں بھی شامل ہیں۔ (ابن باز)

## زکوٰۃ کے مستحق لوگ:

(۱) مساکین (وہ لوگ جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو) (۲) غریب (وہ لوگ جن کے پاس نصاب کے بقدر کوئی مال نہ ہو) (۳) زکوٰۃ وصول کرنے والے (۴) مقروض (۵) غیر مسلم جو اسلام کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہو (۶) قیدی (۷) مجاہدین (۸) مسافر (سورۃ التوبہ: ۶۰)

## زکوٰۃ سے متعلق سوال و جواب:

سوال نمبر ۱: زکوٰۃ کے لغوی معنی بتائیے۔ جواب: پاکی اور بڑھوتری کے ہیں۔

سوال نمبر ۲: زکوٰۃ کی شرعی تعریف کیجیے۔

جواب: مال مخصوص کا مخصوص شرائط کے ساتھ کسی مستحق زکوٰۃ کو مالک بنانا۔

سوال نمبر ۳: کتنا سونا ہو تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ جواب: ساڑھے سات تولہ یا اس سے زیادہ۔

سوال نمبر ۴: کتنی چاندی ہو تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ جواب: ساڑھے باون تولہ یا اس سے زیادہ۔

سوال نمبر ۵: کتنا روپیہ ہو تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟

جواب: اس کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو۔

سوال نمبر ۶: کتنا مال تجارت ہو تو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟

جواب: اس کی مالیت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہو۔

سوال نمبر ۷: اگر کچھ سونا کچھ چاندی ہے، یا کچھ سونا اور کچھ نقد روپیہ ہے، یا کچھ چاندی اور کچھ مال تجارت ہے تو ان سب کو ملا کر دیکھا جائے تو ساڑھے باون تولے چاندی کی مالیت بنتی ہے تو اس صورت میں زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ جواب: فرض ہے۔

سوال نمبر۸: چرنے والے مویشیوں پر بھی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ جواب: فرض ہے۔

سوال نمبر۹: عشری زمین کی پیداوار پر بھی زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ جواب: فرض ہے۔

سوال نمبر۱۰: ایک صاحبِ نصاب شخص کو درمیان سال میں ۳۵۰۰۰/ ہزار کی آمدنی ہوئی تو یہ ۳۵۰۰۰/ ہزار بھی اموال زکوٰۃ میں شامل کیے جائیں گے یا نہیں؟ جواب: شامل کیے جائیں گے۔

سوال نمبر۱۱: صنعت کار کے پاس دو قسم کا مال ہوتا ہے، ایک خام مال جو چیزوں کی تیاری میں کام آتا ہے اور دوسرا تیار شدہ مال۔ ان دونوں قسم کے مالوں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ جواب: فرض ہے۔

سوال نمبر۱۲: مشینری اور دیگر وہ چیزیں جن کے ذریعہ مال تیار کیا جاتا ہے، ان پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟

جواب: فرض نہیں ہے۔

سوال نمبر۱۳: استعمال والے زیورات پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جواب: زکوٰۃ ہے۔

سوال نمبر۱۴: زکوٰۃ انگریزی مہینوں کے اعتبار سے نکالی جائے گی یا ہجری (قمری) کے حساب سے؟

جواب: قمری مہینوں کے حساب سے نکالی جائے گی۔

سوال نمبر۱۵: پلاٹ اگر اس نیت سے لیا گیا تھا کہ اس کو فروخت کریں گے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

جواب: واجب ہوگی۔

سوال نمبر۱۶: پلاٹ خریدتے وقت تو فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی، لیکن بعد میں فروخت کرنے کا ارادہ ہوگیا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

جواب: جب فروخت کر دیا جائے اور رقم پر ایک سال گزر جائے تب زکوٰۃ فرض ہے۔ اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو یہ رقم نصاب میں مل جائے گی۔

سوال نمبر۱۷: جو پلاٹ رہائشی مکان کے لیے خریدا گیا ہو اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جواب: نہیں۔

سوال نمبر۱۸: اگر پلاٹوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کیا جائے اور فروخت کرنے کی نیت سے پلاٹ خریدا جائے تو زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے گی؟

جواب: ان کی کل مالیت پر زکوٰۃ ہر سال واجب ہوگی۔

سوال نمبر۱۹: جو مکان کرایہ پر دیا ہے، اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس سے حاصل ہونے والے کرایہ پر جب کہ نصاب کو پہنچے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سوال نمبر۲۰: حج کے لیے رکھی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ جواب: زکوٰۃ واجب ہے۔

سوال نمبر۲۱: کسی کو ہم زکوٰۃ دیں اور اس کو بتائیں نہیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں ؟

جواب: ادا ہو جائے گی۔

سوال نمبر۲۲: ملازم نے اضافی تنخواہ کا مطالبہ کیا تو مالک نے زکوٰۃ کی نیت سے اضافہ کر دیا۔ تو کیا اس کی زکوٰۃ ادا ہوئی یا نہیں؟

جواب: زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی۔

سوال نمبر۲۳: کیا انکم ٹیکس ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے؟

جواب: زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

سوال نمبر۲۴: اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد، اسی طرح شوہر بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: نہیں۔

سوال نمبر۲۵: جو لوگ خود صاحب نصاب ہوں ان کو زکوٰۃ دینا جائز ہے یا نہیں؟ جواب: نہیں۔

سوال نمبر۲۶: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان (ہاشمی حضرات) کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: نہیں۔

سوال نمبر۲۷: اپنے بھائی، بہن، چچا، بھتیجے، ماموں، بھانجے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اگر مستحق ہیں تو جائز ہے۔

سوال نمبر۲۸: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان یعنی: آل علی، آل عقیل، آل عباس، آل جعفر اور آل حارث بن عبدالمطلب؛ ان پانچ بزرگوں کی نسل سے ہو تو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: نہیں۔

سوال نمبر۲۹: اگر سید غریب اور ضرورت مند ہو تو ان کی خدمت کیسے کرنی چاہیے؟

جواب: زکوٰۃ وصدقات واجبہ کے علاوہ نفلی صدقات اور ہدیہ وغیرہ سے ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔

سوال نمبر۳۰: سادات کو زکوٰۃ کیوں نہیں دی جاتی؟

جواب: ان کی شرافت اور احترام کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو زکوٰۃ (صدقات واجبہ) کے استعمال سے منع فرمایا ہے، اس لیے ان کو زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے۔ (کتاب المسائل: ۲/۲۶۶)

سوال نمبر۳۱: سید کی غیر سید بیوی؛ جو کہ زکوٰۃ کی مستحق ہو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب: اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

(مولانا امجد رحمانی پالنپوری صاحب.....تغییر یسیر کے ساتھ)

# انفاق فی سبیل اللہ

علامہ ابتسام الٰہی ظہیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳ ر میں جہاں متقی لوگوں کے لیے دیگر اوصاف بیان فرمائے، وہاں اس صفت کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے کئی آداب ہیں۔ جن کا ذکر قرآن مجید کے مختلف مقامات پر کیا گیا ہے ان میں چند آداب درج ذیل ہیں:

**۱- محبوب چیز کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنا:** جو چیز انسان کو محبوب اور مرغوب ہو، جب وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو نیکو کاروں میں شامل فرما لیتے ہیں۔

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۹۲ ر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "تم ہرگز نیکی کو نہیں سکتے، جب تک تم ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو۔"

آں چہ داری صرف کن درراہِ او

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

**۲- احسان جتلانے سے اجتناب:** جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال کو خرچ کرتا ہے تو اس کو اس مال کو خرچ کرتے ہوئے لوگوں پر احسان نہیں جتلانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۲ ر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں نہ ایذا دیتے ہیں، ان کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے ان پر نہ کچھ خوف ہے نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

**۳- دکھلاوے سے اجتناب:** انسان جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال کو خرچ کرتا ہے تو اس کو دکھلاوے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے ریا کاری کی مذمت کرتے ہوئے سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۴ ر میں ارشاد فرمایا:

"اے ایمان والو! اپنے صدقات احسان جتلانے اور دکھ دینے سے ضایع نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو لوگوں کو دکھلانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

**۴- اللہ کی محبت میں خرچ کرنا:** انفاق فی سبیل اللہ کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جو کچھ بھی خرچ کیا جائے اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت ہو اور اس کے بدلے انسان سے صلہ یا کسی ستائش کی کوئی تمنا نہ ہو۔

سورۂ دہر کی آیت ۸/ میں اسی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو۔

**۵- رضائے الٰہی کی طلب:** اللہ تعالیٰ کی محبت میں خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی رضا اور اپنے نفس کی پختگی کے لیے مال کو خرچ کرنا بھی ضروری ہے، اس حقیقت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۵/ میں یوں فرمایا ہے:

اور جو لوگ اپنے مال اللہ کی رضا حاصل کرنے اور اپنے آپ کو (ایمان واطاعت پر) مضبوط کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک ایسے باغ کی سی ہے جو اونچی سطح پر ہو اس پر زوردار بارش ہو تو وہ دوگنا پھل لائے۔ اور اگر اسے زوردار بارش نہ ملے تو (اسے) شبنم (یا ہلکی سی پھوار) بھی کافی ہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

**۶- پاکیزہ اور حلال مال سے خرچ کرنا:** انفاق فی سبیل اللہ کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ پاکیزہ اور حلال مال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کیا جائے۔ حرام مال کما کر خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی، اس حقیقت کا ثبوت حدیث پاک سے ملتا ہے کہ جو کوئی مال حرام کماتا ہے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۷/ میں یوں بیان کیا ہے: ''اے ایمان والو! تم نے جو پاکیزہ چیزیں کمائی ہیں ان میں سے خرچ کرو۔''

ان آداب کو ملحوظ خاطر رکھ کر جب انسان اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو مختلف دنیاوی اور اخروی فوائد سے بہرہ ور فرماتے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

**۱- سات سو گنا اجر:** جب انسان ایک روپیہ، ایک درہم یا ایک دینار اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کو سات سو سے ضرب دے کر پلٹاتے ہیں۔ اس حقیقت کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۱/ میں یوں فرمایا ہے:

''جولوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سودانے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔''



**۲- مال میں اضافہ:** ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے مال اور تجارت میں اضافہ ہو، اس اضافے کے لیے انسان مختلف طرح کی تدابیر بھی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کو مال میں اضافے کا سبب قرار دیا ہے۔

سورۂ سبا کی آیت نمبر ۳۹ رمیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو پھر وہ اس کا بدلہ دیتا ہے اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۶ رمیں ارشاد فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے۔''

**۳- خوف اور غم سے رہائی:** انسان کو ماضی اور حال کی مشکلات پر غم اور مستقبل کے اندیشوں کے باعث خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، غم اور خوف انسان میں اداسی اور بے قراری پیدا کرتے ہیں اور ہر انسان اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غم سے رہائی کی دیگر تدابیر بتلائی ہیں وہیں پر بکثرت انفاق فی سبیل اللہ کو بھی غم اور خوف سے دوری کا سبب قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۴ رمیں ارشاد فرماتے ہیں:

''جولوگ اپنے مال رات دن چھپ کر اور کھلے میں خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہوگا ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔''

**۴- طہارت اور تزکیہ کا حصول:** دین اسلام میں طہارت اور تزکیہ کے حصول کو بہت اہم قرار دیا گیا ہے اور سورۂ اعلیٰ میں اس شخص کو کامیاب قرار دیا گیا ہے جو تزکیۂ نفس کے بعد اللہ کا ذکر کرتا اور نماز ادا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۳ رمیں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''تم ان کے مالوں میں سے صدقہ دو اس سے تم انہیں پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔''

جس طرح انفاق فی سبیل اللہ کے متعدد فوائد قرآن وسنت سے ثابت ہیں۔ اسی طرح قرآن وسنت

میں خرچ نہ کرنے والوں کو جن نقصانات کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ نہ کرنے کے نتیجے میں مندرجہ ذیل نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔

۱- **مال کا تلف ہوجانا:** اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کرنے والے کئی مرتبہ مال سے محروم ہوجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قلم میں ایک خوش حال زمین دار کا ذکر کیا ہے کہ زمین دار کے بیٹے اپنے باپ کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کرنے کا ارادہ کر چکے تھے، جب وہ صبح کے وقت اپنے کھیت یا باغ پر پہنچے تو ان کا سارا کھیت ان کے برے ارادے اور کھوٹی نیت کی وجہ سے تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

۲- **جہنم کی وعید:** جس طرح جنت کا حصول سب سے بڑی کامیابی ہے، اسی طرح جہنم کا عذاب سب سے بڑی ندامت اور رسوائی ہے۔ جہنم میں لے جانے والے جرائم متعدد ہیں، ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہ کرنا بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۵ میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اس دن اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور اس سے ان کی پیشانیوں، پیٹھوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ یہی وہ مال ہے، جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا تو چکھو جو تم جمع کرتے تھے''۔

۳- **ذلت اور رسوائی:** وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا اور زیادہ مال کی وجہ سے وہ گھمنڈ اور تکبر کا شکار ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دردناک عذاب میں مبتلا کرکے ہمیشہ کی ذلت اور رسوائی کو ان کا مقدر بنا دیا، قارون اور ابولہب صاحب مال ہوکر ہی ذلیل و رسوا ہوئے، ان کی ذلت اور رسوائی کا بڑا سبب یہی تھا کہ انہوں نے مال کی وجہ سے حق کو ٹھکرا دیا، نتیجتاً اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو قصۂ پارینہ بنا دیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مال اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عطا ہے، مال دار لوگ اس عطا کے ذریعے حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چل کر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصے کے مستحق بھی ٹھہر سکتے ہیں۔ مال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت اور اس کی امانت ہے، اب یہ انسان کی اپنی ذات پر منحصر ہے کہ اس کا درست استعمال کرکے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا اس کا غلط استعمال کرکے اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندوں میں شامل ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

# تحصیلِ علم کی اہمیت اور ہماری غفلت

مفتی عبدالقیوم صاحب مالیگانوی (استاذ جامعہ اکل کوا)

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک عظیم، بل کہ ساری نعمتوں کی محافظ نعمت قرآن وحدیث کا علم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں ہمیں ملی ہے۔ جس کے حصول اور طلب کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض اور عین عبادت اور جس کی مشغولیت اور مصروفیت کو خیر المشاغل قرار دیا۔ ارشاد ربانی ہے: "فلو لا نفر من كل فرقة طائفة ليتفقهوا في الدين " اور فرمانِ نبوی ہے "طلب العلم فريضة على كل مسلم و في رواية و مسلمة" اور "خيركم من تعلم القرآن و علمه" نیز تحصیلِ علم کے راہی کو؛ راہیٔ جنت بتلاتے ہوئے فرمایا "من سلک طريقاً يلتمس فيه علماً سهَّل الله له به طريقاً الى الجنة " جس کے لیے بحر و بر کی ساری مخلوق دعائے حفاظت و عافیت کرتی ہیں۔

مچھلیاں پانی میں ، ذرے خاک میں برگ و شجر
نیک عالم کو دعا دیتے ہیں ہر شام و سحر

جس کا سونا بھی عبادت میں شمار ہوتا ہے، جس کی صحبت اور ہم نشینی باعثِ خیر و برکت سمجھی جاتی ہے۔ اِن تمام فضائل ومناقب کے علاوہ مزید احسان و کرم یہ کہ والدین کو اس علم کی طرف متوجہ کیا کہ انہوں نے ہمیں اس نعمتِ گراں مایہ کے حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا اور ہمیں فرصت دی، ہمیں کسب و اکتساب کی ذمہ داری سے دور رکھا اور خود ہر قسم کی محنت ومشقت برداشت کر کے ہمارے لیے پیسوں اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا انتظام کیا۔

مزید یہ کہ اہلِ مدرسہ اور منتظمین نے ہماری آمد پر ہمیں مبارکبادی پیش کی ، ہم سے خوش ہوئے ، ہماری راحت رسانی کے لیے ہر ممکن سعی ، جد وجہد کی اور طرح طرح کی تکلیفیں ، مشقتیں اور صعوبتیں جھیلتے ہوئے ہماری راحتوں اور ضرورتوں کے جملہ انتظامات اور اسباب مہیا کر دیئے۔ تو پھر کیا وجہ ہے؟ کہ ہم خالق اور مخلوق کے ان تمام انعامات واحسانات کے باوجود ایسی غفلت اور لا پرواہی کے شکار ہیں جو تحصیلِ علم کی ضد اور اس کے اعلیٰ مقام کے منافی ہے جس کے ساتھ علم کا آنا تو دور کی بات؛ اس کی خوش بو کا ملنا بھی مشکل ہے۔

اِس وقت ہماری غفلت اور ناقدری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ناامیدی اور مایوسی ہمیں اپنے مکروہ چہرہ کے ساتھ جھانک رہی ہے۔ ہمارے پاس تعطیلات کے بعد تاخیر سے آنا ایک معمولی چیز نہیں، بل کہ معمول بن گیا ہے شادی بیاہ کی تقریبات میں حاضری ہمارے لیے سبق کی حاضری سے کئی گنا زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ گویا شادی میں ہماری شرکت موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہے، ہم موجود نہ ہوں گے تو شاید شادی بربادی میں تبدیل ہوجائے گی۔ اوران تقریبات میں ضرورت پوری ہونے کے بعد گھومنا پھرنا اور مختلف چھوٹے بڑے بہانے اور حیلے تراش کر لیٹ آنا ہمارا ایک دل چسپ مشغلہ بن چکا ہے۔ ہماری مردہ ضمیری اور عدم احساس کی اس وقت حد ہوجاتی ہے، جب اپنے ایک جرم کو صحیح کرنے کے لیے دسیوں جھوٹ جیسے گناہ کا ارتکاب اس طرح بلاجھجک کرتے ہیں جیسے کہ جھوٹ ہمارے لیے جائز اور ایک اہم کارِ خیر ہے اور اس کا کوئی وبال ہم پر نہیں پڑے گا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے'' لیکن حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں'' کہ آج کل جھوٹ کے پاؤں نہیں، بل کہ پر ہوتے ہیں'' اوراب تو اپنی چاہتوں کو پورا کرنے اور علم سے راہِ فرار کے لیے ہم نے دھوکہ دہی جیسے سنگین گناہ سے بھی گریز نہیں کیا۔ جس کی شناعت وقباحت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شدید وعید کے ساتھ بیان کیا: ''من غش فلیس منا''۔ یعنی دھوکہ دینے والا ہماری جماعت سے نہیں۔ (مسلم شریف ج۱/ص)

چناں چہ بعض طلبہ نے اپنی غیر ضروری اور بلاوجہ رخصت حاصل کرنے کے لیے جعلی ونقلی دستخط کا سہارا لے کر اپنی دناءت (ہلکا پن) اور خساست کا اعلیٰ نمونہ بھی پیش کیا اور جنہیں سزا بھی دی گئی۔ میں بہت ہی معذرت کے ساتھ ایسے طلبہ کی خدمت میں عرض گذار اور ملتجی ہوں کہ اس طرح سے علم کی اور اپنی قیمتی زندگی کی ناقدری اور اپنے والدین کی آس کو ملیامیٹ کرنے سے اچھا اور بہتر یہ ہے کہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کر کے اس راہ کو اپنایئے جس میں آپ کی دل چسپی اور لگن ہو، تاکہ حیات مستعار کے ان گراں قدر لمحات کو جو زندگی کا سب سے اہم زمانہ ہے اُسے کام میں لاکر اپنے مستقبل کو روشن بنا سکے تاکہ یہ زندگی اپنے ساتھ اوروں کے بھی کام آسکے۔

یہ قدم قدم بلائیں سواد کو یہ جانا
وہ یہیں سے لوٹ جائے جنہیں زندگی ہو پیاری

تحصیلِ علم کی اہمیت اور ہماری غفلت

**ھائے افسوس!** تحصیلِ علم کے میدان میں ہم اپنے اسلاف اور اکابر کی ڈگر سے کوسوں نہیں، بل کہ لاکھوں میل دور جا چکے ہیں۔کہاں ان کا علمی انہماک،حصولِ علم کا شوق،اپنے آپ کو دین اور قوم کے لیے نافع بنانے کی فکرِ مسلسل۔اللہ اکبر!! جس کے لیے انہوں نے ہر قسم کی راحتوں اور لذّتوں کی قربانی دی بل کہ نکاح جیسی لذت بھری خواہش کو بھی قربان کر دیا اور لذّتِ علم اور لذّتِ آشنائی سے ایسے سرشار اور مخمور ہوئے کہ کسی اور لذّت ومزہ کا انہیں احساس بھی نہ ہوا۔شاعرِ مشرق علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں ؂

عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دل کو

اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں،جن کا تذکرہ مضمون کی طوالت کا باعث ہوگا۔چناں چہ شیخ عبدالفتاح ابوغدۃ نے اپنی مشہور کتاب "العلماء العذاب الذین آثروا العلم علی الزواج" ایسے ہی مردانِ باصفا اور عاشقینِ علم کے حالاتِ زندگی اور سوانح پر لکھی ہے۔اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب پختہ صاحبِ قلم اور فکرِ معتدل کے حامل مولانا ابن الحسن عباسی کی "متاعِ وقت اور کاروانِ علم" بھی ہے، جسے پڑھ کر اپنے مردہ احساس کو بیدار کرنا ہمارے لیے از حد ضروری ہے۔

بہ طورِ نمونہ کے دورِ حاضر کے ایک مایۂ ناز عالمِ ربانی،مربی لاثانی،شہرۂ آفاق محدث اور مرشدِ حقانی شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور حضرت علامہ محمد یونس صاحب جونپوری اطال اللہ بقاءہ علینا بالعافیۃ کا ذکرِ خیر اور تذکرۂ عبرت ؛ ہم سب کی تحریک وتحریض کے لیے پیش کرتے ہیں کہ جنہوں نے بڑی عسرت وتنگی اور غربت کے ساتھ جس کا تذکرہ میں نے خود جامعہ کے مہمان خانہ میں اپنے فراغت کے سال ۱۹۹۷ء میں اپنے کانوں سے سنا ہے۔طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: مجھے سہارن پور کے زمانہ میں ٹوپی اور چپل تک بھی میسر نہ ہوئے۔ایک ٹوپی جو کسی کوڑادان پر پڑی ملی تھی اسی کو اٹھالیا اور دھو کر چار سال تک پہنا تھا،اس تنگی کے باوجود طلبِ علم پر محنت اور جانفشانی،ایسا شوق اور علم کا ایسا چسکا؛ کہ درمیان میں رخصت لے کر گھر جانا تو دور کی بات ؛ کسی چھٹی میں بھی گھر نہیں گئے۔ان سے بڑوں نے اصرار بھی کیا کہ چھٹی میں گھر چلے جایا کرو۔لیکن علم کا شوق،بل کہ اس سے عشق ان کے اصرار پر غالب رہا۔

اس درمیان نہ جانے کتنے ہی خوشی وغمی کے واقعات پیش آئے ہوں گے،کتنی بار والدین،بہن بھائی اور دوست واحباب کی تڑپا دینے والی یادیں دل سے ٹکرا کر دل کو زخمی کی ہوں گی،لیکن ایک دُھن تھی،ایک شوق اور ایک ولولہ تھا جس نے ان تمام باتوں پر پردہ ڈال دیا اور وقت کا ایک عظیم محدث بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہ آباء تھے تمہارے ہی مگر تم کیا ہو ؟
کیوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو
وہ عشاق تھے جو گزر گئے وحدت فردا لے کر
جا ڈھونڈ انہیں تو چراغ رخ زیبا لے کر

یاد رہے وقت ہی ہماری زندگی کا انمول سرمایہ اور عظیم نعمت ہے۔ جسے صحیح اور خوب استعمال کر کے ہم اپنے آپ کو با قیمت، دین وملت کے لیے نافع اور ثمر آور بنا سکتے ہیں، اس کے بغیر دنیا ہماری قیمت کا احساس نہیں کر سکتی ہے۔ بل کہ بہ قول مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ: فٹ بال اِدھر سے اُدھر لاتیں کھاتا اور ذلیل ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اندر سے خالی ہے اِسی طرح اگر ہم اندر سے خالی رہ گئے اور کمالات علم وعمل سے اپنے کو وزنی نہیں بنایا تو پھر ادھر سے ادھر فٹ بال کی طرح مارے جاسکتے ہیں اللہ اس انجام بد سے ہماری حفاظت فرمائے۔

ابھی بھی وقت باقی ہے مافات کی تلافی ممکن ہے اس لیے عزیز طلبہ

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اور بہ قول شاعر عربی ؎

ضَیَّعتَ عُمْرَکَ یَا مَغْرُوْرُ فِیْ غَفَلٍ
قُمْ لِلتَّلَافِیْ فَأَنْتَ الْیَوْمَ فِیْ مَهَلٍ

اگر صبح کا بھٹکا ہوا شام کو واپس گھر آجائے تو اس کو بھٹکا ہوا نہیں کہتے۔ اس لیے ہم ابھی سے طے کر یں کہ پچھلی کسی بھی غفلت اور جرم کو نہیں دہرائیں گے، اپنی قیمت کے احساس کے ساتھ منزل مقصود کی طرف پوری محنت اور شوق کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ اللہ ہماری توبہ وندامت کو قبول فرمائے اور ہمیں علم کا شوق اور اس راہ پر استقامت عطا فرمائے۔

اور ہمارے آغاز سال کو مبارک ومسعود فرما کر عافیت کے ساتھ اختتام پذیر بھی فرمائے۔

# تحصیل علوم میں کامیابی کے چار اصول

نگارش:ابوعالیہ نازقاسمی،مدھوبنی ۔استاذجامعہ اکل کوا

**طلبۂ عزیز** ! آپ کا جامعہ کی چاردیواری میں تشریف لانا مبارک ہو۔اس لیے کہ آپ علم دین حاصل کرنے کے واسطے اپنے وطن سے دور،سفر کی پریشانیوں کو جھیل کر، ماں باپ، بھائی بہنوں، دیگر رشتہ داروں اور دوست واحباب کی محبتوں کو قربانی کی بھینٹ چڑھا کر یہاں آئے ہیں تو اب آپ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ حصول علم کے جو آداب ہیں،ان کو بھی معلوم کریں،ہرلحہ ذہن ودماغ کے پردے پر رکھیں اور دوسرے کسی بھی فضول کاموں سے اپنے کو بچائیں تاکہ کامیابی وکامرانی آپ کے قدم چومنے کو ہمہ وقت تیار رہے۔تو آیئے اب ہم آپ کو یہ بتاتے ہیں کہ قرآنی علوم کے حاصل کرنے یا تحصیل علم میں کامیابی کے کتنے اور کیا کیا اصول ہیں:

**(۱) محنت:** دنیا جانتی ہے کہ اِس کے بغیر کوئی دنیا کی معمولی اور ختم ہونے والی چیز بھی حاصل نہیں کرسکتا۔قرآن کی تعلیم تو وہ دولت اور نعمت ہے جس کو فنا نصیب ہی نہیں، دنیا اور قبر میں یہی کام آنے والی دولت ہے۔دنیا میں روٹی کا ایک نوالہ بغیر محنت کے انسان کے منھ میں نہیں پہنچتا۔اگر آپ یہ کہیں کہ ہم طالب علم تو بغیر محنت کیے لنگر کے لنگر کھا جاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے ہیں،تو یاد رکھیے کہ یہ قرآن کی اور مدرسہ کی برکت ہے۔قرآنی طالب علم ہونے کی برکت ہے،قرآن سے واسطہ ہونے کی برکت ہے،اگر دینی مدارس کے طلبۂ قرآنی علم حاصل کرنے سے ذرا ہٹ کر باہر کی دنیا میں جھانک لیں تو معلوم ہوجائے گا کہ ایک لقمہ روٹی کے لیے دنیا کتنا پاپڑ بیلتی ہے،کیا کیا حربے اختیار کرتی ہے،کتنی محنت کرتی اور ترستی ہے۔یہ ریڑھی بان، پان کی دوکان، رکشہ کی تان، یہ تانگے کی چلان ،ہوائی جہاز کی اڑان ، ہوٹلوں میں قسم قسم کے پکوان ، میدانوں میں گلہ بان،سمندروں میں جہاز ران، دریاؤں میں باد بان ،قدم قدم پر ریستوران ، ڈاکٹرس، ماسٹرس اور دیگر ملازمان،کھیت کھلیان میں کسان اور مزدوری کرنے والے کی تھکان، ہرایک پریشان۔آخر کیوں؟ اُن کو دیکھو کہ صرف ایک نوالہ روٹی کے لیے کتنی محنت کررہے ہیں۔یہ مزدور بے چارہ بھی تو ایک انسان ہی ہے جو کہ مئی جون کی تپتی دھوپ میں گیارہ بارہ بجے تک مٹی گارے کا بوجھ سرپر لادکر دیوار پر کھڑا ہوتا ہے۔ایسا کیوں؟ صرف روٹی حاصل کرنے کے لیے۔ہم اساتذہ اور طلبۂ تو اپریل مئی میں ہوتے ہیں،شور مچانے لگتے ہیں"ھٰذا گرمیٌ شدیدیٌ"کہ بڑی گرمی ہے،جب کہ کمروں میں سارادن بیٹھے ہوتے ہیں،مفت کی بجلی،مفت کے پنکھے"مالِ

مفت دلِ بے رحم" کے حساب سے چل رہے ہوتے ہیں۔ کیوں یہ قرآن کی برکت نہیں؟ طالب علمی کی برکت نہیں؟ مدرسہ کی برکت نہیں تو پھر اور کیا ہے؟ جب روٹی کا ایک لقمہ بغیر محنت کے حاصل نہیں کیا جاسکتا تو آپ ہی انصاف سے بتاؤ کہ قرآن وحدیث کا نور، قرآن کی برکت، قرآن کا فیض اور اس کا علم بغیر محنت کے کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

ایں خیال است ومحال است وجنوں

**(۲) پابندیٔ اسباق:** اوقات کی پابندی، اسباق میں حاضری کی پابندی، مطالعہ وتکرار کی پابندی، سبق کی دُہرائی اور مدرسہ کے ہر قانون اور ضابطے کی پابندی نہ ہوتی تو مدارس کے اِن تکلفات کی کیا ضرورت تھی؟ اگر پابندیٔ اوقات کے انوارات وبرکات نہ ہوتے تو رحمتِ دوعالم، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی محبوب امت کو نمازِ باجماعت کی پابندی کی ہرگز تاکید نہ فرماتے، اللہ تبارک وتعالیٰ ایک رمضان کے مہینہ کا روزہ پورے عالم اسلام کے مسلمانوں پر فرض قرار نہ دیتے، جمعہ اور اعیاد کا حکم نہ دیتے۔ ہمارے اکابرینؒ لکھتے ہیں کہ "اگر سبق ایک دن کا بھی ناغہ ہوجائے تو اُس کی بے برکتی کا اثر چالیس دن تک رہتا ہے"۔

**(۳) ادب:** "بے ادب محروم گشت از فضلِ رب" اور اردو زبان میں کہتے ہیں ؎

ادب ہی سے انسان، انسان ہے ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے

بے ادب انسان اللہ تعالیٰ کے فضل، اس کے کرم اور مہربانی سے محروم رہتا ہے۔ قرآنی علوم سے زیادہ فضل اور کرم دنیا بھر میں صبحِ قیامت تک اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ کتاب کا ادب، درس گاہ کا ادب، تپائی کا ادب، استاذوں کا ادب، سبق کا ادب، اربابِ مدارس؛ بل کہ مدرسہ کے ایک ایک ذرے کا ادب، حصول علومِ قرآن کے لیے بالکل ضروری ہے۔ مدرسے کا ہر استاذ واجب التعظیم اور لائق صد احترام ہے، اس کا ادب لازم ہے، جن کے پاس آپ کے اسباق ہوں یا نہ ہوں۔ ایک بات ہمیشہ یاد رکھو! آپ کے ادب کرنے سے استاذ کی عزت وحیثیت بڑھتی نہیں یا ادب نہیں کرنے سے گھٹ نہیں جاتی ہے، بل کہ ادب کرنے والے کو اپنی لالچ ہونی چاہیے، اس کا اپنا ذاتی فائدہ ہے، ادب کرنے سے انسان میں انسانیت پیدا ہوتی ہے، دل میں نورانیت آتی ہے، انسان بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ (و: ۸۰ھ۔م: شوال ۱۵۰ھ بروز جمعہ) کو کون نہیں جانتا؟ اُن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنا بلند مقام، اتنا اونچا درجہ اور اتنے علوم کا سمندر جو عطا فرمایا تو بنیاد اُس کی ادب ہی پر قائم تھی۔ امام صاحبؒ کے ادب کا حال یہ تھا کہ زندگی بھر استاذ کے مکان کی طرف پاؤں پھیلا کر بھی نہیں سوئے اور ہم تو دھکے مار کر بھی گذر جاتے ہیں اور افسوس بھی نہیں ہوتا۔

اس لیے ہر طالب علم کسی نہ کسی استاذ کے عمومی مجالس میں بیٹھنا ضروری سمجھے ۔اکثر طلبہ کو یہ دیکھا گیا ہے کہ اساتذہ کی عمومی مجلس کو تو چھوڑ یئے ؛ درس گاہ میں بھی بیٹھے ہوئے استاذ کی موجودگی میں بھی اپنی الگ مجلسیں شروع کر دیتے ہیں، استاذ سبق کی تقریر الگ کر رہا ہے اور یہ جناب اپنی الگ تقریر کر رہے ہیں، کھُسر پھُسر کرنے لگ جاتے ہیں، جو سراسر ادب کے خلاف ہے، مجلس کو سمجھنے کی پوری کوشش کریں، اگر کسی وجہ سے نہ بھی سمجھ سکیں تو حصولِ برکت کی نیت سے خاموش اور ادب سے بیٹھے رہا کریں، تجربہ شاہد ہے اور آپ بھی اپنا تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ اِس میں کتنا بڑا فائدہ ہے۔

(۴) **خدمت**: مدرسہ کی خدمت، اساتذۂ کرام اور طالب علموں کی خدمت ہے۔ ہر طالب علم ایک دوسرے کا خادم ہو، یہ کوئی خدمت نہیں ہے کہ استاذ کوئی کام آپ کو بتادے تو آپ اپنے کسی ساتھی کو بتادیں کہ فلاں استاذ کا یہ کام کر دینا یا یہ بات مزاج شریف میں بسالیں کہ کہیں گے تو ہی کر دیں گے، ورنہ وہ آپ کو ہم آپ کو۔اصل خدمت تو یہ ہے کہ خود سے آگے بڑھ کر کام معلوم کر کے کیا جائے اور کہنے کے بھروسے اور انتظار میں نہ رہے، کیوں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے خدمت سے روک کر علم سے محروم کرنے کا۔اب موجودہ طلبہ میں خدمت استاذ کا جذبہ اور شوق کم سے کم ہوتا جا رہا ہے ۔ارے جناب یہ کیا؟ کہنے پر تو گلی سے گذرنے والا بھی کام کر دے گا یہ خدمت نہیں کہ استاذ کہہ دے کہ یہ کرلو، وہ کرلو، ایسا کرلو ، ویسا کر لو، ڈبل پیسا موٹا بھینسا کرلو؛ تو کر دیا۔خدمت سے انسان سب کچھ پاتا ہے ، دنیا بھی پاتا ہے اور آخرت بھی ،علم بھی پاتا ہے، دولت اور عمر بھی۔ ؎

ہر کہ خدمت کرد اُو مخدوم شد
ہر کہ خود را دید اُو محروم شد

ہر کوئی جو خدمت کرے گا، جس میں خدمت کا جذبہ ہوگا، تڑپ اور لگن ہوگی، وہ ایک نہ ایک دن ضرور مخدوم بنے گا یعنی اُس کی خدمت کی جائے گی ،لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھانے میں فخر محسوس کریں گے۔اور جو کوئی خدمت میں سُستی اور کاہلی کا راستہ اختیار کرے گا ،صرف اپنے ہی کو دیکھے گا، ہر وقت اور ہر جگہ، ہر کسی کے سامنے بس پدرم سلطان بود کا نعرہ لگائے گا، بڑے ہونے کا خیال کرے گا، ہم چنیں دیگرے نیست کا ڈنکا بجائے گا، صاحب زادہ اور استاذ زادہ ہونے کا راگ الاپے گا، تو خدانخواستہ دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کے ساتھ ساتھ قرآنی وحدیثی علوم کے فیوضات و برکات سے بھی محروم ہوگا ۔ اللہ ہم سب کو اِن تحریروں پر عمل کی توفیق بخشے آمین!

(بشکریہ ماہنامہ ''**القاسم**'' خالق آباد، نوشہرہ، پاکستان۔ترمیم واضافے کے ساتھ)

# رئیس جامعہ کا پیغام



الحمدللہ! مجھے بے حد خوشی و مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ، میں جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا نندر بار مہاراشٹر جیسی عظیم الشان دینی درس گاہ کی ۳۸ رواں سالانہ رپورٹ پیش کر رہا ہوں۔ اس دینی و تربیتی دانش گاہ کی بنیاد ۱۹۸۰ء میں ایک ننھے منے پودے کی شکل میں ڈالی گئی، جو آج تناور درخت کی شکل میں برگ و بار لا رہا ہے۔

اس درس گاہ نے تعلیم کے مختلف النوع میدانوں میں حیرت انگیز رول ادا کیا ہے۔ طبی امداد، طبی تعلیم، صحتِ عامہ کی حفاظت اور سماجی ریلیف سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، اس طرح ہم صرف ۳۸ رسال کی مختصر مدت میں اپنے مقصد کو پا لینے میں کامیاب دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ وہی ادارہ ہے جس کی گود میں ابتدائے قیام میں صرف ۶ رطلبہ داخلِ تربیت تھے اور آج 165899 طلبہ پورے اطمینان وسکون سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 13238 طلبہ (دینی شعبہ جات میں 9441 اور عصری شعبہ جات میں 3797) تو صرف جامعہ کے احاطہ میں موجود ہیں۔ اور 125425 طلبہ جامعہ کے 2596 مکاتب میں زیرِ تعلیم ہیں۔ جامعہ کے ماتحت چلنے والی 196 اقامتی درس گاہیں ہیں، جن میں 26496 طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے بھی جامعہ کا نام اور جامعہ کی شہرت ضرور سنی ہوگی۔ ظاہر سی بات ہے کہ کسی بھی ادارے کی ترقیات میں سب سے زیادہ دخل معاشی پختگی اور اقتصادی استحکام کا ہوتا ہے، اس میں ہمارے معاونین و مخلصین ہی کا زیادہ ہاتھ ہے، جنہوں نے دامے درمے، قدمے سخنے اس ادارے کو اتنی عظیم الشان ترقی سے ہم کنار کیا۔ ہم مالیاتی فنڈ کی فراہمی کے بعد ان کے استعمال کے صحیح مصارف کی ایک خاص فکر رکھتے ہیں، جس کی مال فراہم کرنے والوں کو خاص فکر رہتی ہے۔ ہماری مثبت ترقیاتی سرگرمیوں کی رپورٹ انشاءاللہ یہاں درج کی جائے گی۔ ہم نے عصری تعلیم کے میدان میں ایم بی بی ایس کالج کو بدنا پور میں شروع کر دیا ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ قوم کے بچے پوری امانت و دیانت کے ساتھ اپنے متعینہ مقاصد میں مثبت ترقی کی شاہ راہِ عمل پر گام زن رہیں۔

جامعہ پوری دیانت داری کے ساتھ ان کی متعلّقہ ضرور یات کی سنجیدگی کے ساتھ کفالت کرنے میں، سرکاری و غیر سرکاری شہرت بھی حاصل کر چکا ہے، جو بالخصوص تعلیم و طبی میدان میں اور سماجی خدمات کے پہلو سے مسلسل جاری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے عزمِ مصمم کا اسپ تازی ہمیشہ تازہ دم رہے اور قوم و ملت کی خدمت کا جذبۂ وافر دمِ واپسیں تک موجود رہے۔

(مولانا) غلام محمد وستانوی

رئیس جامعہ کا پیغام

# جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا تاسیس، خدمات اور منصوبے

''جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، نندربار، مہاراشٹر'' کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب حضرت مولانا غلام محمد وستانوی زید مجدہٗ ۱۹۸۰ء میں ایک مقدس تبلیغی سفر کے ارادے سے، ست پڑا کے علاقے میں آباد مسلم بستی کا علمی و عملی جائزہ لینے کے لیے آئے، تو یہاں کی بدعات و رسومات اور جہالت و کم علمی کی تہہ بہ تہہ تاریکیوں کو چھانٹے کے لیے ایک مدرسہ کے قیام کا قطعی فیصلہ کر ہی لیا۔

کہاں ست پڑا علاقے کی سنگلاخ اور پتھریلی زمین اور کہاں دلوں کو موم بنانے کے لیے مجنونانہ اور مجاہدانہ عزم؟ لیکن مولانا نے سوچ لیا کہ اب تو بارِ غم اٹھالیا، جو ہو سو ہو۔ اور ایک نئے طرز و اسلوب سے خدا کے بندوں کو خدا کے دین کی رسی مضبوطی سے تھامنے کی پیہم دعوت دینا ہے۔

بہ قول شاعر:

نہ پیروئ قیس نہ فرہاد کریں گے　　ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

**الغرض** !۱۹۸۰ء میں اکل کوا کی سرزمین پر جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم کا قیام عمل میں آ گیا۔ عزم تھا کہ دیہی اور پس ماندہ علاقوں کے مسلمان بچوں کی ابتدائی بنیادی تعلیم دے کر ان کا اسلامی عقیدہ پختہ کر دیا جائے، تاکہ وہ خود اپنے ہی علاقے میں واپس جا کر اپنے ہی پڑوسیوں اور رشتہ داروں کے نونہالوں کو دین کی کلیدی تعلیم سے آراستہ کریں۔ نورانی قاعدہ، قرآن کی صحت و تجوید کے ساتھ تلاوت، ایمانی کلمے، مختصر مگر جامع احادیث، بنیادی نماز روزے سے متعلق مسائل اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے آگاہ کر کے، انہیں اپنے وطن واپس لوٹانے میں جامعہ کامیاب رہا۔ ابھی جامعہ کی کل عمر ۳۷ سال سے قدرے متجاوز ہوگی، اس دوران جامعہ کی حیرت انگیز کامیابی صرف خداوند قدوس کی غیبی مدد اور معاونین و مخلصین کی غیبی توجہ کا نتیجہ ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

# جامعہ کے عزائم، مقاصد، اہداف، سرگرمیاں

رئیس جامعہ کا پیغام

## عزائم (Vision):

دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام قائم کرنا اور اسلامی ماحول اور اسلامی تربیت مہیا کرنا جس سے طلبہ میں اخلاقِ حسنہ کا فروغ ہو اور عملی زندگی میں اسے جگہ ملے۔

## مقاصد (Mission):

جامعہ ایک ایسا مثالی، عالمی ادارہ ہو، جو خالص اسلامی طرز پر اسلامی علوم، قرآن، حدیث، فقہ اسلامی اور اصول فقہ اسلامی وغیرہ کی ترقی، اسلامی اور سماجی ترقی، اسلامی نظریاتی بنیادوں اور صحیح عقائد کے ساتھ قیادت کرے، جس سے انسانی خدمت اور سماجی ترقی اور عصری کالجز اور اسکولوں کے ذریعہ صحیح انسانی معاشرہ کی تشکیل اسلامی بنیادوں پر بالکل ابتدا سے اس طور پر کرے کہ جس سے مسلم امت، عالم گیر امت بن سکے۔

## اغراض واہداف (Aims and Objectives):

(۱) مسلم نوجوانوں کی اس طرح رہ نمائی کرنا کہ، وہ علمی اور عملی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بالکل عمل پیرا ہوں اور ان نوجوانوں کو ایک ایسا (Platform) میدان عمل مہیا کرنا کہ، جس میں صحیح طور پر اپنا تشخص باقی رکھ سکیں۔ (۲) مسلمان نوجوانوں کو اس طور پر تعلیمی اعتبار سے مسلح کرنا کہ، وہ مکمل طور پر ترقی کر سکیں اور عصر حاضر کی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔ (۳) ان نوجوانوں کو ایسا ماحول فراہم کرنا کہ، جس میں وہ سماج اور ملک کی تعمیر و ترقی میں مثبت کردار ادا کر سکیں۔ (۴) ایسے بامعانی تبادلہ خیال اور تعلقات دوسرے مسلم اداروں اور تنظیموں کے ساتھ قائم کرنا، جس کی مدد سے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے میں سہولت بہم پہنچے۔ (۵) قرآن وحدیث کو عام کرنے کے لیے ضروری اور اہم اقدامات کرنا کہ، جس سے سماج میں نیکی کو عام اور منکرات کو روکا جا سکے۔ (۶) انسانی تعمیر و ترقی کے اسلامی پیرائے میں بامعانی کوشش کرنا کہ، جس سے نوجوانوں کا دماغ عالم گیر اور وسیع اور ان کی سوچ ضرورت اور حالات کے مطابق ہو کہ، جس سے دنیا کی تعمیرِ نو ہو سکے۔ (۷) صحت اور حفظانِ صحت کے لیے مختلف قسم کے کیمپ کا انعقاد اور اس کے لیے رقوم مہیا کرنا اور انگریزی دواؤں کے ساتھ ساتھ دوسری متبادل دواؤں کا انتظام بھی کرنا؛ تاکہ نئی پیش آنے والی بیماریوں کا علاج کیا جا سکے۔ (۸) دوسری رجسٹرڈ تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنا، تاکہ اپنے ان اہم مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔

# تعلیمی سرگرمیاں (Educational Activities)

## شعبۂ دینیات:

دینیات کورس میں طلبہ اردو اور عربی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلام کے بنیادی عقائد، ناظرہ قرآن اور انگریزی زبان، حساب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے جو ۳ رسال پر مشتمل ہے۔

| | |
|---|---|
| طلبہ | 4068 |
| اساتذہ | 77 |
| ناظرہ مکمل کرنے والے | 14002 |

نوٹ: داخلہ ۷ رشوال سے شروع ہوتا ہے۔

## شعبۂ تحفیظ القرآن:

قرآن کریم مکمل حفظ کے ساتھ ساتھ اردو اور اسلام کی بنیادی تعلیمات، خاص طور پر تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| طلبہ | 3232 |
| اساتذہ | 121 |
| فارغین | 7974 |

اس شعبہ کی ابتدا 1980 میں ہوئی۔ نوٹ: داخلہ ۷ رشوال سے شروع ہوتا ہے۔

## شعبۂ عالمیت:

اس شعبہ میں طلبہ کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے قواعد اور اس کی عملی مشق اور دیگر علوم اسلامیہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر، آپٹیکل، عینک سازی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کورس ۹ رسال پر مشتمل ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور جامعہ ہمدرد دہلی نے اس کورس (فضیلت) کو اسلامک اسٹڈیز میں M.A کے مساوی قرار دیا ہے۔

| | |
|---|---|
| طلبہ | 2109 |
| اساتذہ | 81 |
| فارغین | 4002 |

اس شعبہ کی ابتداء 1980 میں ہوئی۔ نوٹ: داخلہ ۷ رشوال سے شروع ہوتا ہے۔

## شعبۂ تجوید وقرأت:

تجوید کی تعلیم جامعہ کے تینوں دینی شعبوں کے طلبہ کو دی جاتی ہے، جس میں ترتیل اور خطبات جمعہ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

رئیس جامعہ کا پیغام

| طلبہ | جمیع طلبہ جامعہ |
|---|---|
| اساتذہ | 22 |
| فارغین | 2597 |

شعبۂ افتاء:

| طلبہ | 10 |
|---|---|
| اساتذہ | 04 |
| فارغین | 103 |

شعبۂ دعوہ (انگریزی):

| طلبہ | 13 |
|---|---|
| اساتذہ | 03 |
| فارغین | 40 |

شعبۂ عربی ادب:

| طلبہ | 09 |
|---|---|
| اساتذہ | 03 |
| فارغین | 32 |

**نوٹ:** تخصصات کے فی الحال تین شعبے ہیں۔ شعبۂ افتا، جس میں افتا کی عملی مشق جامعہ سے فارغ شدہ باصلاحیت طلبہ کو منتخب کر کے داخلہ دیا جاتا ہے؛ اسی طرح شعبۂ دعوہ (انگریزی) میں دعوت کورس پڑھایا جاتا ہے اور شعبۂ عربی ادب میں عربی زبان وادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔

## رہائشی مراکز (برائے طلبہ)

جامعہ کے زیرِ نگرانی تعلیمی مراکز ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مصروف عمل ہیں، جس میں دینی وعصری تعلیم کا معقول انتظام ہے۔

| مراکز | 69 |
|---|---|
| اسکول | 50 |

| | |
|---|---|
| اساتذہ وملازمین (اسکولز) | 573 |
| طلبہ | 17938 |
| اساتذہ وملازمین (مراکز) | 852+604=1456 |
| فارغین (عالمیت) | 392 |
| فارغین (حفاظ) | 10676 |
| فارغین (دینیات کورس) | 37698 |

## رہائشی مراکز (برائے طالبات)

لڑکیوں کے لیے تین سالہ مومنہ کورس کے ساتھ سلائی اور ایمبر وڈری وغیرہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت کا طریقہ بھی سکھایا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| مراکز | 27 |
| طالبات | 8558 |
| اساتذہ وملازمین | 298+171=469 |
| فارغین (مومنہ کورس) | 11442 |

## مکاتب

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بڑے پیمانے پر مکاتب یعنی امت کے معصوم نونہالوں کو دین وعقیدہ اور اخلاق کی بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ مکاتب کا مقصد مسلمانوں میں دینی شعور بیدار رکھنا ہے۔

| | |
|---|---|
| مکاتب | 2596 |
| طلبہ | 125425 |
| اساتذہ | 2625 |
| فارغین | 184739 |

# لائبریری

رئیس جامعہ کا پیغام

کتب خانہ کی حیثیت خواہ مدارس ہوں یا کالجز؛ ہر ایک کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ تعلیمی لیاقت اور صلاحیت کو نکھارنے اور بنانے کے لیے، کتب خانہ غذا کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں کتب خانہ جتنا معیاری ہوگا وہاں طلبہ اور اساتذہ کے معیار میں اتنی ہی عمدگی اور نکھار آئے گا، انہیں تمام وجوہات کی بنا پر جامعہ نے کتب خانہ کا بڑا ہی وسیع نظام قائم کر رکھا ہے، جس میں اکثر فنون کی ضروری کتابوں کے ساتھ نادر اور اہم کتابوں کو جمع کیا گیا ہے، تاکہ کسی بھی موضوع پر کثیر عمدہ اور صحیح مواد مل سکے۔ فی الحال جامعہ کے کتب خانہ میں ۱۷۵۰۰ر سے زائد کتابیں موجود ہیں۔

# عصری شعبہ جات

## اخلاق سازی میں ماحول کا کردار:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا قول ہے: "**إنما الأخلاق بالأحوال لا بالتعلم**" یعنی اخلاق کی درستگی کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے نہ کہ تعلیم پر۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کو برے ماحول میں تعلیم کے ذریعے درست کرلیں گے تو وہ غلطی پر ہے، آپ کے اہلِ خانہ، بچے، تابع افراد سارے ماحول سے اخلاق سیکھتے ہیں، تعلیم خواہ کتنی بھی اچھی ہو بچہ جس ماحول میں پروان چڑھے گا، اسی کا اثر قبول کرے گا اور ویسا ہی ہوگا؛ غرضیکہ جس قدر ماحول ٹھیک ہوگا اسی قدر آپ کی اولاد بھی درست ہوگی، یہ فطری بات ہے۔ اسی اصول کے پیش نظر جامعہ نے اپنے احاطہ میں عصری تعلیم دینی ماحول میں دینے کا عزم کیا اور مختلف کالجز قائم کئے۔

## انڈسٹریل ٹریننگ سینٹر جامعہ و برانچ (آئی ٹی آئی):

| | | | |
|---|---|---|---|
| کورسیز | 07 | اساتذہ | 19+6=25 |
| طلبہ | 352 | فارغین | 2699 |

نوٹ: داخلہ صوبہ مہاراشٹر کے SSC امتحان کے بعد شروع ہوتا ہے۔

## جامعہ نے اس کے علاوہ ۵/مقامات پر اور ITI قائم کیے ہیں:

(۱)مولانا ابوالکلام آزاد،آئی ٹی آئی،احمدنگر مہاراشٹر۔

(۲)وسئی والا آئی ٹی آئی، بھاؤنگر گجرات۔

(۳)حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندویؒ آئی ٹی آئی،منجلے گاؤں،بیڑ۔

(۴)ڈاکٹر ذاکر حسین آئی ٹی آئی،انوا،مہاراشٹر۔ (۵)الفلاح آئی ٹی آئی مالیگاؤں

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 341 | اساتذہ | 27-7=34 | فارغین | 1575 |

## جامعہ پالی ٹیکنک کالج اکل کوا:

| | |
|---|---|
| طلبہ | 676 |
| اساتذہ | 64+34=98 |
| فارغین | 2028 |

نوٹ: SSC کے نتائج کے بعد داخلے شروع ہوتے ہیں۔تین سالہ کورس ہے۔

## جامعہ انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ:

| | |
|---|---|
| طلبہ | 517 |
| اساتذہ | 62+62=124 |
| فارغین | 201 |

نوٹ: HSC کے نتائج کے بعد داخلے شروع ہوتے ہیں۔چار سالہ کورس ہے۔

## (اے۔جی)احمد غریب والفضلانی یونانی میڈیکل کالج اکل کوا:

| | |
|---|---|
| طلبہ | 233 |
| اساتذہ | 36+36=72 |
| فارغین | 584 |

نوٹ:(۱)داخلہ صوبۂ مہاراشٹر کے HSC نتائج کے بعد شروع ہوتا ہے۔(۲)علاوہ ازیں جامعہ نے الفضلانی یونانی میڈیکل کالج،کنج کھیڑا،اورنگ آباد میں شروع کیا ہے۔

رئیس جامعہ کا پیغام

## ایم، بی، بی، ایس کالج بدناپور:

طلبہ 399 اساتذہ وملازمین 807 (اسپتال کے ساتھ)

فارغین پہلی جماعت انشاءاللہ ۲۰۱۷ء میں ہوگی۔

الحمدللہ! سال ۲۰۱۳ء میں جامعہ کی دیرینہ خواہش اور انتھک کوششوں کا ثمرۂ شیریں میڈیکل کالج کی صورت میں بارآور ہوا۔ جہاں جامعہ نے امت کے نوجوانوں کو دین کی سلامتی کے ساتھ دنیا میں سرخ روئی اور امت کی ضرورت کے لیے دیگر کالجز کا آغاز کیا، وہیں اس کی تمنا تھی کہ وہ امت کو انسانی درد رکھنے والا، خدا کو پہچاننے والا، اس کی پکڑ کا خوف رکھنے والا ڈاکٹر عطا کرے۔ باری تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسے بھی پورا فرمایا، اور میڈیکل کونسل آف انڈیا نئی دہلی کی طرف سے ایم بی بی ایس کالج کی منظوری بھی مل گئی۔

## ڈپلوما فارمیسی کالج:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 169 | اساتذہ | 10+6=16 | فارغین | 665 |

## ڈگری فارمیسی کالج:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 227 | اساتذہ | 11+20=31 | فارغین | 269 |

## ماسٹر فارمیسی کالج:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 19 | اساتذہ | 3+8=11 | فارغین | 40 |

نوٹ: داخلے صوبۂ مہاراشٹر کے HSC نتائج کے بعد شروع ہوتے ہیں۔

## بی ایچ ڈی:

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 03 | اساتذہ | 01 | فارغین | 01 |

## ڈی ایڈ اینڈ بی ایڈ کالج (مراٹھی):

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 52+61 | اساتذہ | 16+16 | فارغین | 808+1052 |

نوٹ: داخلے صوبۂ مہاراشٹر کے HSC نتائج کے بعد شروع ہوتے ہیں۔

## پرائمری اردو اسکول (1-4):

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 229 | اساتذہ | 6+1=7 | فارغین | 730 |

## ہائی اسکول اینڈ جونیر کالج (5-12):

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 759 | اساتذہ | 26+8=34 | فارغین | 701+1556=2257 |

نوٹ: جونیر کالج کے داخلے صوبۂ مہاراشٹر کے SSC نتائج کے بعد شروع ہوتے ہیں۔

## علی الانہ انگلش میڈیم پرائمری و ہائی اسکول (1-10):

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| طلبہ | 500 | اساتذہ | 29 | فارغین | 96 |

**نوٹ:** جونیر کالج کے داخلے صوبۂ مہاراشٹر کے SSC نتائج کے بعد شروع ہوتے ہیں۔

☆ مذکورہ شعبوں میں داخلے اور ضروری کاغذات کے متعلق، متعلقہ شعبوں کے ذمے داران سے رابطہ قائم کریں۔

نوٹ: 02567-252256- اس نمبر پر رابطہ کرکے جس کالج کے بارے میں معلومات مطلوب ہو اس کا نام بتائیں، چند سیکنڈ میں متعلقہ شعبہ کے ذمے دار سے بات ہوجائے گی۔

## جامعہ کالجوں میں داخلے کی شرائط

| | |
|---|---|
| (۱) | پرائمری اور ساتویں جماعت تک صرف مقامی طلبہ کا داخلہ ہوتا ہے، البتہ آٹھویں سے دسویں تک اردو و انگلش میڈیم ہاسٹل میں بیرونی طلبا کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ |
| (۲) | گیارہویں سائنس: مضمون "سائنس" کم از کم ۴۰ نمبرات سے کامیابی۔ انگریزی بہ حیثیت مضمون لازم ہے۔ |
| (۳) | آئی ٹی آئی پلمبر: میں آٹھویں اور Draftsman Civil, Copa, RAC, Fitter, Electritian, Motor Mechanic میں دسویں میں کامیاب ہونا ضروری ہے۔ |

رئیس جامعہ کا پیغام

| | |
|---|---|
| (۴) | بی یو ایم ایس: بارہویں میں Chemestry Physics اور Biology میں ۵۰ رفیصد نمبرات سے کامیاب ہونا لازم ہے، ساتھ ہی ساتھ دسویں یا بارہویں میں اردو بہ حیثیت مضمون ضروری ہے، جس سال داخلہ لینا ہے اس سال یکم اکتوبر کو طالب علم کی عمر ۱۷ رسال ہونا ضروری ہے۔ اور CET میں شرکت لازمی ہے۔ |
| (۵) | پالی ٹیکنک: دسویں کامیاب ہونا لازمی ہے۔ |
| (۶) | ڈی فارمیسی: بارہویں میں سائنس سے کامیاب ہونا ضروری ہے۔ |
| (۷) | بی فارمیسی: P.C.C / P.C.B مضمون میں ۴۵ رفیصد نمبرات اور CET کے امتحان میں شرکت ہو تو بہتر ہے۔ |
| (۸) | ایم فارمیسی: CET / GPAT کے امتحان میں کامیابی لازمی ہے۔ |
| (۹) | بی ایڈ: گریجویشن میں ۵۰ رفیصد نمبرات اور CET کے امتحان میں شریک ہونا ضروری ہے۔ رواں سال سے یہ کورس دو سال کا ہو گیا ہے۔ |
| (۱۰) | ڈی ایڈ مراٹھی: بارہویں جماعت میں ۵۰ رفیصد نمبرات سے کامیاب ہونا ضروری ہے۔ |
| (۱۱) | بی ای: P.C.M میں ۴۵ رفیصد نمبرات اور CET کے امتحان میں شریک ہونا بہتر ہے۔ |
| (۱۲) | بی ایچ ڈی فارمیسی: ایم فارمیسی میں کامیابی کے بعد داخلہ ہوگا۔ |

## رابطے کے لیے

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| بی یو ایم ایس | 02567-252020 | مراٹھی بی ایڈ/ ڈی ایڈ | 02567-252899 | اردو پرائمری اسکول | 02567-252256 |
| آئی ٹی آئی | 02567-252326 | علی الانہ ڈی بی ایم فارمیسی | 02567-252815 | بی ای انجینئرنگ | 02567-252524 |
| مولانا ابوالکلام آزاد ہائی اسکول | 02567-252610 | انگلش میڈیم اسکول | 02567-252610 | پالی ٹیکنک | 02567-252823 |

## جامعہ اکل کوا کے زیر نگرانی دیگر علاقوں میں چلنے والے کالجوں کے رابطہ نمبرات

| | |
|---|---|
| ایم بی بی ایس کالج، بدناپور، ضلع جالنہ، مہاراشٹر | 02482-222515 |
| بی ایڈ مراٹھی، کنج کھیڑا، تعلقہ کنڑ، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر | 02435-228043 , 9975696505 |
| ڈی ایڈ اردو کالج، کنج کھیڑا، تعلقہ کنڑ، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر | 02435-228048 , 9270531866 |
| ڈی ایڈ مراٹھی کالج، کنج کھیڑا، تعلقہ کنڑ، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر | 02435-228044 , 9764415552 |
| ڈی فارمیسی، کنج کھیڑا، تعلقہ کنڑ، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر | 02435-228011/ 228040 , |
| الفضلانی یونانی میڈیکل کالج، کنج کھیڑا، تعلقہ کنڑ، ضلع اورنگ آباد، مہاراشٹر | 9822775783 |
| وسئ والا آئی ٹی آئی کالج، اکواڑہ، ضلع بھاونگر، گجرات | 02435-228034, 07507834715 |
| مولانا ابوالکلام آزاد آئی ٹی آئی کالج، احمد نگر، مہاراشٹر | 09825606044, 09976556565 |
| قاری صدیق باندوی آئی ٹی آئی کالج، منجلے گاؤں، بیڑ، مہاراشٹر | 09422220640, 09209220966 |
| ڈاکٹر ذاکر حسین آئی ٹی آئی کالج، انوا، جالنہ، مہاراشٹر | 09423194153 |
| ڈی ایڈ اردو کالج، پپلہ | 09422667669, 09423194153 |
| | 09822219613, 09422240289 |

اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں ۴۰/ جونیئر وسینئر کالجز جامعہ کے ماتحت چلتے ہیں۔ فالحمدللہ علی ذالک!

## ہماری ویب سائٹس

www.jamiyaakkalkuwa.com, www.jamiapolytechnic.com,

www.jamiapharmacy.com, www.iimsrijalna.com, www.jiemsakk.com

## سماجی سرگرمیاں

### شعبۂ حفظانِ صحت:

ہمارا بنیادی مقصد حیات تحصیل علم ہے، لیکن صحت وتندرستی کے بغیر اس مقصد کی تحصیل ممکن نہیں۔ ہم نے حفظانِ صحت کے لیے مستقل ایک شعبہ بنام "میڈیکل ہیلتھ کیئر ڈپارٹمنٹ" تشکیل دیا ہے، جو قوم کے دبے کچلے خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے افراد کو خاص طور پر اپنا مطمح نظر بناتا ہے۔ عام پبلک اور طلبہ، طالبات کے لیے بھی ہماری طبی امداد مسلسل جاری ہے۔

علاقے کے اردگرد لوگوں کی آبادیوں میں صحت عامہ کی حفاظت کے لیے کوئی بندوبست نہ ہونے کی بنا پر ''موبائل کلینک'' کا نظام بنایا ہے جو وقتاً فوقتاً دیہات اور کھیڑوں میں طبی سہولیات لوگوں کے بیڈروم اور مکانوں تک پہنچاتا ہے۔

## السلام ہاسپیٹل:

جامعہ اکل کوا کے طلبہ واکل کوا تعلقہ کے عوام کے لیے ''السلام ہاسپٹل'' ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایکسرے، ای سی جی، لیبارٹری، نیبولائزر (Nabuliser) اور لمبر ٹریکشن (LUMBER TRACTION) جیسی بے شمار سہولیات سے بھرپور ''السلام ہاسپٹل'' قوم وملت کے پریشان حال افراد کی پریشانیوں کا محسوس مداوا ہے۔ جامعہ کا یہ ہاسپٹل تقریباً ۲۳/سال سے قوم وملت کے مریضوں کو امداد پہنچا رہا ہے، جس میں موجودہ تاریخ میں یومیہ OPD ۱۵۱/اور IPD ۴۹/مریض ہوتے ہیں۔ ایمرجنسی صورت حال میں ہاسپٹل کی ایمبولینس تیار رہتی ہے جو ریفرڈ ڈاکٹر یا ہاسپٹل تک مریضوں کو پہنچانے میں بہترین مدد دیتی ہے۔ اس کے علاوہ جامعہ کے ماتحت چلنے والے تقریباً ۲۷/ہاسپٹل ہیں۔

## میڈیکل کیمپ:

عوامی طبی فوائد کے پیش نظر جامعہ سال میں ۲-۳/بار ضرور میڈیکل کیمپ کے انعقاد کا مفید اہتمام کرتا ہے، جس کے لیے ماہر تجربہ کار ماہرین ڈاکٹروں کی ٹیم مختلف امراض کے لیے مدعو کی جاتی ہے، اسی لیے اکل کوا اور اطراف واکناف کے علاوہ دور افتادہ علاقے کے مریض بھی کیمپ سے استفادہ کرتے ہیں کیوں کہ کیمپ میں طبی سہولیات، دوائیں، متعدد قسم کے ٹیسٹ اور ڈاکٹر فیس ساری چیزیں مفت فراہم کی جاتی ہیں، جسے جامعہ اکل کوا برداشت کرتا ہے۔

## کچھ دیگر طبی منصوبے اور پروگرام:

جامعہ نے ''السلام ہاسپٹل''، ''موبائل کلینک'' اور ''طبی کیمپ'' کے علاوہ ملک کے مختلف حساس علاقوں میں طبی امداد بہم پہنچانے کی غرض سے عوام کی سہولیات اور فلاح وبہبود کی خاطر دیگر طبی پروگرام بھی شروع کیا ہے؛ چناں چہ جامعہ کے نگرانی میں آج کی تاریخ تک ۲۷/ہاسپٹل پوری آب وتاب کے ساتھ مفت علاج کی راہ پر چل رہے ہیں۔ اور علاج ودوائیں مفت دینے کے ساتھ دوسرے اسپتالوں میں ان کو ایڈمٹ کرا کے پوری امداد بہم پہنچائی جائے، اس کا بھی مکمل ومنظم نظام ہے۔

## النور چیریٹیبل ہاسپٹل بدناپور (ایم بی بی ایس کالج):

کالج کے ساتھ ساتھ ۵۷۰ر بیڈ کا النور ہاسپٹل بھی قائم کیا جو جدید آلاتِ معالجہ اور الگ الگ شعبے کے ماہرین، باصلاحیت اور تجربہ کار ڈاکٹرز کی ٹیم سے لیس ہے۔ یہ ہاسپٹل بدناپور ضلع اورنگ آباد میں واقع ہے۔ قرب وجوار سے بڑی تعداد میں مریضوں کا تانتا لگا رہتا ہے، اور علاج ومعالجے کے لیے دور دراز سے لوگ رخ کرتے ہیں؛ فی الحال روزانہ ۴۰ سے ۴۵ر آپریشن بھی ہوتے ہیں۔

ہاسپٹل 570 (بیڈ) ڈاکٹرس 212 اوپی ڈی 1150 (یومیہ)

آئی پی ڈی 100 (یومیہ) کے مریضوں کو ہاسپٹل کی طرف سے لیبارٹری، سونوگرافی، میڈیسن وغیرہ مفت میں دی جاتی ہیں۔

ایکسرے 130 (یومیہ) سونوگرافی 85 (یومیہ)

## النور ہاسپٹل کا سالانہ رپورٹ (۲۰۱۶ء):

اوپی ڈی (265624)، آئی پی ڈی (22344)، ایمرجنسی کیس (1428) ایکسرے (59844)، الٹرا سونوگرافی (8132)، اسپیشل پروسیجر جانچ (3726)۔

## لیبارٹری، خون پیشاب وغیرہ کا معائنہ:

بائیوکیمسٹری سے جانچ (21234)، مائیکرو بائیولوجی جانچ (11322)، کلینیکل پیٹھولوجی (112534)، ہیموٹولوجی جانچ (964426)، ہسٹولوجی (4106)، سیٹولوجی (5407)۔

**سرجری:** میجر سرجری (5352)، مائینر سرجری (8324)۔ اس میں غریبوں کے لیے تمام سہولتیں مفت؛ نیز علاج کے علاوہ دیگر ضرورتوں میں بھی تعاون کیا جاتا ہے۔

## بورویل:

جامعہ اکل کوا نے ملک اور صوبۂ مہاراشٹر کے مختلف حصوں میں بور ویل کا انتظام کیا ہے۔ اب تک 5711 بورویل سے مخلوقِ خدا فیض یاب ہو رہی ہے۔ جہاں پانی کی زیادہ قلت ہے، وہاں جامعہ نے بورویل کے اہتمام وانصرام میں توجہ زیادہ مبذول کی ہے۔ رواں سال میں جامعہ نے تقریباً 711 بورویل کیا ہے۔

رئیس جامعہ کا پیغام

## عبادت خانے:

جامعہ اکل کوا ایسے مکانات کی تعمیر میں بھی دل چسپی لیتا ہے جو بیک وقت دو کام انجام دینے کے لیے استعمال ہوسکیں، وقتِ عبادت اسے عبادت خانے کے طور پر استعمال کیا جائے اور پھر اسی میں بچوں کو تعلیم و تربیت بھی دی جاتی رہے۔ اب تک جامعہ اس طرح کے 6068 مکانات/عبادت خانے تعمیر کر چکا ہے۔ رواں سال میں جامعہ نے تقریباً 350 مساجد مکمل کئے۔

## جامعہ مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں تین نوعیت کی اجازت دیتا ہے:

(۱) نئی تعمیر۔ (۲) جاری تعمیر میں تعاون۔ (۳) تعمیر میں جزوی تعاون۔

مثلاً ڈبلیوسی بلاک، دروازے اور کھڑکیوں کی تعمیر، ٹین شیڈ، احاطہ کی چہار دیواری وغیرہ۔

امسال جامعہ کے اس منصوبے کے تحت یہ کامیابی رہی ہے کہ تقریباً 150 مساجد کو جزوی تعاون کیا ہے۔

## افطار وسحر کا اہتمام:

''جامعہ'' رمضان المبارک کے مہینے میں اس بات کا خصوصی اہتمام کرتا ہے کہ مختلف پس ماندہ علاقوں اور شہروں کے دبے کچلے، غریب نادار، ضرورت مند، کمزور وناتواں، بیکس، بدحال اور خستہ افراد واشخاص کو رمضان میں افطار وسحر کے لیے مالی تعاون فراہم کرے، تاکہ یہ لوگ رمضان کی برکتوں سے اور بہاروں سے پوری طرح فیض یاب ہوسکیں، کبھی کبھی بل کہ اکثر غلہ جات، کپڑے، میوے، کھجوریں اور دوسری ضروری اشیا، افطار وسحور کے لیے مہیا کرائی جاتی ہیں۔ تقریباً دس ہزار غریب خاندانوں کے درمیان یہ اشیا ہر سال تقسیم ہوتی ہیں۔

## عیدالاضحیٰ میں قربانی:

جامعہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر اس بات کا شدت سے اہتمام کرتا ہے کہ ایسی خوشی کی گھڑی؛ جس میں ۳/ یوم تک خالقِ ارض وسما کی طرف سے ضیافت کا عام اعلان ہے، مسلمانانِ شہر ودیہات اپنی خوشی کا بھرپور اظہار کر سکیں۔ جگہ جگہ ضرورت مندوں کی ضیافتِ رب سے مستفیض ہونے کی غرض سے قربانیوں کا اہتمام جامعہ کی دل چسپیوں میں شامل رہا ہے، تاکہ ہر غریب اور اس کے بچے قربانی کے گوشت سے اپنی خوشی دوبالا کرسکیں اور اسلامی تہوار سے کما حقہ محظوظ ہوسکیں۔

## اسکالرشپ:

جامعہ اکل کوا طلبہ کے پیشہ ورانہ کورسز کی تکمیل کے لیے اسکالرشپ اور وظیفے بھی مہیا کرتا ہے، تاکہ وہ اپنی ضروری فیس لازمی کتابیں اور وسائلِ تعلیم خرید کر تعلیم میں یکسوئی سے ترقی کر سکیں۔ ضروری کاغذات کی فراہمی اسکالرشپ کے اجرا کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے اور اسکالرشپ کے لیے طالب علم کی پیشہ ورانہ تعلیم کا فی الوقت جاری رہنا بھی ایک امرِ لازم ہے۔ جامعہ کے زیرِ نگرانی جو اسکول اور کالجز وغیرہ مصروف عمل ہیں اس میں بھی طلبہ کو فیس میں سہولیت دی جاتی ہے۔

## جزوی تعاون برائے اسکول وکالج:

جامعہ اکل کوا اپنی نگرانی میں چلنے والے اسکول وکالج کی ہمہ جہت دیکھ ریکھ اور نگرانی تو کرتا ہی ہے، لیکن دوسری طرف اسکول وکالج کے ضروری سامان کی فراہمی میں بھی مالی ونقدی تعاون کے لیے کمربستہ رہتا ہے، مثلاً کسی کالج میں سائنس لیبارٹری کی شدید ضرورت ہے، کالج کے لوگوں کی اپلیکیشن پر جامعہ ان کا جزوی تعاون کر کے ان کی ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

## تعلیمی شعبہ جات کی کارکردگی بہ یک نظر

| شعبہ جات | سن تاسیس | موجودہ تعداد | امسال فارغ ہونے والوں کی تعداد | فارغ شدہ ۲۰۱۶ء تک |
|---|---|---|---|---|
| شعبۂ دینیات | 1979 | 4068 | 1041 | 14002 |
| شعبۂ حفظ | 1983 | 3232 | 460 | 7974 |
| شعبۂ عالمیت | 1982 | 2109 | 304 | 4002 |
| شعبۂ افتا | 2008 | 010 | 010 | 103 |
| دعوہ انگلش کورس | 2012 | 13 | 07 | 040 |
| عربی ادب | 2015 | 09 | 09 | 032 |
| شعبۂ مکاتب | 1981 | 125425 | 16292 | 184739 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| جامعہ کی شاخیں (ناظرہ، حفظ، عالمیت) | 1982 | 26496 | 5812+664+31 (6507) | 49140+10676+392 (60208) |
| آئی ٹی آئی مع برانچ | 1993 | 352+341=693 | 168+205=365 | 3820 |
| احمد غریب یونانی میڈیکل کالج | 1996 | 233 | 035 | 584 |
| جامعہ پالی ٹیکنک کالج | 2001 | 676 | 321 | 2028 |
| علی الانہ ڈی فارمیسی کالج | 2003 | 169 | 086 | 665 |
| علی الانہ ڈگری فارمیسی کالج | 2006 | 227 | 046 | 269 |
| علی الانہ فارمیسی کالج (پی ایچ، ڈی) | 2011 | 003 | 0001 | 001 |
| ایم فارمیسی | 2011 | 019 | 008 | 040 |
| پرائمری اسکول (اردو میڈیم) | 1998 | 229 | 059 | 730 |
| ہائی اسکول اور جونیر کالج | 1997 | 759 | 76+138 | 701+1556 |
| بی ایڈ کالج | 2004 | 061 | 044 | 1052 |
| ڈی ایڈ کالج (مراٹھی) | 2003 | 052 | 029 | 808 |
| انجینئرنگ کالج | 2010 | 517 | 074 | 201 |
| پرائمری اسکول (انگلش میڈیم) | 2004 | 500 | 029 | 096 |
| ایم بی بی ایس | 2013 | 399 | 2017 میں پہلی جماعت فارغ ہوگی | 000 |
| **تعداد** | ☆ | 165,899 | 25,995 | 284,105 |

## شعبۂ صنعت وحرفت

ڈپلوما عربی کورس: این-سی-پی-یو-ایل نئی دہلی سے اجازت یافتہ ڈپلوما عربک کورس۔ جامعہ کے طلبہ اپنی عربی تعلیمی سرگرمیوں کو پوری طرح جاری رکھتے ہوئے اس کورس میں داخلہ لے کر ڈگری حاصل کرتے ہیں۔ این۔سی۔پی۔یو۔ایل نئی دہلی باقاعدہ ڈگری اور سند سے نوازتی ہے۔

## آفس آٹومیشن اینڈ ڈی ٹی پی کورس:

جامعہ کے طلبہ کے لیے کمپیوٹر کورس بھی شروع کیا گیا ہے، جس میں 180 طلبہ شامل ہیں۔

## ٹیلرنگ کورس:

جامعہ نے ٹیلرنگ کورس بھی جاری کر رکھا ہے، جس میں طلبہ سلائی، کٹنگ اور فنیشنگ وغیرہ کا کام اچھی طرح سیکھ لیتے ہیں۔ اس کورس سے طلبہ کو ذاتی معیشت پختہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ کورس جامعہ کے طلبہ کے لیے ہے جو فارغ ہو کر اپنے گھر پر بھی معمولی پیسہ خرچ کر کے دکان کھول سکتے ہیں، جو کسب معاش کے لیے آسان ذریعہ ہے۔

## جلد سازی کورس:

جامعہ کے جلد سازی کورس میں تمام ضروری آلات اور کٹنگ مشین وغیرہ مہیا کرادی گئی ہیں جن سے کورس میں داخل طلبہ بہ آسانی جامعہ کے کتب خانے کی کتابیں، آفس کی کتابیں، طلبہ کی لائبریری اور شعبۂ دارالافتا کی کتابیں جلد سازی کے کورس کے ذریعے قابلِ مطالعہ اور مضبوط بنا کر ٹرینڈ ہو جاتے ہیں۔

## آپٹیکل کورس:

چشمہ سازی کا کورس بنام ”جامعہ آپٹیکل کورس“ بھی جامعہ کی زیرنگرانی ترقی کی راہ پر کئی سال سے چل رہا ہے۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد طالب علم خودکفیل ہونے میں کسی کا محتاج نہیں رہتا۔

## مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی اسٹڈی سینٹر:

جامعہ کے طلبہ کو بیچلر ڈگری فراہم کرنے کے اہم ترین مقصد کے پیشِ نظر جامعہ نے ”ڈسٹینس لرنگ ایجوکیشن“ کا نظام بنایا۔ جامعہ کے طلبہ عالمیت وفضیلت اور حفظ قرآن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اس کورس سے بھی دل چسپی لے سکتے ہیں۔ ایک معتد بہ تعداد جامعہ کے طلبہ کی ایسی ہے جس نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد سے ”بی۔اے“ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بی اے کی ڈگری کی تحصیل کے بعد طالب علم بی ایڈ ماسٹر ڈگری کورس بھی کر سکتا ہے۔

## نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ (NIOS):

بڑی مسرت کی بات ہے کہ NIOS کی طرف سے طلبۂ جامعہ کو امتحانات میں شرکت کی منظوری مل چکی ہے، جس کے تحت شعبۂ عالمیت اور فضیلت کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد دسویں (SSC) کے امتحان دے رہے ہیں۔ آئندہ کے لیے، جامعہ ایسا نظام مرتب کررہا ہے کہ جس کے تحت ہر عالم ہونے والا طالب علم بارہویں پاس ہوگا۔ انشاءاللہ!

## مسابقاتی مہم

جامعہ اکل کوا تعلیم کے میدان میں آخری حد تک کامیابی کی منزل کا نشان پالینے کے مقصد سے مدارس وجامعات اور اسکول وکالجز کے درمیان مسابقاتی مہم بھی چلاتا ہے، جس سے طلبہ واساتذہ دونوں کو اپنی علمی وتدریسی حدود کو بہتر سے بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ ہم نے ابھی تک قرآن، حدیث، تفسیر، نحو وصرف، تجوید وقرأت، اذان، خطبہ اور عربی، اردو، انگلش تقاریر کے مسابقات کے ذریعہ طلبہ کا معیارِ تعلیم اونچا بنانے میں کافی کامیابی حاصل کی ہے جو محض خدا کا فضل ہے۔ یہ مسابقات اندورنِ مدارس، بیرون مدارس، صوبہ جاتی لیول پر اسی طرح کل ہند لیول پر ہوچکے ہیں، جن میں ایک سے دس نمبرات تک کامیابی پانے والوں کو گراں قدر انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ جامعہ اکل کوا نے طلبہ کے اندر تقریری وتحریری خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے، انجمن اصلاح الکلام، انجمن ثمرۃ التربیۃ، انجمنِ عظمتِ قرآن اردو اور **النادی للعربی** کو تشکیل دیا ہے، اسی طریقہ سے **لجنۃ القرآت والتجوید** کا نظام تصحیح قرآن اور طلبہ کے اندر جرأت پیدا کرنے میں خاصا معاون ہے۔

# رسالے (Magazines)

## ماہنامہ ''بیان مصطفیٰ'' (گجراتی):

جامعہ اکل کوا اپنے دینی ومذہبی اور سیاسی وسماجی مفید ترین مقاصد کو پوری دنیا کے افراد تک پہنچانے کے لیے، جہاں افرادسازی کی مہم مدارس، روانی کے ساتھ آگے بڑھاتا جارہا ہے، ٹھیک اسی طرح نقوش وتحریر کی شکل میں اپنا پیغام انمٹ بنانے اور لوگوں کو دنیا وآخرت میں مفید تر شخصیت میں اجاگر کرنے کے لیے کتابوں، رسالوں، میگزینوں اور مختلف النوع لٹریچر کی شکل میں اپنی مہم کو تیز تر کئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلے جامعہ نے

گجراتی زبان میں ایک ماہنامہ ''بیان مصطفیٰ'' کے نام سے نہایت محدود شکل میں نکالا تھا، جس کا دائرہ کار اور دائرہ اثر اب بڑھ کر اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ ہر ماہ بیان مصطفیٰ 12000 کی تعداد میں چھپ کر قوم وملت کے پیاسے افراد کی علمی وعملی تشنگی دور کر رہا ہے۔ اس رسالہ کی ابتدا ۱۹۹۳ء میں ۱۸۱ ممبر سے ہوئی اور آج اس کی تعداد بڑھ کر 12000 ہو چکی ہے۔

## سہ ماہی مجلّہ ''النور'' (عربی):

جامعہ اکل کوا نے قرآن کریم کی عربی زبان کی اہمیت وافادیت اور اشدیت وضرورت کے تئیں ۱۹۹۵ء میں سہ ماہی مجلّہ ''النور'' عربی کا آغاز کیا، جو تادم تحریر پوری رونق وجلوہ سامانی کے ساتھ اپنی کرنیں عجم وعرب تک بکھیر رہا ہے۔

## ماہانہ مجلّہ ''شاہراہِ علم'' (اردو):

جامعہ اکل کوا نے دینی ومذہبی اور سیاسی وسماجی مفید ترین مقاصد کو پوری دنیا کے افراد تک پہنچانے کے لیے ۱۴ رسال قبل ''شاہراہ علم'' کے نام سے سہ ماہی مجلّہ شروع کیا تھا اور بحمداللہ وہ گذشتہ پانچ سالوں سے ماہانہ ہو چکا ہے، اور عوام وعلما میں مقبولیت کے ہاتھوں لیا جا رہا ہے، جس کی موجودہ تعداد 6500 کا پی ہے۔

## سہ ماہی میگزین ''The Light'' (انگلش):

مختلف حالات وضروریات کے پیش نظر زندگی کے تقریباً تمام مراحل میں انگریزی زبان کی روز افزوں اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے جامعہ نے ۲۰۱۵ء سے انگریزی زبان میں سہ ماہی میگزین کی نشر واشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

## ماہنامہ ''التمرین'' (عربی):

طلبہ میں عربی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ''التمـــرین'' نامی عربی مجلّہ کا اجرا دسمبر ۲۰۱۵ء میں ہوا، اور آج تقریباً دو ہزار سے زائد افراد فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

## یوٹیوب چینل:

سوشل میڈیا وقت کی اہم ضرورت بن چکی ہے جس کے ذریعہ معاشرے میں برائیوں کو عام کیا جا رہا ہے۔

علما اور مفتیانِ کرام نے ضرورت کے پیش نظر اسلام کی صحیح تعلیمات کو فروغ دینے کے لیے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے؛ جس بنا پر جامعہ نے ''یوٹیوب'' پر ''الوستانوی'' چینل کا آغاز کیا ہے جس پر موقع بہ موقع امت کی رہنمائی کی جاتی ہے، اور جامعہ کے پروگراموں کو بھی اَپلوڈ کیا جاتا ہے، جس کا یوٹیوب میں پتہ یہ ہے: Alvastanvi، جسے آپ سرچ کر کے استفادہ کر سکتے ہیں۔

رئیس جامعہ کا پیغام

## مطبخ

جامعہ کے مطبخ میں 13238 طلبہ کو صبح کے وقت ناشتے میں چائے بسکٹ، دوپہر اور شام میں موسم کے لحاظ مختلف النوع کھانے کا انتظام رہتا ہے۔ جامعہ کے دینی وعصری دونوں طرح کے طلبہ اسی مطبخ سے مستفید ہوتے ہیں۔ ایک جگہ بیٹھ کر مختلف نشستوں میں کھانا کھلانے کا، جامعہ کا نظام قابل دید ہونے کے ساتھ ساتھ ضرب المثل بھی ہے۔

اس کے علاوہ جامعہ کی نگرانی میں جو تعلیمی مراکز تعلیم وتربیت میں مصروف عمل ہیں، جامعہ ان کے مطبخ میں بھی جزوی اور کہیں کلی تعاون پیش کرتا ہے جن میں تقریباً ۲۶/ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

جامعہ کے مطبخ میں فی الحال تقریباً 240/ خدام، مطبخ کی مختلف ضروریات کے فراہمی میں لگے رہتے ہیں۔

### مطبخ میں استعمال ہونے والی اشیا کی تفصیل حسب ذیل ہے

| شمار | اسمائے اشیا | یومیہ اشیا کی تعداد | قیمت فی کلو یومیہ (Rs) | کل قیمت یومیہ (Rs) |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | چاول | ۲۲/ کوئنٹل | 40 | 88000 |
| ۲ | گیہوں | ۲۰/ کوئنٹل | 25 | 50000 |
| ۳ | کھانے کا تیل | ۳۰/ ڈبّے | 1200 | 36000 |
| ۴ | شکر | ۲/ کوئنٹل ۵۰ کلو | 39 | 9750 |
| ۵ | دودھ | ۴۰۰/ لیٹر | 50 | 20000 |
| ۶ | چائے پتی | ۱۶/ کلو | 270 | 4320 |
| ۷ | بسکٹ | ۱۰۰۰/ پیکٹ | 12 | 12000 |
| ۸ | دھنیا | ۲۵/ کلو | 130 | 3250 |
| ۹ | مرچ پاؤڈر | ۲۵/ کلو | 130 | 3250 |
| ۱۰ | زیرہ | ۲۰/ کلو | 180 | 3600 |
| ۱۱ | ہلدی | ۲۰/ کلو | 130 | 2600 |
| ۱۲ | گرم مسالہ | ۸/ کلو | 5500 | 44000 |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۳ | آلو | ۲۳۰ر کلو | 15 | 3450 |
| ۱۴ | پیاز | ۲۳۰ر کلو | 15 | 3450 |
| ۱۵ | ہرا مسالہ | ۲۵ر کلو | 150 | 3750 |
| ۱۶ | لکڑی | ۱۰۰۰ر کلو | 2.50 | 2500 |
| ۱۷ | گوشت | ۱۰ر کوئنٹل | 90 | 90000 |
| ۱۸ | سبزی | ۱۰ر کوئنٹل | 30 | 30000 |
| ۱۹ | گیس (کمرشیل) | ۳۰ر بوٹل | 1000 | 30000 |
| ۲۰ | توردال | ۵ر کوئنٹل | 115 | 57500 |
| ۲۱ | مکس دال | ۳۰۰۰ر کلو (مہینہ میں) | 350 | 42000 |
| ۲۲ | نمک | ۱۱۰ر کلو | 18 | 1980 |
| ۲۳ | ٹماٹر | ۲۰۰ر کلو | 15 | 3000 |
| ۲۴ | ڈیزل | ۳۵۰ر لیٹر | 62 | 21700 |
| ۲۵ | مزدور | ۹۰ر افراد | ہفتہ وار | 13500 |
| ۲۶ | تنخواہ دار خدام | ۱۵۰ر افراد | تنخواہ رجسٹر کے مطابق | 28500 |
| ☆ | ☆☆☆ | ☆☆☆ | کل رقم روپئے میں | 608100 |

یومیہ مطبخ کے خرچ کی رقم 608,100 روپئے بنتی ہے۔ ماہانہ رقم ہندوستانی کرنسی میں 18,243,000 روپئے ہوتی ہے۔ سالانہ خرچ ہندوستانی کرنسی میں 218,916,000 ہے۔

## تسہیل کفالت منصوبہ بندی

حسبِ ذیل سطروں میں اس بات کی تفصیل دی جارہی ہے کہ ایک طالب علم کو اپنا منتخب کورس مکمل کرنے میں سالانہ خرچ کتنا آتا ہے اور کورس کی تکمیل پر کتنا خرچ آتا ہے، جس کی ہندوستانی کرنسی کے ساتھ GBP اور US$ کتنی بنے گی۔ اس تفصیل کی معلومات سے ایک طالب علم کی سالانہ یا مکمل کفالت آسان ہوجائے گی۔

| نمبر شمار | کورس | مدت | سالانہ INR | پورا کورس |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | **دینیات** | ۳ر سال | 10,200 | 30,600 |
| ۲ | **حفظ** | ۳ر سال | 10,200 | 30,600 |
| ۳ | **عالمیت** | ۸ر سال | 15,000 | 120,000 |

## آئندہ سال کا متوقع مالی بجٹ

| | | |
|---|---|---|
| 1 | جامعہ کے مطبخ، مشاہرے، برقیات، میڈیکل وصحت سے متعلق، اسکالرشپ اور فرنیچر وغیرہ کا مجموعی خرچ یومیہ۔ | 0 |
| 2 | تعمیرات کا خرچ، اس میں ہاسپٹل، اسکول بلڈنگ، آئی ٹی آئی بلڈنگ اور ہاسٹل بلڈنگ کا خرچ شامل ہے۔ | 0 |
| 3 | ۹۲ر اقامتی شاخوں کا خرچ ۲۶۴۹۶ر طلبہ کے قیام وطعام اور دیگر ضروریات کا خرچ شامل ہے۔ | 5 |
| 4 | ۲۵۹۶ر مکاتب | 5 |

# جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا، ایک نظر میں

نام و پتہ : جامعہ اسلامیہ اشاعت العلوم، اکل کوا، ضلع نندوربار، 425415-مہاراشٹر

سنِ تاسیس : 1400ھ - 1980ء

سرپرست : حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم

بانی : حضرت مولانا غلام محمد صاحب وستانوی دامت برکاتہم

رئیس جامعہ کا پیغام

| | |
|---|---|
| تعداد ڈرسٹیاں | 005 |
| ابتداء ۶/طالب علم سے فی الحال طلبا کی تعداد | 13238 |
| ابتداء ایک استاذ سے فی الحال اساتذہ کی تعداد | 575 |
| ابتداء ۳/خادم سے فی الحال خدام کی تعداد | 436 |
| اب تک جامعہ سے حفظ مکمل کرنے والے طلبا | 7974 |
| اب تک جامعہ سے سند فضیلت حاصل کرنے والے طلبا | 4002 |
| اب تک جامعہ سے سند افتا حاصل کرنے والے طلبا | 103 |
| اب تک جامعہ سے قرأت سبعہ عشرہ کی تکمیل کرنے والے طلبا | 2597 |
| اب تک جامعہ سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں پرائیویٹ کمپیوٹر کورس کرنے والے طلبا | 1474 |
| اب تک جامعہ سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں گورنمنٹ ٹیلرنگ کورس کرنے والے طلبا | 481 |
| اب تک جامعہ سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا میں پرائیویٹ ٹیلرنگ کورس کرنے والے طلبا | 1098 |
| اب تک شعبۂ انگریزی (DELL) سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 40 |
| اب شعبۂ عربی ادب سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 32 |
| ایم بی بی ایس (چوتھا سال) | 399 |
| اب تک جامعہ اور جامعہ کی شاخوں سے آئی ٹی آئی سے سند حاصل کرنے والے طلبا (2699+1575) | 4274 |
| اب تک جامعہ سے ڈپلوما پالی ٹیکنک سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 2028 |

رئیس جامعہ کا پیغام

| | |
|---|---|
| اب تک ڈپلوما فارمیسی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 665 |
| اب تک ڈگری فارمیسی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 269 |
| اب تک ڈی ایڈ اُردو سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 570 |
| اب تک ڈی ایڈ مراٹھی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 808 |
| اب تک بی ایڈ مراٹھی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 1052 |
| اب تک بی یو ایم ایس ڈگری حاصل کرنے طلبا کی تعداد | 584 |
| اب تک جامعہ کی شاخوں سے حفظ کی سند حاصل کرنے والے طلبا | 10676 |
| اب تک جامعہ اور جامعہ کی شاخوں سے ناظرہ مکمل کرنے والے طلبا (49140+14002) | 49140 |
| اب تک جامعہ کے مکاتب سے ناظرہ مکمل کرنے والے طلبا | 184739 |
| اب تک لڑکیوں کے اداروں سے مومنہ کورس مکمل کرنے والی طالبات | 11442 |
| اب تک جامعہ سے مختلف ڈگریاں حاصل کرنے طلبا | 284105 |
| ۲۵ رسالوں سے ماہنامہ ''بیانِ مصطفیٰ'' (گجراتی زبان) میں جاری رسالہ کی تعداد | 12000 |
| ۲۸ رسالوں سے سہ ماہی ''النور'' (عربی زبان) میں جاری رسالہ کی تعداد | 1200 |
| ۱۴ رسال سے جاری ماہنامہ ''شاہراہِ علم'' (اُردو زبان) میں جاری رسالہ کی تعداد | 6500 |
| ۳ رسال سے جاری سہ ماہی ''ڈی لائٹ'' (انگریزی زبان) میں جاری رسالہ کی تعداد | 1100 |
| ۲ رسال سے ماہانہ ''التمرین'' (عربی زبان) میں جاری رسالہ کی تعداد | 1000 |
| بی اِی انجینئرنگ کالج کے فارغین | 201 |
| پرائمری اسکول (اردو میڈیم) سے فارغ ہونے والے طلبا | 730 |
| ہائی اسکول اور جونیر کالج سے فارغ ہونے والے طلبا (۱۵۵۶+۷۰۱) | 2257 |
| پرائمری اسکول (انگلش میڈیم) سے فارغ ہونے والے طلبا | 96 |
| پی، ایچ ڈی فارمیسی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 01 |

رئیس جامعہ کا پیغام

| | |
|---|---|
| ایم فارمیسی سے سند حاصل کرنے والے طلبا | 40 |
| دیہاتوں میں طبی خدمات | 50 |
| طبی خدمات روزانہ (النور اسپتال بدنا پور) | 1150 |
| روزہ افطار سالانہ | 30000 |
| رمضانیہ کڈس ہر سال | 10500 |
| کتابوں کی نشر و اشاعت | 100,000 |
| علما اور داعیین کے لیے گھروں کی تعمیرات | 77 |
| شادی بیاہ (من جانب جامعہ) | 15000 |
| حج (من جانب جامعہ) | 157 |
| عمرہ (من جانب جامعہ) | 97 |
| قرآن مجید کی چھپائی | 145000 |
| کل ہند مسابقات | 08 |
| مکاتب | 2596 |
| مراکز | 96 |
| کالجز | 31 |
| آئی ٹی آئی ٹریڈس | 34 |
| پالی ٹیکنک ٹریڈس | 15 |
| پرائمری اور ہائی اسکول | 50 |
| مساجد | 6068 |
| یتیموں کی کفالت (ہر سال) | 3000 |
| اضاحی (ہر سال) | 4000 |

| | |
|---|---|
| بورویل | 5711 |
| وظیفہ (ہفتہ واری) عمراور درجہ کے اعتبار سے | 140000 |
| اسپتال | 27 |

رپورٹ جامعہ کا پیغام

## مستقبل کے عزائم اور منصوبے

جامعہ کی تمام تعلیمی وتربیتی سرگرمیوں کی ترقی اور مسلسل کامیابی کا مدار، ان خیر خواہانِ قوم وملت کی عملی مخلصانہ جانفشانی پر ہے، جو اپنی کسبِ حلال کا ایک وافر حصہ اپنی آخرت سازی کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں، اس لیے ہم اللہ پر توکل کرتے ہوئے اور ان بندگان خدا کے لیے دعائیں کرتے ہوئے، آئندہ کے لیے جو عزائم ومنصوبے تشکیل دیے ہیں، ان کی قدرے تفصیل کچھ یوں ہے:

☆مختلف النوع وسائل وسہولیات کا حامل ہاسٹل اور L.L.B.، B.H.M.S اور Nursing کالجز۔

☆جامعہ کی مختلف فروعات میں پرائمری اسکول، فارمیسی کالج اور آئی-ٹی- آئی کا قیام، جس میں ہاسٹل کی سہولیات بھی ہوں۔

☆مزید ۲۰۰/مکاتبِ اسلامیہ کا قیام۔

☆جامعہ اکل کوا کے احاطے کی مزید توسیع، جس میں 16000/طالبانِ علوم نبوت تمام سہولیات کے ساتھ اپنی تعلیمی ودینی سرگرمیوں کو روبہ عمل لاسکیں۔

☆مزید ۲۰۰/طلبہ کو پیشہ ورانہ کورسیز کی تکمیل کے لیے اسکالرشپ مہیا کرنا۔

☆مطبخ کی عمارت کی تعمیر نو کا منصوبہ جو بہت بڑا اور ایک اہم پروجیکٹ ہے۔

☆آئی ٹی آئی اسکول اور دیگر تعلیمی شعبوں کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی تعمیر کا پلان۔

☆مزید ۸۰۰/بورویل کا ضرورت مند مقامات پر انتظام۔

☆۴۰۰/رہائشی عبادت خانوں کی تعمیر۔

☆ایک وسیع وعریض کتب خانہ (لائبریری) کی تعمیر۔

☆......☆......☆

## مسابقہ حفظ حدیث

حفظ حدیث کے مسابقہ میں درجات چہارم، پنجم، مشکوٰۃ اور دورہ حدیث کے طلبہ شریک رہے۔

| درجہ | منتخب | فائزین |
|---|---|---|
| دورہ حدیث | 24 | 23 |
| مشکوٰۃ | 12 | 33 |
| پنجم | 52 | 12 |
| چہارم | 68 | 57 |
| کل تعداد | 156 | 125 |

## مذکرہ نحویہ

اس مسابقہ میں درجات اول تا چہارم کے طلبہ شریک رہے

| درجہ | منتخب | فائزین |
|---|---|---|
| سوم | 33 | 24 |
| دوم | 34 | 17 |
| اول | 59 | 8 |
| کل تعداد | | |

## مذکرہ صرفیہ

اس مسابقہ میں درجات فارسی تا دوم کے طلبہ شریک رہے۔

| درجہ | درخواست دہندگان | فائزین |
|---|---|---|
| فارسی | 68 | 61 |
| کل تعداد | 68 | 61 |

## انجمن اصلاح الکلام

اس مسابقہ میں درجات ہفتم تا فارسی کے طلبہ شریک رہے

| درجہ | درخواست دہندگان | |
|---|---|---|
| ہفتم | 304 | 44 |
| ششم | 263 | 44 |
| پنجم | 194 | 49 |
| چہارم | 185 | 140 |
| سوم | 215 | 31 |
| دوم | 244 | 32 |
| اول | 286 | 63 |
| فارسی | 180 | 83 |
| کل تعداد | 1868 | 486 |

## النادی العربی

اس مسابقہ میں درجات پنجم تا اول کے طلبہ شریک رہے

| درجہ | درخواست دہندگان | فائزین |
|---|---|---|
| پنجم | 51 | 17 |
| چہارم | 54 | 18 |
| سوم | 48 | 16 |
| دوم | 48 | 16 |
| اول | 78 | 28 |
| کل تعداد | 279 | 95 |

رئیس جامعہ کا پیغام

## داخلی مسابقة القرآن الكريم فی الحفظ والتجويد
## وفی حفظ خطبات الجمعات واشعار المقدمة الجزرية
## بیک نظر

**الحمدلله !** جامعہ کی روایات کے مطابق ایک ماہ قبل شرکتِ مسابقہ کا طلبائے عزیز کے درمیان اعلان کیا گیا۔ ماشاءاللہ طلبا نے کثیر تعداد میں درخواستیں جمع کیں، پھر ان کے درمیان انتخاب کر کے منتخب طلبا پر مزید محنت کی گئی اور طلبا نے الحمدللہ! بہت ہی دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کی مساعیٔ جمیلہ کو قبولیت سے سرفراز فرما کر ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

### تفصیل طلبائے شعبۂ عالمیت

| فروعات | مقدار مسابقہ | درجات | درخواست دہندگان | منتخب | ممتاز |
|---|---|---|---|---|---|
| اول | مکمل قرآن | جمیع طلباء | 174 | 101 | 11 |
| ثانی | پارہ ۱/......تا......۱۰/ | فارسی..تا..چہارم | 200 | 74 | 11 |
| ثالث (الف) | ترتیل ۳/رکوعات | منتخب طلباء عربی دوم/سوم | 37 | 24 | 7 |
| ثالث (ب) | ترتیل ۲/رکوعات | فارسی......تا......ہفتم | 43 | 32 | 4 |
| رابع (الف) | ۳/خطبات مع ثانیہ | فارسی......تا......عربی سوم | 123 | 80 | 4 |
| رابع (ب) | ۳/خطبات مع ثانیہ | عربی چہارم..تا..عربی ہفتم | 44 | 30 | 4 |
| خامس | سورۂ یاسین | عربی چہارم (غیر حفاظ) | 70 | 50 | 3 |
| سادس | سورۂ صف/جمعہ | عربی سوم (غیر حفاظ) | 76 | 59 | 4 |
| سابع | سورۂ مزمل/مدثر | عربی دوم (غیر حفاظ) | 50 | 36 | 6 |
| ثامن | سورۂ ملک/حاقہ | عربی اول (غیر حفاظ) | 64 | 47 | 5 |
| تاسع | سورۂ نباء/نازعات | فارسی | 97 | 76 | 5 |
| عاشر | پارۂ عم نصف اول | پنجم...تا...ہفتم (غیر حفاظ) | 32 | 17 | 3 |
| حادی عشر | المقدمة الجزرية | جمیع عربی چہارم | 84 | 52 | 23 |
| کل تعداد | ☆☆☆☆☆ | ☆☆☆☆☆☆ | 1094 | 678 | 90 |

رئیس جامعہ کا پیغام

مسابقۃ القرآن الکریم بین الحفاظ الکرام الجامعۃ الاسلامیہ اشاعت العلوم اکل کوا-۲۰۱۶ ایک نظر میں

| | |
|---|---|
| کل حفاظ طلبہ | 447 |
| کل حاضر طلبہ | 437 |
| غیر حاضر طلبہ | 10 |
| ممتاز | 213 |
| اعلیٰ | 142 |
| اوسط | 54 |
| ناکام | 28 |
| طلبہ از دینیات | 189 |
| طلبۂ جدید | 200 |
| طلبۂ دور | 58 |
| کل چھ مسابقہ کا مجموعی فیصد | 83.21 |
| جید جدا کا مجموعی فیصد | 82.46 |

## جامعہ ابوبکر صدیق عنبڑ میں فروعات جامعہ اکل کوا کے مابین قرآنی مسابقہ:

جامعہ اکل کوا فروعات جامعہ کی نظامِ تعلیم کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے ہر مفید قدم اٹھاتا ہے۔ چوں کہ یہ دور کمپیٹیشن اور مسابقات کا ہے، اس لیے جامعہ کمپیٹیشن اور مسابقات کے ذریعہ طلبہ کی تعلیمی پختگی کی طرف پیش رفت کر رہا ہے، طلبہ میں انعامات کے ذریعے تعلیمی لیاقت میں عمدگی اور پختگی پیدا کی جاسکتی ہے، اس غرض سے جامعہ ہر سال اپنے ماتحت چلنے والے اداروں میں حفاظ طلبہ کے حفظ میں پختگی، عمدہ انداز اور صحت ادائیگی میں مہارت کے لیے مسابقہ رکھتا ہے۔

امسال الحمدللہ! اللہ کے کرم سے جامعہ کے ماتحت چلنے والے اداروں میں 656 طلبہ حافظ ہوئے۔ پھر اطراف کے اداروں میں مرکز بنا کر مسابقہ رکھا گیا اور اس مسابقہ میں جن طلبہ نے 90 فیصد نمبر حاصل کئے، ایسے

179 طلبہ 24 اداروں سے جامعہ کی عظیم الشان شاخ جامعہ ابوبکر صدیق عنبڑ میں 13 اپریل کو جمع ہوئے اور جامعہ کے 40 ماہر اساتذہ وقرائے کرام کی موجودگی میں 15 فروعات میں ان طلبہ کو تقسیم کر کے جیدجدًا کا مسابقہ یعنی Top کرنے والے طلبہ میں TOPPER کا مسابقہ منعقد کیا گیا۔ جوالحمدللہ! بہ حسن وخوبی پائے تکمیل کو پہنچا۔ اور حفظ قرآن میں پختگی کے ساتھ ساتھ فہم قرآن کے لیے نحو، صرف اور حفظ حدیث کا بھی مسابقہ رکھا گیا، جس میں تقریبا 154 طلبا نے شرکت کی اور اس کی انعامی مجلس 13 اپریل بعد نماز مغرب جامعہ اکل کوا کے ناظم تعلیمات مولانا حذیفہ صاحب وستانوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جس میں فروعات جامعہ کے نظما، اساتذہ اور علاقہ کے احباب کثیر تعداد میں شریک رہے۔ اس مسابقے میں خصوصاً قاری محمد علی صاحب ناظم جامعہ ابوہریرہ بدناپور، قاری محمد اقبال صاحب ناظم جامعہ ابوبکر صدیق عنبڑ اور ناظم مکاتب جامعہ اکل کوا مولانا جاوید صاحب اول تا آخر شریک رہے اور کامیاب طلبہ کو گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔

## انتقال پرملال:

نہایت ہی غم اور افسوس کے ساتھ قارئین شاہراہ کو یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ "منیجر شاہراہ علم" مفتی ہلال الدین صاحب کے والد محترم جناب علیم الدین صاحب ۲۵/اپریل ۲۰۱۷ء بروز منگل بعد نماز فجر اس دارفانی سے ہمیشہ کے لیے اللہ کی رحمت میں چلے گئے، جس سے جامعہ برادری اشک بار وسوگ وار ہوگئی۔

مرحوم بڑے متبع شریعت، نیک سیرت، خوش اخلاق وخوش اطوار، خوش مزاج وملنسار، دل نواز اور مہمان نواز آدمی تھے، علمائے کرام سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرماتے ہوئے کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

قارئین شاہراہ سے ایصال ثواب، دعائے مغفرت اور اعلیٰ درجات کے لیے دعا کی خصوصی درخواست ہے۔

**اللّٰھم اغفرہ، و ارحمہ، وسکنہ فی الجنة، و أکرم نزلہ، واغسلہ بماء الثلج والبرد، ونقہ من الخطایا کما نقیت الثوب الأبیض من الدنس، اللّٰھم باعد بینہ و بین خطایاہ کما باعدت بین المشرق والمغرب. آمین!**

☆.....☆.....☆